مخزن

لندن

ہندوستان سے انگلستان جانیوالوں کی تعداد روز افزوں ہے اور بہت سے صحاب کے لئے اب وہاں کے حالات ذاتی مشاہدات و تجربات میں داخل ہیں۔ تاہم ہر سیاح کے مشاہدات اپنے ملک کی نسبت جو اس وقت رونق اور ترقی کا مرکز ہو اپنا خاص لطف رکھتے ہیں۔ ذیل میں ایک مضمون درج کیا جاتا ہے جو مولوی عبدالرحمن صاحب سیوہاروی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ) نے لندن کے متعلق لکھا ہے۔ مولوی صاحب جو خطوط پہلے سفر کے متعلق اپنے والد صاحب کو لکھ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ عام طور پر دلچسپی سے پڑھے جائینگے۔ اگر ممکن ہوا تو ہم وقتاً فوقتاً ان کے بعض خطوط شائع کرینگے ٭ ٭

حدودِ اربعہ اور آب و ہوا

لندن ایک از حد وسیع اور غدار شہر ہے۔ اس کی اصلی وسعت کا اندازہ ہندوستان کے کسی شہر سے نہیں کیا جا سکتا۔ دلی اور علی گڈھ لندن کے چند گلی کوچے ہیں۔

شہر مختلف اضلاع میں منقسم ہے اور ہر ضلع گویا ایک علاحدہ شہر ہے۔ پس لندن کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ تک پہنچنے کے لئے وہی وسائل ضروری ہیں جو ہندوستان میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں جانے کے لئے لازمی ہیں۔

میری تعلیم گاہ اور فرودگاہ میں باوجود زیادہ بُعد نہ ہونے کے ۱۲ میل کا

فصل ہے۔

پس ظاہر ہے کہ جب تک زمین کی طنابیں ہی نہ کھینچ جائیں۔ ایک مقام سے کسی دوسرے مقام تک جانے کے لئے کتنا وقت چاہیے۔ اس مشکل کو زمین دوز ریلوں نے حل کر دیا ہے۔

تمام لندن کی سرزمین کے نیچے زمین دوز راستے ہیں جن پر تھوڑے تھوڑے کے فاصلے سے ایک اسٹیشن بنا ہے۔ ان زیر زمین اسٹیشنوں میں مسافر لفٹ کے ذریعہ نیچے آتے ہیں اور ریل پر سوار ہو کر جہاں ضرورت ہو جا سکتے ہیں۔ زمین دوز شہر کے ہر ایک حصہ میں یہ بمنزلہ جسم میں شرائین کی مثال شب و روز رواں ہیں۔

سطح زمین پر ٹرام برقی ہر مقام سے ہر مقام کو جاتی ہے۔ اس کی وضع بالکل بمبئی کی ٹرام سے مشابہ ہے۔ لاتعداد ہر وقت ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھاگتی رہتی ہیں۔

ایک قسم کی بس موٹر گاڑیاں بھی ہیں یہ بھاپ سے چلتی ہیں۔ انکی تعداد بھی کثیر ہے۔

علاوہ بریں ٹیکسی موٹر کاریں۔ جہاں دیکھئے قطاروں کی قطاریں سڑک کے وسط میں ایستادہ ہیں۔ ان میں یہ انتظام ہے کہ میٹر کے ذریعہ کرایہ خود بخود تحریر ہوتا رہتا ہے اور اسی حساب سے دینا پڑتا ہے۔

گھوڑا گاڑیاں جس طرح ہندوستان میں اکے کی مثال معدوم ہو رہی ہیں۔ یہاں بھی کم ہیں مگر ہنوز بکثرت موجود ہیں۔

باوجود اس کے یہ ذرائع ضروریات کے لحاظ سے محض ناکافی ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آمد و رفت کے مسئلہ کو کس طور حل کیا جائے۔

آب و ہوا میں یہ شہر کوئٹہ سے مشابہ ہے گو برفباری کے زمانہ میں سردی زیادہ ہوتی ہے۔ بالعموم ترشح ہونے کے باعث ابر ہمیشہ محیط آسمان رہتا ہے اور آفتاب کی صورت ہفتوں نظر نہیں آتی۔ بار ہا صبح سے شام تک چراغ اور فانوس روشن رہتے ہیں۔ یہاں کی کہر ایک بلائے عظیم ہے جسکا اندازہ مشکل ہو۔ جب کہر چھا جاتی ہے تو پھر ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔ شعلہ پردۂ فانوس سے باہر نہیں آ سکتا۔ تمام آمد و رفت بند ہو جاتی ہے اور لوگ قریب ترین مامن میں پناہ لیتے ہیں مگر ایسی کہر ایک شاذ چیز ہے اور صرف ایک بار میرے تجربہ میں آئی ہے۔

یہ لندن کا مختصر جغرافیہ ہے

آزادی اور حکومت

عظمت برطانیہ حقیقت میں یہاں آکر معلوم ہوتی ہے۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ نظم حکومت کے قواعد اس قدر تبدیل ہو گئے ہیں کہ ہندوستان یا ایشیا کے رہنے والوں کو ان کا ذہن نشین کرنا از حد مشکل ہے۔

اگر کوئی یہ دریافت کرے کہ اس تہذیب اور تمدن کا سب سے شیریں ثمر کیا ہے تو میں یہ کہوں گا۔ آزادی۔

اور اگر مجھ سے یہ دریافت کیا جائے کہ آزاد ملک کی کیا تعریف ہے تو میں یہ جواب دونگا ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد کسے را با کسے کارے نہ باشد

ارسطو کا قول ہو کہ عدم مساوات سے زیادہ کوئی شئے قوموں کو پژمردہ اور مغلوب نہیں کرتی اور چونکہ ایشیا صدیوں تک مطلق العنان حکومتوں کی خلافت گاہ ہی ہے۔ اہل ایشیا لفظ آزادی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں

ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

آزادی کے معنے یہاں وہی ہیں جو خلفائے راشدین کی حکومت جلیلہ میں تھے۔ جب کہ ایک ادنیٰ شخص خلیفۂ وقت کو غلطی سے روک سکتا تھا اور ایک ذمی یہودی امیر المومنین کے خلاف انصاف کا طالب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں ہر امیر اور فقیر مفلس اور تونگر شہری ہونے کی حیثیت سے ہم پایہ ہیں۔ ہر شخص اپنا فرض ادا کرنے اور منصب بجا لانے تک پابند ہے اس سے زیادہ اس پر کوئی قید نہیں ملازم کو آقا کا خائف ہونے کی اور ماتحت کو افسر کی سفارش کی کوئی حاجت نہیں۔ کوئی حاکم بالادست اپنے محکوم سے بیجا باز پرس نہیں کر سکتا اور کوئی آقا ملازم پر دستِ تعدی دراز نہیں کر سکتا۔ قانون نے میزانِ عدل میں تول کر حقوق تفویض کر دیئے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کی حالت میں عدالت چارہ دہ ہے اور کسی کو ایسی جسارت نہیں ہوتی کہ انصاف کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔

جب سربراہ پولیس کا سپاہی اپنی ایک انگلی سے منع کر دیتا ہے تو عوام کیا خاص خواہ سربرِ ریاست ہی کیوں نہ آئے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اور وہ ادنیٰ ملازمِ حکومت خود اس قدر پابندِ قانون اور آگاہِ فرائض ہے کہ ضعیف عورتوں۔ اپاہج اور معذور لوگوں اور معصوم بچوں کو خود ایک جانب سے سڑک کی دوسری جانب تک بحفاظت پہنچا دیتا ہے اور رستہ بھولے ہوئے کو خضرِ راہ بن کر منزل کا پتہ اور نشان دیتا ہے اور ہر وقت ہر معاملہ میں مدد کو تیار ہے۔

ہر شخص کی حکومت اس کے دفتر تک محدود ہے اس کے بعد کوئی کسی کا حاکم نہیں۔

مگر خلفائے راشدین کی حکومت اور اس میں یہ تمیز ہے کہ اس کی رحمت عام تھی اور اس کی برکت انگلستان کے اندر محدود ہے۔

تمدن

جہاں یہ لوگ قانوناً اس قدر آزاد ہیں وہیں تمدن کی زنجیروں سے اس قدر بستہ ہیں کہ تعجب معلوم ہوتا ہے۔ بارِ حکومت جہاں اس قدر کم ہے وہیں بارِ علائق اس قدر زیادہ ہے کہ شاید اس سے زیادہ سرگردان قوم اور نہ ہو۔ ان قواعد و آداب اور رسومات کی پابندی کی بنیاد یہ ہے کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے زندگی میں ایک قرینہ پیدا ہوتا ہے اور اس تعدیل سے ایک قومی حُسن نکلتا ہے جو اس تہذیب کا معیار یا منتہا ہے۔ حسن پرستی اور حسن آرائی میں اہلِ یورپ فی زمانہ قدیم یونانیوں کے جانشین ہیں۔

کوئی شخص رختِ خواب میں کمرے سے باہر نہیں آسکتا کوئی شخص جب تک از سر تا پا پورا لباس نہ پہنے ہو۔ اپنے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔

لباس کا فیشن سے مطابق ہونا ضروری ہے۔

اُمراء کی زندگی کا منتہا اور مدعا فیشن کا مطالعہ ہے۔

ہر تماشا گاہ، ہر قہوہ خانہ میں شریف لوگوں کے کمرے میں بیٹھنے کے لئے شب کے وقت لباسِ طعام ضروری ہے۔

قانون کے خلاف جرم کرنا سوسائٹی کی نگاہ میں ایسا معیوب نہیں جتنا آدابِ محفل کے خلاف ذراسی غلطی کا ارتکاب ہے۔

اخلاق

اخلاق میں یہ لوگ نمونہ ہیں۔ ملازموں کی مستعدی اور فرمانبرداری بیان سے باہر ہے۔ اپنا فرض منصبی بجالانے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ دوکانوں

اور قہوہ خانوں کے ملازمین مرد اور عورتیں اس خوبی اور خوش کلامی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سلیقہ شعاری اور مستعدی کو تجارت کے فروغ میں بڑا دخل ہے۔

اجس شخص سے راستہ دریافت کیجئے بچہ اور بڑ اپنا کام حرج کرنے اور ہمراہ جانے کے لئے تیار ہے۔ اگر کوئی شے گرجائے تو ہر شخص کوشش سے تلاش کے بعد آپ کو پہنچا دے گا۔

اعتبار

قومی اعتبار اس درجہ ہے کہ بہت سی چیزوں پر نہ رقعہ ہے نہ رسید مگر کسی قسم کے دھوکے کا احتمال نہیں۔ تمام شہر کیا مکانات دریا دوکانیں ایک شیشہ خانہ ہے۔ دوکانیں تمام کھلی ہوئی ہیں۔ صرف شیشے جڑے ہیں مکان سامنے سے صرف شیشے کی کھڑکیوں سے بند ہیں جن کے سامنے کوئی لوہے کی سلاخیں یا محافظت نہیں۔ اتوار کے روز کوئی اپنے گھر سے دوکان نہیں جاتا۔ تمام کاروبار بند رہتا ہے۔ مگر کیا مجال کہ کوئی شخص جرأت کرکے ان کمزور شیشوں کے پیچھے سے ایک پائی کی چیز اٹھائے جوہری بازار میں ایک شیشے کے پیچھے بعض وقت اتنا مال ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کی کسی ریاست کی فروخت سے روپیہ جمع کیا جائے تو اس کا نصف نہ ہو۔

عیش

مگر تعیش کلنگ غالب ہے۔ شراب خانے شب و روز معمور ہیں۔ تماشہ گاہوں میں چھ چھ ماہ آئندہ تک کے ٹکٹ فروخت ہو چکے ہیں۔ کشتی۔ دنگل سرکس وغیرہ کو کم پوچھا جاتا ہے۔ ناٹک کی قدر زیادہ ہے اور ان سے بھی زیادہ

رقص خانے آباد ہیں۔

مذہب

اس کی سب سے اہم وجہ لا مذہبی ہے یعنی لوگوں کے دلوں سے معصیت کا خیال محو ہوتا جاتا ہے۔ ہر شخص کا یہ خیال ہے کہ اس زندگی کے بعد کچھ نہیں۔ نہ کوئی جوابدہی ہے نہ عدالت۔ جو کچھ عیش و عشرت ہو سکے یہیں کیجئے۔

سیاسی اعتبار سے مذہب ابھی زندہ ہے اور کلیسیا ہماری مساجد سے بہ ظاہر زیادہ آباد ہیں۔

اجتماع سعدین

یہاں کے لوگوں میں علم اور دولت دونوں مجتمع ہیں۔ دولت یہاں کی بے اندازہ ہے۔ اس کا خیال بھی ہمارے حیز امکان سے باہر ہے۔ یہاں ایک گذارہ کرنے والے آدمی کا صرف ذاتی خرچ بہ کفایت دس پونڈ ہے اور جس خاندان میں چار آدمی مع بچوں کے ہوں اور تیس پونڈ آمدنی ہو وہ خاندان غریب ہے۔ یہاں کے غربا ہمارے سفید پوش شرفا سے بہتر حالت میں ہیں۔ عظیم الشان عمارات کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور ایک ہوٹل کی عمارت کی قیمت ہماری ایک بستی سے زائد ہے۔ ہر قہوہ خانہ ایک بہارستان ہے۔

سڑکیں از حد وسیع اور کشادہ ہیں اور دونوں جانب پیادہ چلنے کے راستے ہیں۔

اس لاتعداد دولت کے اجتماع کا باعث تجارت ہے۔ یہاں تاجر سے بڑھ کر کوئی شخص صاحب جاہ نہیں۔ ہر سال تاجروں میں سے ایک شخص شہر

مدت کا میٹر یعنے السراٹی مقرر کیا جاتا ہے۔ دوکانوں کا طول وعرض
بیان سے باہر ہے۔ بڑی دوکانوں کی محض سیر کرنے کے لئے ایک ہفتہ
درکار ہے۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو یہاں مہیا نہ ہو ع
جو مانگئے زمانہ بے حاضر ہے ہنستے

غرض لندن ایک عجیب غریب مقام ہے۔ جہاں بے انتہا دولت جمع
ہے۔ جو جملہ فنون کا مخزن ہے۔ جو سب سے بڑی سلطنت کا پایہ تخت
ہے۔ جہاں ان عجائبات دنیا کا دیکھنا تعجب اور رشک کا باعث ہے
وہیں انسان سوسائٹی کی اندرونی حالت کو دیکھکر تاسف کرتا ہے۔
نوجوان کے لئے مقام امتحان و آزمائش ہے۔ جب تک کہ اپنے
وطن اور اپنی تہذیب کو یاد رکھے محفوظ ہے۔

اس ترقی سے اگر اپنے تنزل کا مقابلہ کیا جائے تو مولانا حالی ظلہ
کا وہ قول یاد آتا ہے۔ جہاں ایک پیر دانا کے یہ کہنے پر کہ جس قوم
میں عقل۔ علم یا دولت میں سے کوئی شئے نہ ہو اس پر بجلی کا گرنا بہتر ہے
آپ نے فرمایا ہے ؎

مجھے ڈر ہے اے میرے ہمقوم یارو
مبادا کہ وہ ننگ عالم تمہیں ہو

عبدالرحمن سیوہاروی

ہماری ضروریات کی لاگت*

بلا ضرورت مالیت نہیں ہو سکتی

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ لاگت کسے کہتے ہیں اور اس کا ہماری احتیاج اور ضرورت سے کیا تعلق ہے۔ اصل یہ ہے لاگت کی بنیاد ہماری احتیاج ہی ہے۔ کیونکہ نہ ہمیں کسی شے کی حاجت ہوتی اور نہ ہمیں اس پر خرچ اٹھانے اور لاگت لگانے کی ضرورت پڑتی۔ یہ پہلے ہی بیان ہو چکا ہے کہ مالیت کسی چیز کی ایک مقدار کا نام ہے جو کسی دوسری چیز کی ایک خاص مقدار کے تبادلہ یا معاوضہ میں حاصل ہو سکے۔ اب یہ امر بھی ذہن نشین کر لینا لازم ہے کہ ہم کسی شے کو تبادلہ سے اس وقت تک حاصل نہیں کرتے جب تک ہمیں اس کی احتیاج نہ ہو۔ پس مالیت کی اصلیت ضرورت قرار پائی۔ لہٰذا بشرطیکہ ایک چیز کی مقدار متعین غیر متغیر ہو۔ اس کی جس قدر ضرورت یا احتیاج ہمیں لاحق ہوگی۔ اسی قدر وہ ہمارے لئے قابل قدر ہوگی اور جوں جوں ضرورت بڑھتی جائیگی اس کی مالیت بھی ترقی کرتی جائیگی۔ فرض کرو ایک قصاب گوشت کا ٹکڑا ایک برہمنوں کے گاؤں میں فروخت کرنے جاتا ہے وہاں چونکہ کوئی گوشت کھانے والا نہیں یعنی انکو گوشت کی احتیاج نہیں اس لئے گوشت انکے لئے ناقابل قدر ہے۔ لہٰذا اس گاؤں میں اس مال کی کوئی مالیت نہیں ہے۔ اب یہی شخص مسلمانوں کے قصبہ میں چلا جاتا ہے وہاں بہت سے خریدار نکل آئینگے یعنی انکو گوشت کی ضرورت یا احتیاج ہوگی۔ پس اس مال کی

* گذشتہ جلد میں ہمارے مکرم منشی صادق علی خان صاحب نے پولیٹکل اکانمی کے متعلق عام فہم مضامین کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ اسی سلسلہ کا تیسرا مضمون ہے۔

مالیت پیدا ہوتی یعنی وہ کھانے پینے کی اشیا - کپڑے آلات یا قیمت یعنی زر کے معاوضہ میں قابلِ تبادلہ قرار پا گیا۔ اگرچہ سننے میں آیا ہے کہ مالیت کی اصل محنت ہے۔ مگر اس قول میں پوری پوری صداقت نہیں۔ جیسا کہ ہم اوپر کی مثال میں دیکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اکثر اشیا جن میں [illegible] صرف محنت نہیں لگتی۔ تاہم جب تک انکی احتیاج یعنی کوئی خریدار یا ان کے بدلے میں کچھ دینے پر تیار نہ ہو وہ بے قدر ہوتی ہیں اور ان میں کچھ مالیت نہیں ہوتی۔

قیمت کی کمی بیشی

ہم سب جانتے ہیں کہ جب کسی چیز کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے تو اس کی قیمت بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور جب اس کی ضرورت کم ہو جاتی ہے تو قیمت بھی کم ہو جاتی ہے۔ ایسا قاعدہ ہے جس سے سب اچھی طرح واقف ہیں اور اسی کی بنا پر تمام تاجر اور دکاندار مال کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ کسی چیز کی بہت ضرورت ہے تو مال بیچنا شروع کر دیتے ہیں اور ادھر بھی خرید کرتے جاتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ مانگ کم ہو گئی۔ مال سستا کر دیتے ہیں اور خریداری بند کر دیتے ہیں۔ لیکن جب مال کی مانگ بہت زیادہ ہو جاتی ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سر توڑ کوشش کر کے اس کی پیداوار بڑھائی جاتی ہے اور ضرورت کو پورا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب فصل خراب ہوتی ہے۔ غلہ کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو دوسری جگہ سے غلہ لانے میں فائدہ نظر آتا ہے اور اگر دوکاندار اتفاق کر کے قیمت کو کم نہ ہونے دیں تو یہ دوسری بات ہے ورنہ غلہ کی کثرت سے قیمت ضرور کم ہوگی۔ اگر کہیں غلہ حد سے زیادہ پیدا ہو تو اس کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔

کیونکہ غلہ تو سب کے پاس فروخت کے لئے کافی موجود ہوتا ہے اور خرید کوئی
کرنا نہیں چاہتا - اس لئے ضرور ہے کہ ارزاں ہو - کیونکہ در اصل اب اس کی
ضرورت نہیں رہی - لیکن یہ حالت تا دیر قائم نہیں رہ سکتی - بالخصوص اگر ملک
میں آمد و رفت کے وسائل آسان ہوں سڑکیں صاف اور پل مضبوط اور
ریلیں جاری ہوں اور غلہ بسہولت ایسے مقامات میں جہاں گرانی ہو جا سکے
تو یہ ارزانی زیادہ عرصہ تک بحال نہیں رہ سکتی - سڑکوں اور ریلوں کا ایک بڑا
فائدہ یہ بھی ہے کہ وُہ بلحاظ ضروریات ملک میں ہر جگہ غلہ اور دیگر اشیاء کے
ذخیرہ کو درجہ مساوات پر لے آتی ہیں - یعنی جہاں ارزانی ہو وہاں سے
غلہ ایسے مقامات میں جہاں گرانی ہو گھسیٹ لیجاتی ہیں اور جہاں گرانی ہو
وہاں دُوسرے مقامات سے باسانی اور کم خرچی سے لاکر بہم پہنچاتی ہیں - گزشتہ
زمانہ میں ہندوستان کے بعض مقامات میں غلہ اس کثرت سے ہوتا تھا کہ کوئی
اس کا خریدنے اور باہر لیجانے والا نہ ملتا تھا اور وُہ کھیتوں میں پڑا پڑا سڑ
جاتا تھا - درحالیکہ بعض دیگر مقامات میں بیشمار لوگ مصائب قحط سالی کے
پنجے میں گرفتار اور جان سے بیزار ہوتے تھے - ان دنوں نہ سڑکیں تھیں
اور نہ ریل پھر دُور دراز مقامات پر باسانی غلہ کا پہنچانا نا ممکن ہوتا تھا ظاہر
ہے کہ اس میں دو طرفہ نقصان تھا - اِدھر جو بھوک اور فاقوں سے جان دیتے
تھے انہیں اناج نصیب نہ ہوتا تھا اور اُدھر جن کے پاس غلہ کی یہ کثرت
ہوتی تھی کہ پڑا پڑا سڑ جاتا تھا انکا مال تباہ ہوتا اور محنت رائگاں جاتی تھی

قیمت کن کن اجزا سے مرکب ہے

ہماری سب بڑی بڑی ضروریات کا
مدار زمین کی پیداوار پر ہے - اس لئے
اول انہیں چیزوں کی مالیت کی تفصیل کی سوچ بچار جو خاص زمین سے پیدا

ہوں ضروری ہے۔ ان میں تمام قسم کے اناج۔ پھل۔ جنگل کی پیداوار۔ پتھر
معادن اور رنگ وغیرہ شامل ہیں۔ اب مثالاً دیکھنا چاہئے کہ ایک من
گیہوں کی پیداوار پر کیا لاگت پڑتی ہے۔ پہلے ایک مقام پر بیان ہو چکا ہے
کہ فصل کی پیداوار کے لئے تین چیزیں زمین۔ محنت اور سرمایہ لازمی ہیں۔
تو پہلے زمین کا کرایہ یعنی محصول اس ایک من پر چڑھا۔ پھر اس پر مزدوروں
کا محنتانہ یعنی انکے کھانے کپڑے کی لاگت جو انہوں نے یہ گیہوں تیار
ہونے تک کھایا اور پہنا اضافہ کیجئے۔ اور تیسری بات یہ کہ اس سرمایہ
کا سود یا نفع جو ایک مدت تک کام دیتا رہا وہ بھی اس پر زیادہ ہونا چاہئے
اس سرمایہ کی صورتیں تین ہونگی ایک تو یہ کہ کسی سے قرض لیا جاوے اور
بیج اور آلاتِ کشاورزی کے خریدنے میں صرف ہوا اور اس کا سود دینا
پڑے۔ دوسری یہ کہ وہ پہلے ہی بیج اور آلات کی شکل میں زمیندار کے
پاس موجود ہو۔ پس کم از کم اس مدت کی گھسائی اور انکی شکست ریخت کی مرمت
تو اس کے سر پڑے گی۔ ان سب مصارف کو جمع کرنے سے ابتدائی لاگت
ایک من گیہوں کی جو ابھی کھیت ہی میں ہے معلوم ہوئی۔ پھر ضرور ہے کہ
زمیندار یا خریدار اسے وہاں سے اٹھا کر شہر میں پہنچنے کو لائے اس پر بھی
کچھ نہ کچھ خرچ ہوگا اور وہ بھی لاگت میں شمار ہوگا۔ اس پر خریدار کا نفع اور
اس چھوٹے بیوپاری کا نفع جو اس سے خریدیگا شامل ہوگا۔ انجام کار
اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے کہ گیہوں کام میں لانے کے لئے تیار ہے اور
یہ کل مصارف ملا کر جتنی لاگت یا نرخ بازار قرار پائے۔ لیکن اس بازاری
قیمت یا نرخ بازار کی کمی بیشی حالات پر موقوف ہے۔ بعض ایسے حالات
پیش آسکتے ہیں کہ جن سے اس قیمت میں از حد زیادتی واقع ہو جائے اور

بعض ایسے جن سے کم۔ فرض کرو کہ ایک قطعہ زمین نہایت ہی زرخیز ہے اور
اپنی ارد گرد کی زمین سے دوگنا پیدا کرتا ہے۔ اب اگر یہ گیہوں اس قیمت
سے پیدا ہوا ہے تو جہاں اور زمینوں کا حاصل دو من ہوگا۔ اس قطعہ میں
اسی سرمایہ اور محنت سے چار من پیدا ہوگا۔ اور اس لئے اس قطعہ کا کاشتکار
اپنا گیہوں اپنے ہمسایوں کی نسبت نصف قیمت پر فروخت کرنے کے
قابل ہے۔ مگر وہ نصف قیمت پر فروخت نہیں کریگا۔ جب ایسی زمین
کے کاشتکار جو زرخیز بھی نہیں اور مقابلۃً خراب گیہوں پیدا کرتی
ہے۔ مجبور ہیں کہ اپنی محنت اور سرمایہ کے مصارف یعنی لاگت اور نفع
وغیرہ کا تخمینہ کرکے ایسے بھاؤ پر گیہوں فروخت کریں کہ اُن کو کسی طرح
کا نقصان نہ ہو تو پھر اچھی زمین والا ان سے کم نرخ پر کیونکر فروخت
کرسکتا ہے۔ وُہ بھی انہیں کے نرخ پر فروخت کرے گا۔ اس سے
معلوم ہوا کہ گیہوں کی قیمت فروخت وُہ لاگت مع نفع ہے۔ جو کم سے
کم پیداوار کی زمین پر پڑے۔ پس اگر معلوم کرنا ہو کہ زمین کی عام
پیداوار پر کیا لاگت ہوگی تو ہمیں یہ دیکھنا لازم ہے کہ بدترین زمین پر
کیا آئیگی اور یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ عمدہ ترین پر کیا لاگت آئیگی۔ اب یہ
فرض کرو کہ ان قطعات کے گرد و نواح میں غلہ بہت ارزاں یعنی کم لاگت
سے پیدا ہوسکتا ہے اور ملک میں ریل اور سڑکوں اور دیگر وسائل آمد و
رفت کے بدولت بہت کم مصارف راہ سے ہر جگہ پہنچ سکتا ہے اور
اس طرح منڈیوں میں افراط سے جمع ہوگیا ہے تو اس صورت میں نرخ بازار میں
بڑی تبدیلی واقع ہوجائیگی اور ممکن ہے کہ قیمت بہت کم ہوکر نہایت
ارزانی ہوجائے۔ اب صرف وہی لوگ غلہ فروخت کرینگے۔ جن کی

پیداوار پر لاگت کم ہو اور وہ لوگ تنگی زمینوں پر بہت لاگت سے کم غلہ پیدا
ہوتا ہے۔ اُنکو یا تو نقصان اُٹھا کر فروخت کرنا ہوگا اور یا اپنے غلہ کی فروخت
اچھے وقتوں پر اُٹھا رکھنی پڑیگی۔ یعنی جب قیمت چڑھ جائے اور اچھے
دام وصول ہو سکیں۔ لیکن عموماً قاعدہ یہ ہے کہ اگر ایک بڑے وسیع ملک
کی پیداوار لوہے کے مقابل۔ اناج کی بجیہ ضرورت یا کھپت کا بھی پورا
لحاظ کر لیا جاوے۔ تو وہاں ریل اور اچھی پختہ سڑکوں کا یہ اثر ہوتا ہے
کہ قیمت خوراک سب جگہ مساوی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ان ذرائع سے بڑے
کم خرچ پر جہاں غلہ کی افراط ہو وہاں سے وہ کھنچ کر ایسے مقامات میں جہاں
اس کی تفریط ہو پہنچ جاتا ہے۔ اور اس لئے جہاں پہلے غلہ کی کمی ہوتی
ہے وہاں وہ زیادہ ہو جاتا ہے اور جہاں بیشی ہوتی ہے وہاں تھوڑا
رہ جاتا ہے اس لئے مقام اول الذکر میں پیشتر کی نسبت گرانی اور آخر الذکر
میں گذشتہ کی نسبت ارزانی واقع ہو جاتی ہے جس کا بین نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ کسی جگہ بھی غلہ کی قیمت میں کوئی تفاوت نہیں رہتا۔ نہ ایک مقام پر
ایک ہی وقت میں گرانی رہتی ہے اور نہ دوسری جگہ معتدبہ ارزانی قائم
رہ سکتی ہے۔ لوگ قدرے طمانیت سے بسر اوقات کرتے ہیں اور انہیں
میں داد وستد زیادہ آزادی سے ہونے لگتی ہے۔ مگر اس قسم کے
وسائل آمدورفت وتجارت کے اثرات اور فوائد کا بیان کسی دوسرے
موقعہ پر کیا جائیگا۔

زراعتی پیداوار کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ کا ایک اور باعث آبادی
کی کثرت اور قلت ہے۔ یہ ظاہر بات ہے اگر آبادی موجود سے دوگنی
ہو جائے اور مقررہ مقدار خوراک پر جو اس آبادی کے لئے مکتفی ہے

گزارہ کرنا پڑے تو ضرور ہے کہ غلہ کی قیمت بڑھ جائیگی ۔ اب یہاں ریل کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ وہ اور مقامات سے جہاں غلہ بافراط ہوا سے وہاں سے یہاں کھینچ کر لے آئے بلکہ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ آبادی کو اسی مقام سے اٹھا کر دیگر ارزاں مقامات میں جا ڈالے ۔ اس بات کو دل نشین کرینا مناسب ہے کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت خوراک ہے اور جب خوراک کمیاب ہو جائے تو چھوٹی چھوٹی ضروریات کو خیرباد کہنا پڑتا ہے ۔ مثلاً جب گیہوں گراں ہو جاتے تو لوگ چار ۔ تصابن اور مصری اور کپڑے وغیرہ سے بچت کر کے گیہوں خریدنے میں صرف کرینگے اور اس طرح کپڑے وغیرہ کی مانگ کم ہو جائیگی جس چیز کی مانگ کم ہو وہ ارزاں ہو جاتی ہے ۔ آٹے کی گرانی سے کپڑے اور علیٰ ہذا دیگر اشیا میں ارزانی ہو جائیگی ۔ جب خوراک بہت ارزاں ہوتی ہے تو کاشتکار کا منافع بہت کم ہو جاتا ہے اور کم پیداوار کی زمین کی کاشت کم ہوتی ہے ۔ پس کم زرخیز زمین کی کاشت میں جبھی کچھ منفعت ہو سکتی ہے جب خوراک کی قیمت بہت چڑھی ہوئی ہو ۔ پس بدترین زمین کی کاشت خوراک کی سخت گرانی پر موقوف ہوتی ہے ۔

اس ضمن میں یہ بات قابل یادداشت ہے کہ گیہوں بلکہ ہر ایک غلہ کی قیمت جو زمین سے پیدا ہوتا ہے ۔ چند سالوں تک بحساب اوسط ایسی رہنی چاہیے کہ اس سے کاشتکار کو نفع ہوتا رہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے ۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو کچھ عرصہ کے بعد لوگ گاؤں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائیں ۔ جہاں کہیں اب بھی زمین زرخیز نہیں رہتی لوگ رفتہ رفتہ نقل مکان کر کے اس وجہ سے کہ زمین سے وصول کچھ نہیں ہوتا ۔

دوسری جگہ جا آباد ہوتے ہیں لیکن اگر انتظام سلطنت اچھا ہو تو ایسا کم
ہی اتفاق ہوتا ہے۔ کیونکہ خشک سالی میں عموماً گورنمنٹ یا مالک زمین
کا لگان معاف یا کم کر دیتے ہیں اور اس کی ادائیگی دیگر اچھی فصلوں پر
موقوف رکھتے ہیں۔ ان غریبوں کی امداد مالکان زمین کا صرف فرض
ہی نہیں بلکہ اپنے کاشتکاروں کے برقرار رکھنے میں انکا ذاتی مفاد بھی ہے

اشیائے ساخت کی قیمت

زمین کی سادہ یعنی خام پیداوار کی لاگت کی نسبت جو کچھ بیان ہوا ہے۔ اس کا اشیائے
پر بھی حاوی ہے جنکو اشیائے ساخت کہتے ہیں۔ مثلاً روئی اور گنا زمین
سے اُگتے ہیں "پیداوار خام" کہلاتے ہیں۔ ان پر مزید محنت صرف کرنے سے
ان سے کپڑا یا مصری بنانا ساخت کہلاتا ہے ان چیزوں کی قیمتوں
میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں۔ اول یہ کہ خام مسالہ کی قیمت اشیائے
ساخت کی قیمت فروخت کا ایک ناقابل لحاظ و خفیف سا جزو ہوتا ہے
مثلاً اگر ایک گز کپڑے کی قیمت دو آنے ہو تو اس میں روئی کی قیمت
صرف دو پیسے یعنی کل قیمت کا چہارم حصہ ہوگی۔ باقی کا ڈیڑھ آنہ کپڑے
کی ساخت کی لاگت ہے یعنی اس میں کاتنے اور کپڑا بننے کا خرچ اور اس
سرمایہ کا سود (جس سے کرگھہ تیار ہوا) اور کاریگر کا منافع شامل ہوگا۔ اب
چونکہ روئی کپڑے کی قیمت کا صرف ایک چوتھائی حصہ ہے۔ اس لئے روئی کی
قیمت میں اگر بہت سا اضافہ بھی ہو جائے تو بھی کپڑے کی قیمت میں
کچھ بڑا تفاوت پیدا نہ ہوگا۔ حق یہ ہے کہ روئی کی قیمت میں ۲۵ فی صدی
کی ترقی سے ممکن ہے کہ کپڑے کی قیمت میں صرف ۱۰ فی صدی کا اضافہ
ہو جائے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ خام مسالہ کی قیمت میں خاصہ تغیر ہونے پر

بھی ساخت کی چیز کی قیمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ یہاں چونکہ ساخت کی لاگت اصل سے تین گنا ہے۔ اس لئے خواہ روئی ارزاں ہو یا گراں کپڑے کی قیمت میں ممکن بلکہ اغلب ہے کہ کچھ تفاوت نہ رہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ روئی خواہ ارزاں ہو خواہ گراں کپڑے کی ساخت کی لاگت میں کچھ تفاوت نہ ہوگا۔ تو اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اشیائے ساخت کی مانگ کی کثرت سے ہمیشہ ان کی قیمت ساخت میں زیادتی کی جانب میلان نہیں ہوتا۔ چنانچہ مثال ذیل سے اس بات کی توضیح اچھی طرح ہو جائیگی۔ فرض کرو کہ ایک بڑا شہر ہے موسم برسات کے باعث سے سال میں چھ مہینے اس کی آمد و رفت کے راستے مسدود رہتے ہیں۔ نہ کوئی باہر سے اندر جا سکتا ہے نہ اندر سے باہر۔ فرض کرو کہ ایسے وقت بازار میں خام روئی بہت سی موجود ہے اور نیز یہ کہ روئی کا کپڑا بھی موجود ہے اور دو آنہ گز کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔ یکایک شہر کے حاکم نے حکم دیا کہ کل فوج کے لئے وردی تیار کر دے۔ اب کپڑے کی ایسی مانگ پیدا ہونے سے باوجودیکہ بیشمار روئی بازار میں موجود ہے اسکی قیمت میں کچھ نہ کچھ زیادتی ہو جائیگی۔ تاہم اس سے کپڑے کی قیمت میں بڑا معتدبہ فرق نہ آئیگا۔ اب حاکم کو جس خاص قسم کا کپڑا درکار ہے وہ تو بازار میں تھوڑا ہی ہے۔ اس بات اور نیز روئی کی گرانی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ کپڑا بہ نسبت پیشتر کی نسبت مہنگا ہو کر قریباً تین آنے فی گز کے نرخ پر فروخت ہو جائیگا۔ مگر چونکہ ضرورت بڑھتی ہے۔ اس لئے شہر کے کل جلاہے اکٹھے ہو کر قسم مطلوبہ کا کپڑا تیار کرنے میں بازور شور سے ساعی ہونگے جو کپڑا پہلے پہلے تیار ہو جائیگا اس کی قیمت تو ضرور زیادہ ہوگی یعنی

دو آنہ سے زیادہ مگر تین آنے گز تک بمشکل پہنچیگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہر میں جتنیا جولاہے ہیں اور چونکہ ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ میرا کپڑا جلد فروخت ہو جائے۔ اس لئے دوسروں سے ارزاں فروخت کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس باہمی مقابلہ سے قیمت گھٹتی جاتی ہے مگر یہاں ایک بات اور قابلِ لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ کپڑے کی ضرورت ہے۔ اور جولاہے چاہتے ہیں کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے تیار ہو جائے۔ وہ پہلے اگر چار گھنٹے کام کرتے تھے تو اب آٹھ گھنٹے محنت کرتے ہیں اور آگے کی نسبت خود بھی دگنی مزدوری حاصل کرتے ہیں اور مددگاروں اور کارندوں کو بھی زیادہ معاوضہ دیتے ہیں۔

اس لئے ممکن ہے کہ کچھ عرصہ تک کپڑے کی قیمت چڑھی رہے لیکن انجام کار یہ ہوتا ہے کہ اس سرگرمی سے کام کرنے کی بدولت کپڑا ضرورت سے زیادہ تیار ہو جاتا ہے اور وہ وقت آجاتا ہے کہ انکو اس کے نکالنے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی فکر پڑ جاتی ہے اور کپڑا پھر کم قیمت پر فروخت ہونے لگتا ہے۔ اس وقت نہ انکو اپنے لئے زیادہ معاوضہ کی ضرورت رہتی ہے۔ اور نہ وہ دوسروں کو معمولی مزدوری سے زیادہ دیتے ہی ہیں۔ لہذا قیمت گر کر اپنی اصلی سطح پر یعنی ۲ فی گز یا اسی جگہ پر جہاں واجبی منافع باقی رہے آپہنچتی ہے۔ اور اگر قیمت اس سے بھی کم ہو جائے تو کپڑے کی ساخت موقوف ہو جائیگی یا وہ لوگ کوئی ایسا کام کرنے لگ جائینگے جس میں زیادہ آمدنی ہو۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اشیائے ساخت کی قیمت اس درجہ سے جہاں واجبی منافع آئے اور کام کرنے والوں کا

پیشتر ملک کبھی شاذ ہی اترتی یا چڑھتی ہے۔ اور کبھی زیادہ بھی ہو جائے تو اور لوگ جھٹ ہی مقابلہ شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کم ہو کر اپنی اصلی جگہ پر آ ٹھہرتی ہے اور اگر گھٹ کر وہ اس سطح سے اتر ہی جائے تو پھر اشیاء کی ساخت کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔

یہ قانون زمین کی خام پیداوار پر پورا پورا حاوی نہیں ہے۔ سبب یہ ہے کہ زمین کی پیداوار خاص خاص قطعات کی خوبی اور مختلف موسموں کی پابندی پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر اراضی پیداوار کی قیمت زیادہ ہو جائے تو جب تک مانگ میں ترقی ہوتی رہیگی۔ قیمت میں بھی برابر زیادتی ہوتی جائیگی۔ یہاں تک کہ جب قیمت حد سے گذر جائیگی تو بہت سے خریداری کی تاب نہ لا کر اس سے دست بردار ہو جائینگے۔ اور مانگ کم ہو جائیگی۔

نرخ نامے یہاں کچھ حال سرکاری نرخ ناموں کا لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ انکا رواج ہندوستان میں بہت ہے۔ ہر بڑے شہر میں اشیائے خوردنی کی قیمت بطور سرکاری مقرر کیجاتی ہے اور یہ دستور ایام قدیم سے چلا آتا ہے۔ اہل یورپ اس دستور سے آشنا نہیں۔ اور نہ انہیں کچھ ضرورت ہی ہے۔ دنیا کے اس حصے میں تجارتی مقابلہ ایسا شدید اور آزادی تجارت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ کہ وہاں اس قسم کے سرکاری نرخ نامے بیکار ہیں۔ علاوہ ازیں اگر کوئی سرکاری نرخ ٹھہرایا بھی جائے تو نہ خریدار کچھ اسکی پروا کرینگے نہ فروشندے۔

ہندوستان میں یہ رواج دیر سے چلا آتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ خرید و فروخت کرنے والوں کے حق میں خصوصاً اشیائے خوردنی کے متعلق بہت کچھ مفید ثابت ہوا ہے۔ تجارت پیشہ لوگ بڑے طامع ہوتے

ہیں اور گراں فروشی سے خریداروں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس میں
ایک فائدہ تو یہ تھا کہ سرکاری نرخ کے مطابق لین دین سے رعایا نقصان
سے محفوظ تھی۔ دوسرا فائدہ یہ کہ سرکاری کارندے اور سپاہی عموماً
غریب دکانداروں کو لوٹ لیا کرتے تھے اور اس انتظام سے تجار لوگ
سپاہیوں کی زبردستی سے مامون ہو جاتے تھے۔ اگر دکاندار کے اختیار
میں ہو کہ اپنے مال کی قیمت کو روزانہ تغیر حالات کے موافق کم و بیش کر سکے
تو معمولی نفع لینے پر قناعت کر سکتا ہے مگر جب مجبوراً اسے ایک خاص وقت
تک کسی شے کا نرخ مقرر کرنا پڑے تو وہ سوچ لیتا ہے کہ اس اثنا میں
اگر یہ چیز گراں ہو جائیگی تو مجھے ضرور نقصان برداشت کرنا پڑے گا لہٰذا
وہ شروع ہی سے کچھ زیادہ قیمت نرخنامے میں درج کراتا ہے کہ اصلی قیمت
سے زیادہ ہوتی ہے۔ اب اس اثنا میں اگر درحقیقت مال ارزاں ہو گیا تو
وہ اسی نرخ سے فروخت کرتا رہیگا۔ اور اپنے حق سے زیادہ نفع کھاتا رہیگا

اس سے واضح ہوا کہ نرخناموں سے ہمیشہ قیمت چڑھی رہتی ہے اور اگر
حکومت عادل ہو تو پھر اس انتظام کا معدوم ہونا ہی زیبا و شایاں ہوتا ہے۔
یہ امر کہ نرخ سرکاری کے باعث ساہوکار آپس میں ایکا کرنے نہیں پاتے
محض غلط اور بے بنیاد ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ قیمتیں مقرر ہونے سے پہلے
ہی وہ جوڑ توڑ سے ایکا کرتے ہیں۔ قیمتوں کو اپنی اصلی سطح پر قائم رکھنے
کے لئے اس سے بہتر ترکیب نہیں کہ تجارت کو بے روک ٹوک اپنی روش
پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آمد و رفت کی سہولت
اور آسانی کے لئے راستے سڑکیں اور ریلیں اور نہریں کھول دی جائیں

اشیائے ساخت کی قیمت کا مدار شرح مزدوری پر نہیں ہوتا

اشیائے

ساخت کی قیمت کا اندازہ کرنے میں اس امر کا خیال کر لینا مناسب ہے کہ کسی چیز کی ساخت کے تخمینہ کا انحصار کام کرنیوالوں کی مزدوری یا محنتانہ پر نہیں ہوتا۔ مثلاً علاقہ بمبئی میں بڑھئی کی مزدوری شمالی ہندوستان کے بڑھئی سے دوچند ہے۔ تاہم بمبئی میں ایک پل یا عمارت کی لاگت دہلی کے پل یا عمارت سے دوچند نہیں ہوتی۔ بات یہ ہے کہ بمبئی کا کاریگر صناعی یا ہنرمندی یا مضبوطی اور جفاکشی میں شمالی ہند کے بڑھئی سے افضل ہوتا ہے اور دن بھر میں اس سے دوچند کام کر لیتا ہے۔ لہذا وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے معقول مزدوری ملے۔ اسی طرح انگلستان میں کام کرنے والے ہندوستان سے چار۔ پانچ گنا مزدوری پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہنرمندی اور جفاکشی ہی میں ان پر فوق نہیں رکھتے بلکہ ان سے بہتر مکانوں میں رہتے ہیں۔ بہتر لباس پہنتے اور بہتر کھانے کھاتے ہیں اور جب انہیں اپنی معیشت کے موافق معاش نہیں ملتی تو نقل مکان کرکے ایسے مقاموں میں چلے جاتے ہیں۔ جہاں معقول گذارہ ہو سکے یہ بات آسانی سے ہندوستان میں ممکن نہیں۔ اول تو بدقسمتی سے یہاں کے پیشہ ور۔ ذات اور رسم و رواج کی قیود اور پابندیوں سے ایک ہی پیشہ میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوم بمشکل ترک وطن کرتے اور ان قصبات سے باہر جانے پر جہاں انکی پیدائش ہوئی ہو۔ بدقت تمام رضامند ہوتے ہیں۔ مگر زمانہ تبدیل ہو رہا ہے اور توہمات دور ہوتے جاتے ہیں۔ اور وہ وقت قریب ہے کہ جب ہندوستانی کاریگر بھی اپنے یوروپین ہم پیشہ برادروں کی طرح جہاں اچھی مزدوری ملتی دیکھا کرینگے نقل مقام کرکے جھٹ وہیں پہنچ جایا کرینگے +

صادق علی مرتبہ کرشنمیرا

ہوائی مجسٹریٹ

ختم تجھ پر یہ کام ہے تیرا

واہ کیا انتظام ہے تیرا

ہوائی۔ یہ کیسا دُھواں نکل رہا ہے۔ صُبح سے جان عذاب میں ہے دیکھو

توسہی کون بدمعاش ہے جو اس قدر سویرے دُھواں کر رہا ہے۔ الٰہی

توبہ مارے دھوئیں کے ہماری آنکھیں کاجل کی کوٹھری بن رہی ہیں

کوئی ہے؟

نندو۔ حضور۔

ہوائی۔ ہاں۔ حضور۔ حضور۔ کہتا کیا ہے۔ جواب دو کیسا دُھواں ہے؟

نندو۔ حضور۔ میرا تو کوئی قصور نہیں۔ یہ تو دیوار کی پرلی طرف سے

دُھواں آرہا ہے۔ خدا جانے کون آگ جلا رہا ہے۔

ہوائی۔ روکو۔ روکو بند کرو بند کرو کوئی ہو بند کرو۔ کیسا بیوقوفی ہے۔

نندو۔ جانے خدا کون ہے۔

ہوائی۔ آخر کوئی ہے دیکھو آسمان سیاہ ہو رہا ہے۔ دماغ جل گیا تم

کس واسطے رکھا ہے۔

نندو۔ حضور میں کیا دھوئیں کے ساتھ ہی ہوا ہو جاؤں۔ کسی نے آگ

جلائی ہوگی میں کیسے روکوں۔

ہوائی ہاں جی بیوقوف تنگ کرتا ہے۔ روکو۔ کیسا بات۔

نندو۔ بھلا میری آواز سے دُھواں کون روکتا ہے۔

ہوائی۔ کیا کہا؟ نہیں رُکتا۔

نندو۔ جناب نہیں رُکتا۔ اور رُکے کیسے۔ کوئی ہم بادشاہ ہیں۔ کہ محلّہ گلی کا دُھواں روکتے پھریں۔ لوگ آگ نہ جلائیں۔ یہ بھی اچھی ہی۔

ہوائی۔ ہاں بکتا کیا ہے کون محلّہ والا اور کون جلانے والا۔ محلّہ ہمارا ہے۔

نندو۔ نہیں حضور۔ چپ ہی رہیے۔ یہ محلّہ بہت بُرا ہے۔

ہوائی۔ ہائے کیا کہا۔ ہم اور ہمارے مقابلہ میں کوئی۔ تمہیں کیا ڈرتے ہو۔

نندو۔ تو فرمایئے میں آخراب کروں کیا۔

ہوائی۔ فوراً جاؤ اور روکو۔

نندو۔ اور اگر کوئی بگڑے۔ اور میری پگڑی اُتار لے تو پھر۔

ہوائی۔ چہ خوب اُتار لے۔

اور ہم۔ جاؤ ہی۔

نندو۔ اچھا جاتا ہوں۔

غریب نندو آقائے نامدار کی جھڑکیوں سے تنگ آ کر لال گلی میں سے نکلا اور لالہ بشن داس کے نوکر کو آہستہ سے کہا بھئی اتنے سویرے آگ کیوں جلائی۔ ہمارے آقائے نعمت تو دُھوئیں سے سوسو آنسو رو رہے ہیں اُن کا تو دماغ بھی سیاہ ہو گیا۔ اب بند بھی کرو گے۔

نوکر۔ واہ تمہارے آقا بھی عجیب ٹھہرے۔ لالہ مچھروں کے اُڑانے کے واسطے آگ جلائی ہے۔ مواتنی ساری رات مارے مچھروں کے آگ پر بیٹھے رہے ہیں اور دھواں اتنی دُور خود بدولت کی ناک میں کیسے چلا گیا۔

نندو۔ بند کرو۔ بند کرو۔

نوکر۔ چھتری اٹھا کر۔ جا بے جا۔ آیا کہیں کا نازک مزاج۔ منہ تو دیکھو۔
نندو۔ ابے زبان سنبھال۔ جانتا نہیں۔ وہ ولایت سے آئے ہیں۔
نوکر۔ اچھا تو ولایت میں آگ نہیں ہوتی۔ یہاں پر سوٹیاں چلاتے میں
ذرا کے تیور۔ وہاں سے نندو بھانپ گیا کہ اگر کچھ اور بولتا ہوں تو
چندیا پیچ بیچ چولہے کا توا ہو جائیگی۔ چپکے سے چل نکلا۔
ہوائی۔ نندو! اب تک دھواں ہے۔ وجہ کیا؟
نندو۔ حضور! خود جائیں۔ میرا کہنا کون مانے۔
ہوائی۔ کیا ہم خود جائیں!
نندو۔ ہاں حضور۔
ہوائی۔ ابے بکتا کیا ہے۔
نندو۔ جائیے تو سہی۔ پتہ بھی تب ہی لگے گا۔
ہوائی مجسٹریٹ کے سر میں اپنی خیالی بڑائی کا دھواں دھار جوش
چھڑی ہاتھ میں لے گلی میں جا ہی نکلے۔
ہوائی۔ کون بے وقوف صبح ہی صبح دھواں کر رہا ہے؟
نوکر۔ میں۔
ہوائی۔ کس سے اجازت لیا۔
نوکر۔ اجازت کیسی! ہیں۔ کیا کہتا ہے۔ یہ بھی کوئی دیوار بنانی
تھی کہ کسی ممبر کمیٹی سے اجازت لی جاتی۔
ہوائی۔ پاگل۔ تم کون ہے۔ کیا بکتا ہے۔
نوکر۔ منہ بند رکھو جی تم کون ہو۔ دھواں بند کرنے آیا ہے دیکھو
تو سہی۔

ہوائی مجسٹریٹ نے جھٹ لکڑی اُٹھا ماری۔ نوکر سے اب کس طرح رہا جائے خود بدولت کو جھپٹ کر دبوچ ہی تو لیا۔ اب حضرت گھبرانے لگے کرنے ننھو ننھو۔

وفادار نوکر دوڑا اور گلی والے نوکر کی منت سماجت کر کے جان چھڑائی اور ہوائی مجسٹریٹ کو خیر سے خانہ ساز مجسٹریٹی کی قدر معلوم ہو گئی۔ ایک ہی جھپٹ میں ساری قلعی کھل گئی۔

اب راہ میں آتے آتے ننھو اور حضرت ہوائی گفتگو کا سلسلہ دیکھئے کیسا دلچسپ ہے۔

ہوائی۔ جاہلوں کے محلہ میں رہنا بے شک بے وقوفی ہے۔

ننھو۔ حضور میں نے تو پہلے ہی کہدیا تھا

ہوائی۔ بکومت۔ ہمارا تعزیرات ہند نکالو۔ ہم ابھی خبر لیگا۔ ہم نے کل رات وہی دفعہ پڑھا ہے۔ جو اس بیوقوف پر لگتا ہے۔ ہم سزا دلوادیگا۔ بیشک تم گواہ رہنا۔

خود بدولت جب گھر کے قریب پہنچے تو بدقسمتی سے ایک کتیا راہ میں بھونکنے لگی۔ آپ فرماتے ہیں۔

ہوائی۔ ننھو! کس کا کتیا ہے۔ دماغ چاٹ گئی۔ بند کرو۔

ننھو۔ آپ ہی بند کریں۔ مجھ سے نہیں بند ہوتی۔

ہوائی۔ ایک رہ گزر سے۔

ویل! تمہارا کتیا ہے۔ ساری رات بھونکتا ہے

رہ گزر۔ بھونکے مجھے کیا۔

ہوائی۔ کیوں بھونکے بند کرو۔

رو گرز۔ تم خود کرو۔

ہوائی۔ پاگل۔

رو گرز مارے غصہ کے لال ہو گیا۔ قریب تھا کہ گلی والے نوکر کی طرح

بھگت کرے۔ مگر خود بدولت نندو کی بدولت بچ گئے۔

ہوائی۔ ہم اس کی بھی خبر لیگا۔ سب سے سُنتا ہے۔ یہ کیا یاد کرینگے۔

نندو۔ جناب غسل تیار ہے۔

ہوائی۔ بہت اچھا تولیہ صابن وغیرہ وغیرہ تیار رکھو۔ ایک تو دھوپ

سے سبح ہی تیز ہے۔ بقہ پڑا اور دوسرے بدمعاش کتیا کی ہولناک آواز

نے جان کھائی۔ یاد کرانا۔ جب میں ڈپٹی کمشنر بہادر کے ہاں جاؤں

تو ذرا ان سب کا انتظام کرتا آؤں۔

نندو۔ بہت اچھا۔ یہ کمیٹی والے تو کسی کام کے نہیں۔

ہوائی۔ یہ کیا بلا ہیں۔ ان کا بھی بندوبست کرانا ہے۔ مجھے یاد نہیں

رہتا۔ ورنہ ان کی ممبری تو دم میں ہی نکلوا دوں۔ میرے نام سے

تو ان کی جان کانپتی ہے۔ آخر تم جانتے ہو۔

نندو۔ ہاں میں کیوں نہیں جانتا۔ حضور کی دھاک تو سارے شہر میں

پڑی ہے۔

ہوائی۔ نندو! تم سب کچھ سُنتے سُناتے ہو۔

نندو۔ ہاں قبلہ!

ہوائی۔ نندو! یہ نوبتا تو یہ الہ دین سوداگر مصر مول راج کے ہاں روز شام

کو کیوں جاتا ہے۔

نندو۔ جناب ان میں آپس میں بڑا یارانہ ہے۔ شب و روز اکٹھے ہی تو رہتے ہیں۔

کھانا پینا ایک ہے۔ دوست جو ہوئے۔

ہوائی۔ نہیں کچھ اور بات ہے۔ ہم کیوں نہیں کسی کے ہاں جاتے۔ وقت آئے سیدھا کر دونگا۔ کون ہیں یہ جو روز جمگھٹا بنائے سرگشت میں رہتے ہیں۔ ہمیں یہ وطیرہ بالکل ناپسند ہے۔

سندو۔ بھلا حضور کا اس میں کیا ہرج ہے۔

ہوائی۔ ہرج کیوں نہیں۔ اُن کے مزاج بھی نہیں پائے جاتے۔

سندو۔ واقعی مزاج کے تو بڑے تیز ہیں۔

ہوائی۔ مجھے بھی جانتے ہو۔ ایک دم میں ساری شیخی نکال دونگا۔ یہ گرمیاں جب بھی جو سر شام صحن میں بیٹھتے ہیں۔ مجھے تو آگ لگ جاتی ہے اور پھر غضب یہ کہ سامنے ہی حقہ بھی پیتے ہیں۔ یاد رہے۔ سندو! یہ سب میری نظر میں ہیں۔

سندو۔ روز ضیافتیں ہوتی ہیں اور بڑھ چڑھ کر۔

ہوائی۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ ان کا یارانہ نکلیگا کبھی اور میں ہی بجھے اُدھیڑ ڈالونگا۔

یہ تو دیکھو روز ہمارے ہی دروازہ سے فٹن گذرتی ہے اور کرکٹ کا رُخ بھی اسی طرف۔ یہ چڑانا نہیں تو اور کیا ہے۔ سمجھا دونگا بتلا دونگا کیسے مُڑتا ہوں۔ میرا کسی پر غصہ نہ آئے یہ ہیں کون کل کے نودولت نہ ذات نہ صفات۔

سندو۔ بالکل بجا بالکل درست۔ یہ حضور سے کب بچ سکتے ہیں۔

ہوائی۔ اچھا یہ بھی کوئی عزت ہے۔ کہیں ڈپٹی کمشنر بہادر جو ملتے ملاتے ہیں تو آپ کی اڑان ہی نرالی ہے۔ ایک ہی منتر میں پھونک ڈالا

جلانا دوں اور دکھاؤں کہ طاقت اور اقبال اس کا نام ہے۔

ننّدو۔ او بھی حضور نے سنا۔ فسٹ کلاس میں پڑھتے ہیں۔

ہوائی۔ ننّدو! سن چکا ہوں فکر میں ہوں یہ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔

ننّدو۔ بڑی بڑی آمدنیاں ہیں۔ دو دو ہزار ماہوار آتا ہے۔

ہوائی۔ انہیں مقدمے کون دے جاتا ہے۔ لوٹ ہے۔ خیر کوئی دن ہے قانون پنچایت جلدی ہونے والا ہے۔ اس وقت کون آئے گا اور کون دیکھیگا۔ میں قانون کی تائید میں ہوں۔

ننّدو۔ حضور کیوں نہیں آنریبل بنجاتے۔ جھگڑا ہی چکے۔ گھر کا قانون گھر کی حکومت۔

ہوائی۔ تو کیا اب نہیں ہیں۔ اس میں کیا رکھا ہے۔ کوشش شرط ہے۔

ننّدو۔ کوئی امید ہے۔

ہوائی۔ امید کے گھر ہمیشہ خالی رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے کام سے کب فرصت ہے کہ ان کھبیڑوں میں پھنسیں۔

ننّدو۔ یہ سامنے گھر والا جنٹلمین دوسرے تیسرے کسی نہ کسی کی ضیافت کردیتا ہے۔ کوئی بڑا مالدار ہے۔

ہوائی۔ خاک۔ نمائش ہی نمائش ہے۔

ننّدو۔ کیا تو سب لوگ بھوکے جلتے ہیں۔

ہوائی۔ تم بے وقوف ہو۔ میں اس کی بھی فکر میں ہوں۔ یہ کانٹا بھی نکلا چاہتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی مقابلہ پر آگئے تو دیکھنا کہ دنیا عش عش کرا ٹھیگی۔ اور تم نے یہ بھی سنا کہ روز شکار جاتے ہیں۔ معلوم نہیں لائسنس اس قدر سستے کیوں ہوگئے۔ میں ضرور کسی روز صاحب بہادر سے اسکی بابت بولوں گا۔

شندو۔ ضرور ہونا۔

ہوائی۔ ڈر کس کا۔ خوف کس کا۔ صفائی سے کہینگے۔ سینہ جل گیا ہے۔

شندو۔ سنا ہے حضور سردار شیر سنگھ بھی مجسٹریٹ ہو گئے۔

ہوائی۔ حیران ہو کر۔ اسے کون کہتا ہے۔ سچ!

شندو۔ ہاں حضور! سچ۔

ہوائی۔ اسے کس بیوقوف نے کر دیا۔

سُنّہ تو دیکھو اور بھلا اس بکھیڑے کی اُسے ضرورت ہی کیا تھی۔ ہم سے حاکموں نے سو دفعہ کہا۔ ہم نے ایک نہ مانی۔ بیباک ہیں جو ہماری عزت اور جو ہمارا رعب داب ہے وہ اور کسی کا کوئی ہے۔ جو مقابلہ کرے دُنیا تھر تھر کانپتی ہے۔ لوگ اگر جسموں پر حکومت کرتے ہیں تو ہم دلوں پر حکمراں ہیں۔

شندو۔ (چپکے سے)

سوائے گلی والے نوکر، و کتیا والے رہ گزر کے۔

ہوائی۔ یہ پارٹیاں کیوں روز روز ہوتی ہیں۔ ایک بیجا خوشامد اور خرچ ہے میں تو پسند نہیں کرتا۔ میری رائے میں یہ ایک مجمع خلاف قانون ہے قابل نوٹس ہو۔

شندو۔ آپ کبھی نہیں گئے۔ یا کسی نے بلایا ہی نہیں؟

ہوائی۔ ہمیں بلانے پر بھی نہیں جاتا۔ کیوں جاؤں۔

شندو۔ نقصان کیا۔

ہوائی۔ عام قسم کے لوگ وہاں ہوتے ہیں۔ رعب داب میں فرق آتا ہے۔

شندو۔ کل پانچ چھ جنٹلمین آپ سے ملنے آئے تھے۔ آپ اُس وقت سوتے تھے۔

ہوائی۔ نہیں کوئی نام ہو وہ اُسکے پاس کوئی سفارشی چٹھی نہیں تھی۔

سندو۔ نہیں۔

ہوائی۔ ضرور ہوگی۔ ڈپٹی کمشنر بہادر سے وہ سفارش چاہتے ہیں لیکن میں ایسوں کی سفارش نہیں کیا کرتا۔ تم جانتے ہو میں ایک نیک آدمی ہوں۔ صاحب مجھ کو جانتے ہیں لیکن میں منہ نہیں کھولنا چاہتا۔ اس میں میری سبکی ہے۔

سندو۔ بیشک حضور کا خیال درست ہے۔

ہوائی۔ یہ سید صاحب ہمارے پڑوس ناحق اپنا بھائی ولایت جو بھیج رہے ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے یہ کیا حماقت ہم سے پوچھتے تو ہم کچھ اچھی صلاح دیتے۔ کوئی سبیل ہو تو اسے رکوائیں۔

سندو۔ ہمیں کیا ضرورت۔

ہوائی۔ اور دیکھو تو بھی کہ مرد خدا سارا دن گھر سے نکلتا ہی نہیں یہ کرتا کیا رہتا ہے۔

اچھا سنا ہی سید گلاب دین نے دوسری بیوی کر لی ہے۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے یہ کیا خبط۔ میرے قابو سے نکل گئے ورنہ مزا تو چکھا دیتا۔ ذرا انکی پہلی بیوی سے جا کر تو پوچھئے تو بھی کہ اگر عرضی پرچے کی ضرورت ہو تو میں امداد کو حاضر ہوں۔ بس اشارہ ہی کافی ہے پھر میں میاں کی خبر لے لونگا۔

سندو۔ یہ میں نہ سمجھا کہ آپ کو دوسروں کے خانگی معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔

ہوائی۔ کیوں عامہ ہمدردی اس کا نام ہے۔

ہندو۔ اور اگر کوئی آپ سے یوں پیش آئے تو پھر۔
ہوائی۔ کس کی کیا مجال۔
ہندو۔ تو بے ادبی معاف۔ آپ کو کیا حق ہے۔ نہ منقی نہ قاضی۔
ہوائی۔ کمبخت یہ بے ادبی اور گستاخی۔ اور پھر ہماری شان میں۔
ہندو۔ ہوں تو خانہ زاد۔ مگر جب آپ بڑھ ہی نکلے تو اس قدر یاد دلانا
بھی ضروری تھا۔
یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ ہوائی مجسٹریٹ صاحب کے ایک پرانے دوست آنکلے۔
شیدا۔ کیوں حضرت، صبح سے یہی رام کہانی جاری ہے۔ ہندو غریب
تو کمپ کمپا کر چلا گیا اب میری باری آئی۔ آپ کوئی کوتوال ہیں یا کوئی
عالمگیر مجسٹریٹ کہ ہر کوچہ و ہر منزل میں آپ کی حکومت ہے۔ آپکی گرفت
سے کوئی چھوٹتا ہی نہیں۔
ہوائی۔ کیوں برائی کیا۔ یہ تو دوراندیشی اور عقل کا کام ہے۔ برا دیکھا۔
برا کہا اور اچھا دیکھا تو اچھا کہا۔ تنقید اخلاق تو ضروری ہے
شریعت اور قانون بھی تو اس واسطے آئے ہیں۔
شیدا۔ سبحان اللہ۔ اچھی کہی۔ یہ نکتہ چینی اور عیب جوئی ہے۔ اسے
کون عقلمند اچھا کہے اور پھر خواہ مخواہ کی حکومت اور اکڑفوں۔
بے اختیارات مجسٹریٹ کوئی مستثنا ہی نہیں۔ کوئی بچتا ہی نہیں۔
نہ اخبار میں نکلا اور نہ گزٹ ہوا۔ معلوم نہیں کہ خود بدولت نے
یہ اختیارات کیسے پالئے۔ صبح سے شام تک سوائے اس کے
کوئی کام ہی نہیں کہ فلاں شخص قابلِ انتظام ہے۔ وہ قابل بند وبست
ہے۔ وہ گیا وہ نکلا اسے تو اسے پکڑو۔ فلاں کیوں بولا اور کیوں اٹھا۔

ہوائی۔ ہم جو کچھ دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اور جو کچھ سُنتے ہیں وہ سناتے ہیں۔
شیدا۔ کہو ایک بار نہیں صد بار۔ لیکن مجسٹریٹی اختیار سے نہیں۔ بلکہ مخلصانہ اور دوستانہ۔ اس سے کون انکار کرتا ہے۔ گر کچھ خلوص تو ہو۔ نہ مجسٹریٹی سے کون ڈرتے۔
ہوائی۔ گنہگاروں کے واسطے ہم ایک تازیانہ اور بدروشوں کے لئے ایک چابک ہیں۔ ہمیں اختیارات حاصل ہیں اور اس سے ہمیں گریز نہیں۔
شیدا۔ ہم شکرگذار ہیں کہ آپ ہم گنہگاروں سے محبت رکھتے ہیں اور آپ ہمارے ہواخواہ ہیں۔ ہمیں اپنی کمزوریوں کا خود اعتراف ہے اور ہم اپنے شرم کے ساتھ خود جواب دہ ہیں۔ مگر یہ ضرور کہیں گے کہ آپ چشمِ بد دور ہیں۔ (ہوائی مجسٹریٹ)
ہوائی۔ تم لوگ ناعاقبت اندیش۔ ناقابلِ خطاب ہو۔ اور میری نظر میں روسیاہ ہو۔ سوچو اور سمجھو۔
شیدا۔ خدا کی نظر میں نہ ہوں۔ آپ کو اپنے اختیارات مبارک اور ہمیں ہماری روسیاہی۔
اور ہم صدقِ دل سے بزبانِ حضرتِ آرشد آپ کے سامنے یوں اپنے خدائے رحیم قادرِ مطلق سے استغفار اور دعا کرتے ہیں۔

اے کل جہاں کے خالق ہر شے بنانے والے
نیرنگیوں سے بزمِ ہستی سجانے والے
آتا نظر نہیں ہے گو آستان تیرا
لیکن بنا ہے سب کے دل میں مکان تیرا
ہر ایک کو عطا کی اک شان خاص تو نے

مگر ہر اک طبیعت میں خصاص تو نے
جس دل کو جیسا چاہا اس رنگ کا بنایا
اک موم کا بنایا اک سنگ کا بنایا

اک بندۂ رضا ہے جاں دادۂ وفا ہے
اک بانیٔ ستم ہے آمادۂ جفا ہے

پرواز پا کے خوش ہیں اونچی اڑان والے
اپنے کو جانتے ہیں وہ آسمان والے

پروانہ کو ہوا ہے سوزِ دروں عنایت
سینہ میں رکھ دیا ہے اس کے شرارِ الفت

مجھ کو عطا ہوا ہے دردِ نہاں جگر میں
شوریدگی کا سودا رکھا گیا ہے سر میں

اے کارسازِ عالم بگڑی بنانے والے
ہر اک بری بھلی سے مجھ کو بچانے والے

اس دل کی الجھنوں سے مجھ کو نجات دیدے
اس زندگی سے اچھی اور اک حیات دیدے

بے تابیوں سے مجھ کو یارب سکون ہو جائے
میری رگوں میں پیدا اک اور خون ہو جائے

بخشی دعا کو تو نے تاثیر یا الٰہی
آشفتہ کی اب بدل دے تقدیر یا الٰہی

سلطان احمد بہاولپوری

طرز تعلیم

موجودہ طرز تعلیم کے نقائص اور انکی اصلاح

آجکل جبکہ ملک میں قومی یونیورسٹیاں بنانے کی تجویزیں ہو رہی ہیں موجودہ طرز تعلیم کے متعلق غور کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ تحریر جو میں نے رندھیر کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن میں پڑھی تھی۔ اسی مضمون پر ہے اور اس کی اشاعت سے ممکن ہو کہ ملک کے اہل الرائے طرز تعلیم کے کسی پہلو کو قابل غور پائیں۔ اس کے نقص دریافت کریں اور کوئی مفید اصلاح معلوم کرنے میں کامیاب ہوں۔

(محمود علی از رندھیر کالج - کپورتھلہ)

موجودہ طرز تعلیم پر ایک تو اس حیثیت سے غور کیا جا سکتا ہے کہ چند مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اُن سب میں پاس ہونا کلاس سے ترقی پانے کے لئے ضرور ہے اور ہر ایک مضمون میں ایک خاص تعداد نمبروں کی پاس ہونے کے واسطے مقرر کی گئی ہے۔ دوسرے اس لحاظ سے غور ہو سکتا ہے کہ آیا موجودہ مضامین کاروباری قابلیت اور مختلف پیشوں کا حاصل کرنے کے لئے کافی ہیں۔ یا ضروریات زمانہ اور ملکی حالات کی وجہ سے کسی اور قسم کے علوم ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ یہ دونوں علیحدہ گانہ مضمون ہیں اور دیکھنے والے ہر دو امور کے متعلق بہت کچھ کہتے رہتے ہیں لیکن میں موجودہ مضامین کی ضرورت یا انکی بجائے کسی اور قسم کے مضامین کو رائج کرنے کے متعلق اس وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ بلکہ پہلی شق کو

اختیار کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ مضامین یہ ہوں یا کوئی اور ان کو حاصل کرنے کا موجودہ طرز کیسا ہو اور اگر یہ نہ ہو تو اور کیا ہو سکتا ہے۔

چند مضامین کا پڑھانا فی نفسہ معیوب نہیں اور جس قدر کسی مضمون سے واقفیت ہو بہتر ہے لیکن پڑھایا جائے اور دیکھا نہ جائے کہ پڑھنے والے نے کیا پڑھا یعنی امتحان نہ لیا جائے تو پڑھانے کا کچھ فائدہ نہیں بلکہ امتحان نہ لینا ایک طرف جن مضمونوں کے امتحان لئے جاتے ہیں لیکن ان میں پاس ہونا کلاس سے ترقی پانے کے لئے ضرور نہیں ہوتا یعنی جنکو اختیاری مضامین کہا جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کے امتحان سے بھی لڑکوں کو وہ مضمون دیگر مضامین کے برابر حاصل کرنے کی تحریک نہیں ہوتی اور عموماً ایسے مضامین میں وہ کوئی قابلیت پیدا نہیں کرتے۔ بس جس قدر مضامین پڑھائے جاتے ہیں ان کے امتحان لینے کا دستور اور بعد امتحان لینے پر فیل ہونے کی صورت میں کلاس سے ترقی نہ دینے کا دستور دونوں بجا اور مناسب ہیں لیکن اس طرز پر جو ضرورت کے واسطے اختیار کیا گیا ہے چند ناگوار نتائج بھی مترتب ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ جو تعداد جماعت اول میں داخل ہوتی ہے جب اس کو ہر ایک مضمون میں پاس ہونا ہوتا ہے تو لامحالہ دس سال تک سالانہ امتحان دیتے ہوئے ہمیشہ کم ہوتی رہتی ہے اور ایسے بہت کم لڑکے ہوتے ہیں جو ٹھیک دس سال میں دسویں جماعت تک پہنچ جائیں۔ اور جو ایسے سالانہ امتحانوں میں فیل ہوتے ہیں اور وہ بعض کلاسوں میں ضعف اور اس سے زیادہ تعداد کے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ایک یا چند کلاسوں میں دو دو تین تین سال گذار کر دس کے بجائے پندرہ سولہ سال میں دسویں جماعت تک پہنچتے ہیں

اور ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو ایک یا چند بار اس طرح کی ٹھوکریں کھا کر پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں اور جہاں خواہش ہوتی ہے چند علوم میں ایک خاص معیار کی قابلیت پیدا کرنے کی وہاں اُن بیچاروں کو باوجود چند سال کوشش کرنے کی حالت کے سوا کچھ نہیں ملتا ۔

جو تعداد قلیل دس سال میں دسویں جماعت تک پہنچتی ہے اور اس سے کسی قدر بڑی تعداد چند سالوں کا نقصان اٹھا کر وہاں تک جاتی ہے اور سکول فائنل میں پاس ہوتی ہے ۔ اب اس کی محنت شاقہ کا نتیجہ دیکھنا چاہئے کہ کیا ہوا! بیشک وہ پاس ہو گئے سارٹیفکیٹ مل گیا ۔ بعض کو نوکری کی اور بعض کو اعلیٰ علم کی کسی شاخ کے طالب علم بنجانے کی اُمنگیں پیدا ہو گئیں ۔ اچھا ہوا ۔ لیکن دس سال یا اکثر حالات میں دس سے زیادہ سالوں کی دماغ سوزی اور دیدہ ریزی نے قابلیت کیا پیدا کی ؟ بیشک بعض لڑکے ریاضی میں ہوشیار ۔ انگریزی میں طرار تاریخ جغرافیہ اور دیگر مضامین میں ایک حد تک باخبر ہوتے ہیں اور کہنا چاہئے کہ جس قدر فائدہ اس تعلیم سے ہو سکتا تھا وہ انہوں نے پا لیا ۔ مگر ایسوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے ۔ اور اس کے خلاف اکثر لڑکے اسی طرح پاس ہوتے ہیں کہ ایک دو مضامین میں اچھی لیاقت دکھائی اور باقی میں کم سے کم نمبر جو مقرر ہیں پا کر پاس ہو گئے ۔ اُن کے ایسے مضامین کی حالت جن میں کم سے کم نمبر پائے ہیں کیا ہوتی ہے ؟ جس مضمون کا مجھ سے تعلق ہے مجھے اس کا تجربہ یہ ہے کہ جنکو پڑھاتا ہوں اکثر انکے امتحان بھی لیتا ہوں اور پڑھانے کی اثنا میں جو واقفیت اُن کی قابلیت کے متعلق حاصل ہوتی ہے ظاہر ہے کہ سالانہ امتحان کا ایک پرچہ دیکھ لینے سے نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ بعض کے متعلق مجھے یقین ہوتا ہے کہ یہ پاس نہ ہو سکینگے ۔ خود امتحان لوں یا کوئی اور لے

اکثر وہ گمان صحیح نکلتا ہے۔ مگر بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نسبت
یقین ہوتا ہے کہ قابلیت جو اُن کے کورس سے حاصل ہونی چاہیئے
وہ ان میں ہرگز نہیں۔ البتہ طبیعت ایسی رکھتے ہیں کہ اگر کچھ عرصہ
اور اسی کلاس میں رہیں اور یہی کورس دُہرائے جائیں تو شاید
کچھ حاصل کر سکیں اور اس لئے دل میں ایک میلان ہوتا ہے کہ یہ لوگ
اس سال پاس نہ ہوں تو اچھا ہے۔ مگر امتحان لیتے وقت چونکہ دلی
میلان کی پیروی جائز نہیں اور پرچہ دیکھتے وقت ممکن ہی نہیں
کہ سوال کا جو حصہ انہوں نے لکھ دیا ہے اُس کے نمبر نہ دیئے
جائیں۔ اس لئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی سوال کا آدھا کسی کا چوتھائی کسی
کا دسواں اور کسی کا بیسواں حصہ دیئے ہوئے۔ جب میزان کرتا ہوں تو
بعض ایسے لڑکوں کو پاس دیکھتا ہوں جو نہ ہونے چاہئیے تھے۔ اب یہ
لڑکے جو پاس ہو گئے ہیں اگر اسی طرح پر یا کسی قدر زیادہ قابلیت دکھانے
سے اور مضامین میں بھی پاس ہو گئے ہوں تو اوپر کی جماعت میں پہنچ جاتے
ہیں مگر ان میں قابلیت ہرگز نہیں ہوتی اور آئندہ کلاس میں خواہ سکول کی ہو
یا کالج کی چل نہیں سکتے اور اگر پڑھنا چھوڑ کر کسی کام میں لگ گئے ہیں جب
بھی جو کام خاص ایسے مضمون کے متعلق ہو جس میں انہوں نے کم سے کم
نمبر لئے ہیں تو اس کام کو نباہ نہیں سکتے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جن لڑکوں
نے مضمون میں کسی قدر لیاقت حاصل کی ہے اور امید ان کے پاس ہو جانے
کی ہے۔ امتحان پر ایسے لڑکوں کے فیل ہو جانے کی مثالیں شاذ و نادر ہی دیکھنے
میں آتی ہیں۔ مگر ایسی مثالیں نسبتاً زیادہ ہیں جن میں ہم لوگوں کو ان کی نالائقی
کا یقین ہوتا ہے مگر امتحان کے اس ڈھنگ اور نمبروں کی اس تعداد کی وجہ

جہاں ان مضامین کا دخل نہیں چل سکتے ہیں اور نیز کالجوں میں بھی۔ جیسے نمبر پہلے پاسے تھے اسی قسم کے نمبر پر ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ پتہ جب لگتا ہے کہ ریاضی میں پچیس[۲۵] فیصدی پانے والا چونکہ سسٹم نے اس کی ریاضی کی قابلیت کو تسلیم کیا ہے۔ انجنیری میں بھیجا جائے۔ کیمسٹری اور فزکس کو ایسی حالت میں رکھنے والا میڈیکل کالج میں فزیالوجی کی تعلیم پائے۔ میکینکس میں صرف ثبت حاصل کرنے والا مشینری کے متعلق اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور اسی طرح اور مختلف کام جو عالمانہ قابلیت چاہتے ہوں اور جن کی ابتدا اسی قسم کے علوم سے ہوتی ہو جو سکول میں پڑھائے جاتے ہیں، وہ سب[۱] پاس کر کے بھی ان کا موں کو حاصل کرنے میں اعلیٰ نمبر پانے والوں کے برابر نہیں۔ اُن سے بکی رفتار کے ساتھ چل کر دکھائیں۔ حالانکہ اس کے خلاف ہوتا یہ ہے کہ ایسے گھٹیا نمبر پانے والے ریاضی میں ہوں تو انجنیری میں چل نہیں سکتے اور کیمسٹری میں ہوں تو میڈیکل کالج سے ناکام واپس آ جاتے ہیں۔

بس اگر میرے یہ دلائل صحیح ہیں تو موجودہ سسٹم کے اندر بہت سے مضامین رکھنے کے بعد ہر مضمون میں پاس ہونے کی شرط لگا کر بہت سے لڑکوں کا دس سال کا سفر پندرہ سال بلکہ اس سے زیادہ تک بڑھا دیا جاتا ہے اور بہت سے لوگوں کے لئے جو سب میں پاس نہیں ہو سکتے۔ تعلیم چھوڑنے اور جاہل رکھنے کا باعث ہوتا ہے اور بہت کم لڑکے ہوتے ہیں جو دس سال کا نصاب پورے دس سال میں ختم کر سکیں۔ یہ طریق ہر مضمون میں نمبروں کی چھوٹی مقدار پاس ہونے کے لئے مقرر کر کے پاس ہونے والوں کو ان مضامین میں نہ پاس ہونے کے برابر رکھتا ہے اور اگر ان مضامین کا کام پڑے تو لڑکے ان میں ہرگز نہیں

---

[۱] یعنی کم سے کم نمبر۔

چل سکتے۔ اور اس لئے اگرچہ موجودہ سسٹم پڑھتا بہت سے مضامین ہے مگر حقیقت میں یا تو کچھ بھی نہیں پڑھاتا اور لڑکوں کو دھکیل کر مدرسے سے باہر نکال دیتا ہے اور یا پڑھاتا ہے تو صرف ایک دو مضمون اور باقی میں محض دل خوش کر دیتا ہے اور نہ جاننے والوں کے سامنے فخر کرنے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بہت سے مضامین پڑھانے کے بعد چونکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کام اسی طرح پر ہونا چاہئے نہ کسی مضمون کو بے امتحان چھوڑ سکتے ہیں اور نہ امتحان میں فیل ہونے پر ترقی دے سکتے ہیں۔ اس لئے ان قباحتوں کا مرکز مضامین کی کثرت ہے اور ہم آپ جن لڑکوں کو پڑھاتے ہوئے نالائق کا خطاب دیدیا کرتے ہیں بہت سے واقعات میں ہمارا یہ فیصلہ غلط ہوتا ہے۔ حقیقت میں وہ بہت سے مضامین کا بار ہے جسکو لڑکا برداشت نہیں کر سکتا۔ نیچر کے عام قوانین کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ایسی چیزیں یا ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو بہت سی خاصیتیں یا کمالات رکھیں یا حاصل کر سکیں وہاں ایسے بھی بہت کم ہوتے ہیں جو کسی کام کے نہ ہوں۔ اور بہت بڑی تعداد بلکہ صرف تھوڑے سے استثنار کے ساتھ تمام قسم کی مخلوقات اور اس کے تمام افراد کسی نہ کسی ایک دو خاصیتوں یا کاموں کے لائق بنائے گئے ہیں اور ہمارے موجودہ سسٹم میں چونکہ نصف سے زاید تعداد اور وہ بھی انسانوں کی تعداد نا قابل ثابت ہوتی ہے تو کہنا چاہئے کہ یہ سسٹم قانون قدرت کے مطابق نہیں اور اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی اور صورت اس کے سوا تجویز کی جائے اور وہی صورت ہے جسکو تلاش کرنا میری اس تحریر کا مدعا ہے لیکن پہلے سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں صرف ایک مضمون کو پڑھانے کی حمایت کرونگا۔ نہیں بلکہ میں کچھ اور کہتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس پر

غور کیا جائیگا۔

مضامین بیشک بہت ہیں اور بیشک ناممکن ہے کہ بہت سے لڑکے ان سب میں مناسب قابلیت حاصل کریں۔ مگر مضامین کو کم کیا جائے تو وہ کونسی چیز ہے جسکو ہم نکال سکتے ہیں۔ کیا کوئی گمان کرسکتا ہے کہ ریاضی کو نکال دیا جائے۔ کیا ایسی چیز جس کی ہر علم میں اور ہر ایک کام میں سو سو طرح کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص خواندہ کہلانے کا مستحق ہے؟ کیا سائنس کو موقوف کیا جائے اور ایسی چیز جسکی وجہ سے دنیا ترقی کی سلطنت پر قابض ہو رہی ہے اس سے اپنے بچوں کو محروم رکھیں۔ اور کیا آمد و رفت تجارت اور پولیٹیکل تعلقات جن کے بغیر آجکل انسان کو صفحۂ ہستی پر رہنا ناممکن ہو گیا ہے۔ یہ کام جغرافیائی معلومات کے بغیر عمدگی سے چل سکتے ہیں۔ یا گزشتہ واقعات سے نتائج نکال لینے کے بغیر آئندہ کے لئے دنیا کے کسی کام کا دستور العمل تیار ہو سکتا ہے تاکہ تاریخ سے بے نیاز ہونے کا دعویٰ ہو سکے۔ ملکی زبان کو حاصل کرنے کی ضرورت ہر وقت محسوس ہوتی ہے اور ابھی تک چونکہ اس طرف کافی توجہ نہیں ہوئی اس لئے اکثر تعلیم یافتہ کسی مضمون کو غیر زبان میں عمدگی سے ادا کرسکتے ہیں۔ مگر اپنی مادری زبان کو بولیں تو بات کو سمجھا نہیں سکتے۔ پس ورنیکیولر زبانوں کو چھوڑنا کیونکر مناسب ہوگا۔ کلاسیکل زبانوں سے علاوہ اُن بیش قیمت جواہرات کو نکال لینے کے جو قدامت کی چادر میں مخفی ہیں اور اُن تاریخی روایات کو دریافت کرنے کے جو قدیم زبانوں کو سمجھے بغیر معلوم نہیں ہوسکتیں۔ بعض زبانوں نے مذہب کو بھی اپنی گود میں لیا ہوا ہے۔ اس لئے پابندان مذہب نہ اُنکی گرفت سے آزاد ہوسکتے ہیں اور نہ ایسی کوشش عقل کے نزدیک جائز ہوگی۔ سب سے

بعد انگریزی کو دیکھتے ہیں تو اگرچہ آرزو دل کی یہ ہے کہ تمام علوم اپنی زبان میں آ جائیں اور ایک غیر زبان کو حاصل کرنے میں جو عمر صرف ہو جاتی ہے اور دل و دماغ تھک جانے کے بعد علمی قابلیت پیدا کرنے کا موقع بہت کم رہ جاتا ہے یہ قباحت دور ہو۔ اور حقیقت میں کبھی کسی قوم نے اس وقت تک علمی ترقی اور کمال حاصل نہیں کیا جب تک علوم کو اپنی زبان میں نہ لے لیا ہو۔ اور اس لحاظ سے انگریزی کی ضرورت حقیقی ضرورتوں میں سے نہیں لیکن جب تک ایسا وقت نہیں آتا اور جب تک ہماری اپنی زبان علم سے محروم ہے اُس وقت تک کون ہے جو انگریزی کو نکالنے کی صلاح دے سکے اور ایسی زبان جو علمی خزانوں سے مالامال ہے اور ملکی ضرورتیں اُس کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ اگر اسے حاصل نہ کیا تو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ پس موجودہ مضامین سے نکالنے کے لائق کوئی بھی نہیں۔ اور نہ صرف یہی بلکہ اور جس قدر علوم زراعت اور مختلف قسم کی صنعتوں اور تجارتوں کے لئے ضروری ہیں ان کے ابتدائی اصول بھی سکول ہی میں شروع ہو جانے چاہئیں اور ان کے بغیر ہمارے سکولوں کی تعلیم دیکھا جاتا ہے کہ نوکری کے سوا انسان کو زندگی کے اور کسی کام کے لائق نہیں بناتی۔ اگرچہ کوئی کام کسی فن میں کمال حاصل کرنے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مگر سکولوں میں مختلف علوم کے ابتدائی اصول پڑھانے سے غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ لڑکے کے میلان طبیعت کا اندازہ ہو سکے اور تھوڑی تھوڑی باتیں ہر ایک قسم کی بتانے پر جس شاخ میں وہ عمدگی سے چل سکے۔ سکول فائنل کے بعد اُس طرف بھیجا جائے اس لئے کاروبار کے متعلق جس قدر علوم بھی ہوں ان سب کو سکول میں جگہ ملنی چاہئے۔

پس ایک طرف یہ قباحت کہ مضامین کی کثرت سے اور ان سب میں

پاس ہونے کی شرط سے پڑھنے والوں کی نصف سے زیادہ تعداد تعلیم چھوڑ کر جاہل رہنا پسند کرتی ہے اور جنکو قدرت نے نالائق نہیں بنایا اور کسی نہ کسی فن کی لیاقت دی ہے۔ اس سسٹم میں وہ نالائق ثابت ہوتے ہیں اور نیز جو اس سفر کو پورا کرتے ہیں۔ وہ بھی بعض مضامین میں کسی قدر مہارت حاصل کر سکتے ہیں اور دیگر مضامین میں تھوڑے نمبر لیکر باوجود نالائق ہونے کے لائق سمجھے جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ ضرورت ہے کہ موجودہ مضامین سے کم کوئی نہ ہو اور اگر ہو سکے تو کچھ اور بڑھا دیا جائے۔ یہ دونوں خیالات ایک دوسرے کے بالکل متناقض ہیں اور میں نے ہمیشہ غور کیا ہے۔ لیکن کوئی تدبیر خیال میں نہیں آئی۔ البتہ ایک اڑتی ہوئی خبر میں نے یہ سنا پائی تھی کہ یورپ کے کسی ملک میں کلاس کی ترقی تمام مضامین کے لحاظ سے نہیں دیجاتی بلکہ خاص خاص مضامین کے لحاظ سے لڑکے جدا جدا کلاسوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ اس بات کو کسی باخبر آدمی سے اور نیز مفصل طور پر نہیں سنا۔ مگر میرے دل نے جو مطلب اس مختصر فقرہ کا سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ چند مضامین پڑھائے جائیں اور امتحان پر لڑکا جس مضمون میں پاس ہو اس مضمون کے لئے وہ آیندہ اوپر کی جماعت میں چلا جائے اور جس مضمون میں فیل ہے اسکو پھر دوسرے سال اسی کلاس میں حاصل کرے اور اس طرح ہر سال امتحان ہوتے پر ممکن ہوگا کہ کوئی لڑکا ایک مضمون کے لحاظ سے تھرڈ مڈل میں ہو۔ دوسرے مضمون کو فسٹ مڈل میں پڑھے اور کسی اور کو ففتھ پرائمری میں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کلاسوں کا اس طرح پر انتظام کرنے میں موجودہ طرز کی نسبت دقت ہوگی یا سہولت۔ لیکن اگر غور کرنے پر یہ سسٹم بہتر نظر آئے تو پھر دقت کیسی بھی ہو اس پر غالب آنے کی کوشش ہونی چاہئے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ

ایک دو مضامین میں قابلیت پیدا کرنے پر لڑکے کو ان خاص مضامین کے لئے ترقی دیجائے تو جس قدر کام اس نے کیا ہے اسی قدر اس کی حوصلہ افزائی بھی ہو جائیگی اور یہ صورت اُن دونوں صورتوں سے بہتر ہوگی کہ دیگر مضامین میں فیل ہونے کے سبب پھر اسی کلاس میں رہے اور جس مضمون کو حاصل کر چکا ہے اس میں بھی پہلے ہی کورس کو دوبارہ دُہرانے کا ناگوار فرض ادا کرے یا فیل شدہ مضامین کی پروا نہ کیجائے اور کلاس میں ترقی پا کر اُن مضامین میں چل نہ سکے۔ ان دونوں صورتوں سے یہ بہت بہتر ہے کہ جو کچھ نہیں سیکھا وہ پیچھے رہکر سیکھے اور جو سیکھ لیا ہو اس میں آگے کو بڑھے۔ اور اگر یہ تبدیل ہو تو وہ دلشکن منظر پیش نہ آئینگے جن میں لڑکے کسی مضمون میں بار بار فیل ہو کر اور تمام مضامین کے لئے اسی کلاس میں رہنے پر مجبور ہو کر تعلیم کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سسٹم کو جاری کیا جائے تو سکول سے فارغ ہونے کی صورت کیا ہوگی۔ کیونکہ ایسی تعلیم سے ممکن ہے کہ لڑکا ایک دو مضامین میں ففتھ ہائی تک پہنچ جائے اور باقی کوئی مضمون تھرڈ مڈل میں پڑھتا ہو اور کوئی ففتھ پرائمری میں اس دقت کو حل کرنے کی صورت میں یہ چاہتا ہوں کہ سکول فائنل پر ہر مضمون کے متعلق تین معیار قائم ہوں۔ ایک ففتھ پرائمری کی قابلیت کا۔ ایک تھرڈ مڈل کی قابلیت کا اور ایک ففتھ ہائی کی قابلیت کا اور سکول فائنل امتحان کا موقع اس کو دیا جائے جو دو ایک مضامین میں ففتھ ہائی کی قابلیت تک پہنچ گیا ہے اور دیگر مضامین کا امتحان اس کی لیاقت کے مطابق ففتھ پرائمری کے معیار کا لیا جائے یا تھرڈ مڈل کا۔ اب جو لڑکا تمام مضامین کو ففتھ ہائی کے سٹینڈرڈ پر پاس کرے اسکو

فرسٹ ڈویژن میں سمجھا جائے یا امتحان کا نام ہی کوئی اور رکھیں۔ مدعا یہ کہ وہ لڑکا آئندہ ہر قسم کی اعلیٰ کالجی تعلیم کا مستحق گردانا جائے۔ اور اگر ایک دو مضامین کو ختم ہائی کے سٹینڈرڈ میں پاس کر کے باقی مضامین کو تھوڑا دال تک پہنچانے میں کامیاب نکلے وہ سیکنڈ ڈویژن میں ہو اور ہر قسم کی اعلیٰ تعلیم کا دروازہ اس کے اوپر نہ کھلے بلکہ جن مضامین میں وہ ختم ہائی تک پہنچ گیا ہے۔ سمجھنا چاہئے کہ صرف انہی مضامین کی طرف اس کی طبیعت کا میلان ہے اور انہی کے مناسب علم کی کسی شاخ میں جانے کا حقدار ہوگا اور اس سے نیچے وہ لڑکے ہوں جو ایک دو میں دسویں جماعت اور باقی مضامین میں صرف ختم پرائمری پاس کر سکے ہیں۔ سارٹیفکیٹ انکو بھی کسی نہ کسی نام سے سکول فائنل کا ملنا چاہئے۔ لیکن یہ لوگ بہت ہی کمزور طبیعت کے ہونگے اور اعلیٰ تعلیم میں نہ چل سکینگے۔ مگر کچھ نہ کچھ قابلیت رکھتے ہیں اس لئے بالکل نالائق بھی نہ ہونگے۔ انکو کالجوں میں نہ جانے دیں مگر دوسرے کاروبار میں نا تعلیم یافتگان کی نسبت بہتر سمجھے جائیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ جس لڑکے نے مثلاً انگلش اور ریاضی کو ختم ہائی تک پڑھا ہوگا۔ وہ معمولی قسم کے کاروبار بھی چلا سکینگے اور نیز اگر کوئی درسگاہیں صنعتی اور زراعتی کھلی ہیں تو ان کی ادنیٰ کلاسوں میں بھی چل سکینگے پس ان کے سارٹیفکیٹ مختلف چھوٹے درجہ کی نوکریوں کے واسطے اور ادنیٰ درجہ کے صنعتی اور تجارتی امتحانوں کے واسطے کافی سمجھے جائیں۔

اس طرح سے قابلیت کے جس درجہ پر کوئی شخص پہنچ سکتا ہے اس کے مناسب حال انعام پا سکیگا اور قدرت نے جو ہر ایک انسان کو کسی نہ کسی ایک کام کیلئے بنایا ہے اور ہر قسم کا کام کرنے کی لیاقت شاذ و نادر ہی کسی شخص میں ودیعت کی ہے تعلیم کا یہ سسٹم بالکل اس کے مطابق ہوگا۔ جس طرح آج کل

تمام مضامین بسال بسال فیل ہو ہو کر پاس نہ پاس حاصل کرنے سے لڑکے
کامیاب سمجھے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف دیکھنے والوں کو بلکہ خود لڑکوں کو بھی
یقین نہیں ہو سکتا کہ وہ کس قسم کے مضامین میں کمال حاصل کر سکتے ہیں اور اس
لئے سائنس کی استعداد رکھنے والا آیندہ قانون پاندشی۔ اور شاعری کا مذاق
رکھنے والا میڈیسن۔ اور زبان کی طرف میلان رکھنے والا انجنیرنگ میں چلا
جاتا ہے اور ناکامی اٹھا کر زندگی برباد کر لیتا ہے۔ صورت زیر بحث میں یہ واقعات
پیش نہ آئینگی۔ اور لڑکا جس قسم کا میلان رکھتا ہوگا اسی قسم کے مضامین میں
بڑھتا چلا جائیگا۔ اور خود بخود روشن ہوتا جائیگا کہ اس کی طبیعت کس فن کے
مناسب ہے۔ اور آیندہ کے لئے وہ جا ہی اس طرف سکیگا جس سے اُسے مناسبت ہے
اور چونکہ تھوڑے نمبروں پر پاس کر دینے کا دستور اس وقت اسی لئے مناسب
سمجھا گیا ہے کہ مضامین بہت ہیں اور ہر مضمون میں پاس ہونا ترقی کے لئے شرط
ہے تو اعلیٰ نمبر بہت کم لڑکے لے سکتے ہیں۔ ہماری اس تجویز میں ترقی کے لئے
سب مضامین میں پاس ہونا شرط نہیں۔ اس لئے یہاں جس مضمون میں کوئی کچھ کر کے
دکھائیگا ترقی پائیگا۔ اور جو شخص کسی سوال کا سر اور کسی کا پیر اور کسی کا بازو پکڑ
کر بالا خانے پر چڑھنا چاہیگا اُسے کہدیا جائیگا کہ جن سیڑھیوں پر اپنی ہمت
سے چڑھ سکتے ہو وہ دبنہ نہیں۔ لیکن جو رستہ جانتے نہیں ہو اس کو آیندہ سال
دیکھ لینا۔ یہاں میلانِ طبیعت کو جانچنا ہے۔ اس لئے ٹھونک بجا کر دیکھنا چاہیے
اور جو لڑکا واقع میں کسی مضمون کا مذاق رکھتا ہوگا اور اچھے نمبر حاصل کرے گا
اسی کو ترقی کا مستحق سمجھنا مناسب ہو۔

اور اگرچہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مضامین کیا ہوں انکی نسبت بحث
نہ کرونگا۔ لیکن سر دست اس قدر گذارش کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ مضامین

جیسا میں امتحان کی ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا اور سکول ہی کے اندر
لڑکوں کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کونسے مضمون میں قابلیت
پیدا کر سکینگے۔ اس لئے انتظام اس کی نسبت بہت زیادہ مضامین کا ہونا
چاہئیے یعنی سکول میں انکی تعلیم کا سامان مہیا ہو اور پھر ایک لڑکے کے لئے معین تعداد
مضامین کی مناسب بھی جائے مقرر کر سکے اگر ضرورت ہو تو انگریزی
ریاضی جیسے کسی ایک آدھ مضمون کو معین کر کے باقی تعداد کا انتخاب لڑکے
کی اپنی مرضی پر چھوڑا جائے۔ مگر جن مضامین کو وہ انتخاب کرے ان میں اختیاری
کسی کو نہ سمجھے۔ کیونکہ اختیاری مضامین کو لڑکے کبھی توجہ سے نہیں
پڑھتے اور جس قدر لیاقت ہو سکتی ہے حاصل نہیں کرتے۔ پس انتخاب ان کی
مرضی سے ہو لیکن جس جس کو انتخاب کریں وہ لازمی قرار پائے۔ اس طرح پر چند
مضامین کو چننے اور ہر ایک میں اپنی قابلیت کے مطابق مختلف درجات
پر پہنچنے کے دستور سے تعلیم کی جو صورت ہو سکتی ہے اس سے جہاں تک میں
غور کرتا ہوں موجودہ سسٹم کے تمام نقص بڑی حد تک دور ہو جائینگے میلان
طبیعت کا اندازہ خوب ہو سکیگا۔ لڑکے فیل ہونے کا رنج اٹھا کر تعلیم چھوڑنے
کی تحریک نہ پائینگے اور تھوڑے نمبر پا کر بعض لوگ جو بغیر کسی قابلیت کے
پاس ہو جاتے ہیں اس نقص کا تدارک بھی ہو سکیگا۔

محمود علی

حُسنِ تربیت

بیوہ مسز ایڈگر جن کا چھوٹا سا جھونپڑا ایک چھوٹے سے گاؤں میں دریا کے کنارے پر تھا۔ ایڈگر نامی ایک غریب زمیندار کی بیوی تھیں۔ ان کی تین لڑکیاں اور دو چھوٹے لڑکے تھے۔ شوہر کی زندگی میں تو خیر جیسے ہو سکا بسر اوقات ہوتی جاتی تھی لیکن مسٹر ایڈگر کے انتقال کے بعد غریب بیوہ کو سخت مصیبت برداشت کرنی پڑی۔ چونکہ ایڈگر قرضدار تھا اس کی تھوڑی سی زمین جو تھی بھی وُہ قرضے میں لگ گئی۔ اب سوائے محنت و مزدوری کے کوئی ذریعہ گذران کا نہ رہا اور ابھی چار بچے زیرِ تعلیم تھے۔ صرف بڑی لڑکی آیرس تعلیم سے فارغ ہو چکی تھی۔ مگر باپ کے انتقال کے بعد مجبوراً دونوں چھوٹی لڑکیوں اَتھیل و فرینکی کو بھی اسکول سے اُٹھا لینا پڑا۔ کیونکہ یہ دونوں لڑکیاں اپنے گاؤں سے باہر کسی بڑے اسکول میں تعلیم پاتی تھی۔ جہاں کا خرچ بہت تھا۔ خوش نصیب تھی آیرس جس نے باپ کی زندگی میں تعلیم حاصل کر لی تھی۔ اب صرف دونوں چھوٹے لڑکے ڈیوڈ و ڈیوس اپنے دیہاتی اسکول میں پڑھتے تھے۔ لڑکیاں اپنی ماں کے ساتھ محنت مزدوری میں مصروف ہو گئیں اور آیرس ان سب کی تعلیم و تربیت اور گھر کی درستی وغیرہ میں لگی۔

آیرس کی عمر ۱۷ سال کی تھی اور اَتھیل اور فرینکی سولہ و چودہ کے درمیان ان دونوں کی صورتیں بھی اچھی تھیں لیکن آیرس بے انتہا خوبصورت تھی اُس گاؤں میں آیرس کے برابر حسین اور کوئی لڑکی نہ تھی۔ اس کے لمبے لمبے سُنہرے بال چمکتی ہُوئی کشادہ پیشانی نیلی نیلی بڑی آنکھیں سُرخ و سفید

نغسلز۔ پتلے پتلے گلابی ہونٹ معلوم ہوتا تھا خدا نے اپنے ہاتھ سے بنائے
ہیں۔ ایرس جس وقت انجیل پڑھا کرتی تھی۔ گاؤں کی دوسری لڑکیاں اس پر
رشک کرتی تھیں۔ ایرس ہر وقت مغموم و پریشان رہتی تھی۔ کیونکہ بہن بھائی
کی تعلیم کا سب سے زیادہ فکر تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی ایسا بڑا کام کروں کہ
جس سے بھائیوں بہنوں کی تعلیم کا خرچ نکل سکے۔ لیکن ممکن نہ تھا۔ تھے سے
گاؤں میں اس کو اپنی مرضی کے موافق کوئی کام نہ ملتا تھا اور اس کی ماں کچھ ایسے
خیالات کی تھیں کہ اپنی لڑکیوں کو گاؤں سے باہر بھیجنا پسند نہ کرتی تھیں۔
ایرس مجبور تھی وہ دن کر کاڑھ کر گھر ہی بیٹھی ہوئی جس قدر ہو سکتا تھا ماں
کی مدد کرتی تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے۔ کوئی رات کے گیارہ بجے ہونگے
گرمی کا موسم تھا مسز ایڈگر مع اپنے بچوں کے جھونپڑے کے آگے سو رہی
تھیں۔ صرف متفکر ایرس جاگ رہی تھیں اس نے پڑھتے پڑھتے کتاب
رکھکر سرہانے کی طرف دیکھا۔ کہ مسز ایڈگر کپڑوں کی گٹھڑی لئے غسلخانے
میں جا رہی ہیں۔ ایرس گھبراہٹ سے اٹھ بیٹھی۔

ایرس۔ اماں جان! میں اس وقت آپ کیا کرنے لگیں میں سمجھ رہی تھی کہ
آپ سو رہی ہیں۔

مسز ایڈگر۔ ہاں بیٹی! لیٹی تو تھی پر خیال آیا کہ بچے اسکول جانے والے
ہیں۔ کپڑے میلے ہیں۔ صبح کو اور کام ہونگے۔

ایرس۔ اماں جان! آپ ہرگز تکلیف نہ کریں۔ کل اتوار ہے بچے اسکول
نہ جائینگے۔ دوسرے یہ کام آپ کا نہیں ہے۔ آپ کے لئے اور بہتیری
مصیبتیں ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے اپنے کام ہمیں خود کرنے چاہئیں۔
دو ہفتے ہوئے میں نے ایک کاپی بنائی ہے اور متفرق کام ہر ایک

کے سپرد کر دیتے ہیں۔ چنانچہ تمام گھر کے کپڑے دھونا اتھیل و فرینکی کے ذمہ
لگے ہیں جو ہفتے میں دو بار دھوئے جائینگے۔ آپ کو معلوم نہیں ان
دو ہفتوں میں تمام کپڑے میں چار بار اتھیل اور فرینکی سے دھلوا چکی ہوں"
مسز ایڈگر۔ "خیر بیٹی! کیا ہوا اس دفعہ میں ہی صاف کر لونگی۔ انہیں اور
بہتیرے کام ہیں"۔

ایرس نے جانا ویسے تو اماں نہ مانیگی۔ خود اٹھی اور کپڑے ہاتھ سے لیکر
کمرے میں سکھا آئی اور کچھ دیر بعد دونوں ماں بیٹیاں سو رہیں۔

سہ پہر کا وقت تھا شاید چار بجے ہونگے حسین ایرس دریا کے کنارے
ٹہل رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کروشیا تھا۔ کچھ بن رہی تھی۔ ابر گھرا ہوا
تھا۔ ایک آدھ بوند بھی پڑ جاتی تھی۔ سامنے سے ایک کشتی کنارے کی
طرف آتی ہوئی نظر پڑی۔ وہ اس طرف دیکھ ہی رہی تھی کہ بارش ہونے لگی
ایرس اپنے کپڑے سمیٹ کر گھر چلنے کو تھی۔ کہ کشتی نہایت تیزی سے کنارے
آلگی۔ پھر تو وہ ذرا اسی خیال سے دیکھنے کو ٹھہر گئی کہ ہمارے گاؤں میں
کون آیا۔ مگر بارش بہت زور سے ہونے لگی۔ کشتی سے ایک نہایت رعب دار
سن رسیدہ شخص اُترا جسکی اعلیٰ حیثیت سے پایا جاتا تھا کہ کوئی رئیس ہوگا
اُس نے کشتی وہیں باندھ دی اور ایرس سے کہا۔

جنٹلمین۔ "اے لڑکی! بارش سخت ہونے لگی ہے۔ میں واپس شہر نہیں
جا سکتا۔ نہ اس گاؤں میں میری کسی سے واقفیت ہے۔ مجھے کوئی
ٹھکانا بتاؤ جہاں بھیگنے سے بچوں۔

ایرس۔ "جناب! میں کونسا ٹھکانا بتا سکتی ہوں۔ ہاں میرا غریب خانہ قریب

یہی ہے وہاں تشریف لے چلئے۔

رئیس۔ بہت اچھا۔ چلو خدا تمہیں خوش رکھے۔

ایرس۔ سامنے کی طرف چلئے وُہ میرا جھونپڑا ہے۔

جنٹلمین۔ مجھے تو معلوم نہیں ہوتا کونسا تمہارا گھر ہے سامنے تو وُہ سبز سا ٹیلہ ہے۔

ایرس۔ جناب وُہی میرا گھر ہے۔ آپ ساتھ ساتھ چلے آویں؟

جنٹلمین وہاں پہنچکر اس چھوٹے سے جھونپڑے کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ کل ۲ کمرے اور ایک غسلخانہ اور چھوٹا سا باورچیخانہ تھا مگر اچھے اچھے محلوں سے زیادہ خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ ایرس نے اپنے معزز مہمان کو بیچ کے کمرے میں بٹھایا اور والدہ کو بلا لائی۔ اُن میں باتیں ہوتی رہیں۔ ایرس نے فوراً چار تیار کی۔ سب نے ملکر چار پی۔

مسز ایڈگر۔ مَیں آپ کی تشریف آوری سے شکرگذار اور خوش ہوں میں اور میرے بچے آپ کی اس خوش خلقی و ذرّہ نوازی کو عرصہ تک یاد رکھینگے

جنٹلمین۔ مَیں بھی آپ سے ملکر بہت خوش ہوا آج کی بارش بہت اچھی ہوئی جس نے اپنے اچھے خاندان سے میرا تعارف کرا دیا۔ آپ کی لڑکیاں آجکل گھر ہی رہتی ہیں۔ یا کچھ کام کرتی ہیں۔

مسز ایڈگر (سرد آہ کھینچکر) میری تینوں لڑکیاں۔ گھر پر ہی ہیں۔ بڑی تو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر چکی ہے۔ مگر چھوٹیوں کو اُن کے والد کے انتقال کے بعد جلدی ہی اسکول سے اُٹھا لینا پڑا۔ اب گھر کا کام کاج ہے اور کچھ نہیں۔

جنٹلمین۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں

آپ انہیں کسی کام میں نہیں لگاتیں۔

مسز ایڈگر میں کس کام میں لگاؤں۔ اس جگہ تو کوئی کام ہے نہیں۔ اور دوسرے شہروں میں نوکری کرنے کے واسطے بھیجنا مجھے منظور نہیں

جنٹلمین۔ بے شک دوسری جگہ بھیجنا عموماً مناسب نہیں ہوتا۔ لیکن کسی شرافت کا کام سمجھیں تو کچھ قباحت نہ ہوگی۔

مسز ایڈگر۔ بیشک اب کوئی عذر نہیں مگر سوچکر جواب دونگی۔ اس کے بعد مسز ایڈگر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئیں۔

چونکہ بارش برابر ہو رہی تھی نہیں خیال تھا کہ ہمارا معزز مہمان نہ جاسکا تو کھانا نہیں کھلانا پڑے گا۔ وہ تو ادھر گئیں اور ان کے مہمان برآمدے میں بیٹھنے لگے جہاں بچے کھیل رہے تھے۔ اور ایرس ایتھل کو ٹوپی پر پھول ٹانکنا بتا رہی تھی۔

جنٹلمین۔ تمہارا مکان چاروں طرف سے سبز ہے اور نیچے سے لیکر چھت تک کسی مالی نے بہت کوشش سے بیلیں چڑھائی ہیں۔

ایرس۔ میں نے تو مالی کو نہیں بلایا۔ خود ہی لگا لیں۔ مجھ کو سبزی بہت پسند ہے۔

جنٹلمین۔ اوہو تمہارا اپنا کام ہے معلوم ہوتا ہے تم نے فن باغبانی میں بھی اچھی مہارت حاصل کی ہے۔ دور سے تو میں یہ سمجھا تھا کہ سبز گھاس سے ڈھکا ہوا کوئی ٹیلہ ہے۔ اس ہنرمندی سے بیلیں چڑھائی ہیں کہ دیوار نظر نہیں پڑتی یکساں سبزی ہے“۔ یہی ذکر تھا کہ باہر سے چھتری لگائے کپڑے سمیٹے۔ ایرس کی کوئی سہیلی آئی۔

ایرس اڈگر۔ اوہو ایسی بارش میں! اچھا آؤ آؤ۔ میں تمہیں اپنے ایک معزز

ہوئیں اور اپنے گھر لے آئیں۔ یہی باتیں ہوتی رہیں اور شام کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ ہیجل نے نہایت عمدگی سے اپنا غریبانہ سادہ مگر خوش ذائقہ کھانا میز پر چنا۔ سب نے ملکر کھانا کھایا۔ اتنے میں بارش بھی بالکل ٹھہر گئی اور صاف شفاف نیلگوں آسمان پر چمکتے دمکتے تارے نکل آئے۔

مسز ایڈگر کا وہ معزز مہمان رخصت ہوا۔ لیکن اس نے مسز ایڈگر سے یہ اقرار کروا لیا کہ ایک ہفتہ تک وہ ایرس کو ملازمت کے لئے تیار کرکے اُن کے گھر بھیجدیں۔ چار روز بعد مسٹر جے ہنری کارنٹ کا ایک منشی آکر ایرس کو اپنے ہمراہ شہر لیگیا۔ مسٹر ہنری شہر کے بڑے معزز رئیس تھے۔ اُنکی بیوی مسز ہنری کارنٹ نے ایک بڑا اونی کام کا کارخانہ کھول رکھا تھا۔ چونکہ کام بہت تھا۔ مسز ہنری بہت مصروف اور گھبرائی ہوئی رہتی تھیں۔ مگر وہ شہر کی کسی عورت کو اپنا مددگار بنانا پسند نہ کرتی تھیں۔ ان کو ایک غریب لڑکی کی تلاش تھی۔ چنانچہ ایرس کا ملنا انہیں بہت غنیمت ہوا۔ چند روز کام دیکھنے کے بعد ایرس اس بڑے کارخانے کی نگرانی کا کام کرنے لگی۔ اور اپنی ماں اور بہنوں بھائیوں کی معقول مدد کے قابل ہوگئی۔ اور آخرکار اپنی اچھی تربیت اور عمدہ عادات کی بدولت مسٹر ہنری کارنٹ کے بھتیجے سے منسوب ہوگئی اور جس گھر میں کارندہ بنکر گئی تھی۔ اسی گھر کی بہو اور مسٹر کارنٹ کی دولت کی وارث بنکر نکلی۔

بنت نذر الباقر

تپ دق سے بچو

لاہور میں ایک جماعت بنام سوسائٹی فور پریوینٹنگ ٹیوبرکلوسس قائم ہے۔ جس سوسائٹی نے یہ بڑا نیک کام کیا ہے کہ مندرجہ ذیل ہدایات مرتبہ ڈاکٹر راج کشور کپور صاحب ایل - ایم - ایس رفاہ عام کے لئے چھپوا کر مفت تقسیم کی ہیں اور مزید اشاعت کے لئے صاحبان اخبار سے خواہش کی ہے کہ وہ اس مضمون کو بنظر نفع عوام اپنے اپنے رسالوں اور اخباروں میں درج کریں۔ ہم بھی اس مضمون کیلئے جگہ نکالتے ہیں۔

تپ دق کیا ہے اور کیونکر ہوتی ہے

تپ دق یا پرانا بخار یا چھوتی روگ ایک پھیپھڑوں کی بیماری ہے جو کم و بیش دنیا کے سب حصوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ ایک نہایت مہلک مرض اور انسان کی جان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دنیا کی کل موتوں کا ایک ساتواں حصہ تپ دق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ مرض ہندوستان میں ترقی کر رہا ہے اور اسکی وجہ سے ہمارے ملک میں ہزارہا بیش قیمت جانیں ہر سال ضائع ہوتی ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے یہ بات کلی طور سے ثابت ہو گئی ہے کہ اگر ہم ٹھیک وقت پر اور ٹھیک طور سے کوشش کریں تو ضرور اس کمبخت بیماری سے بچ سکتے ہیں۔ اور اچھے بھی ہو سکتے ہیں۔

تپ دق کی بیماری پھیپھڑوں میں ایک خاص بدذات زہریلا جرم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ بیماری عموماً لڑکپن یا جوانی میں ہوتی ہے۔ مگر ہر عمر کے شخصوں کو ہو سکتی ہے۔ اس کے اجرام تپ دق کے مریض کے تھوک یا بلغم میں پائے جاتے ہیں۔ بیماری کے آغاز میں انکی تعداد تھوڑی ہوتی ہے مگر جوں جوں بیماری بڑھتی ہے۔ انکی تعداد بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب بیماری آخری درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو مریض کے بلغم میں لکھوکھا اجرام ہر روز خارج ہوتے ہیں۔ جب تھوک یا بلغم سوکھ جاتا ہے تو یہ اجرام گرد میں مل کر ہوا میں اڑتے ہیں اور سانس کے ذریعہ تندرست

آدمیوں کے پھیپھڑوں میں پہنچ کر بیماری کی جڑ ڈالتے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک تندرست آدمی کا جسم ان اجرام کو بڑھنے سے روک سکتا ہے۔ شاید آپ کو یہ علم نہیں کہ یہ حقیقت ہے کہ اکثر لوگوں کے جسم میں یہ اجرام موجود رہتے ہیں۔ مگر اس وجہ سے کہ ان کی صحت و معمولی طاقت قائم ہے۔ یہ جراثیم بڑھنے پاتے اور بیماری کے آثار نمایاں نہیں ہوتے۔ البتہ ایک کمزور جسم میں اور بے احتیاطی نہ کرنے سے یہ اجرام اپنی پرورش بڑھانے میں اور پھیپھڑوں کو مرض میں مبتلا کر کے جان کی ہلاکت کا باعث ہوتے ہیں۔

اس کمبخت بیماری کی یہ عادت ہے کہ عموماً یہ ایسے نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتی ہے اور ہر روز آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ کہ ایک عرصہ تک مریض بعض یہ سوچ نہیں سکتا کہ وہ اس بیماری کا شکار ہو گیا۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیئے کہ ان علامات کو خوب یاد رکھے جو آغاز بیماری میں ظاہر ہوتی ہیں۔ کھانسی کا ہونا جو مہینہ ڈیڑھ مہینہ سے ہو اور معمولی علاج سے نہ جاتی ہو۔ شام کے وقت سستی یا خفیف حرارت۔ بھوک میں کمی۔ دبلا پن۔ بدن میں کمزوری۔ رات کے وقت پسینہ آنا۔ پھیپھڑوں یا منہ کے ذریعہ خون آنا۔ ان اشخاص کو جو دیرینہ کھانسی یا زکام میں مبتلا ہوں یا اپنے وزن یا جسمانی طاقت میں کمی ہوتی دیکھیں یا مندرجہ بالا علامات میں سے اور کوئی علامت اپنے میں پائیں۔ چاہیئے کہ فوراً کسی لائق ڈاکٹر کے پاس جا کر اپنا امتحان کرائیں۔

تپ دق سے کیسے بچ سکتے ہیں

اس بات کو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے کہ جب تک انسان کی معمولی صحت و عام تندرستی قائم رہتی ہے۔ اس وقت تک اس کے جسم کی قدرتی طاقت تپ دق و دیگر بیماریوں کے اجرام کے زہریلے اثر سے جسم کو محفوظ رکھتی ہے۔ وہ اسباب

جو عام صحت کو خراب کرتے ہیں اور جسم کی قدرتی طاقت کو گھٹا کر تپ دق کے اجرام کے لئے زمین تیار کرتے ہیں۔ حسب ذیل ہیں۔

۱- اندھیرے یا نم و غلیظ مکان میں رہنا جہاں صرف ہوا کا گذر نہ ہو یا ایسے مقامات میں رہنا جہاں گرد و غبار زیادہ ہو۔

۲- ناکافی یا ایسی خوراک جس سے جسم کی پرورش اچھی طرح نہ ہو یا کھانے پینے میں بے اعتدالیاں۔

۳- شراب نوشی و دیگر منشیات کا بکثرت استعمال۔

۴- عیاشی و دیگر بری عادات۔ بچپن کی شادی۔

۵- دماغی و جسمانی محنت جس سے تھکاوٹ پیدا ہو۔

۶- تشویش۔ فکر و رنج کی زیادتی۔

جو شخص تپ دق سے بچنا چاہیں۔ اور خاص کر وہ شخص جن کے پھیپھڑے ڈاکٹر نے کمزور بتلائے ہوں۔ انکو لازم ہے کہ مندرجہ بالا بے احتیاطیوں سے پرہیز کریں۔ اور مندرجہ ذیل اصولوں و ہدایتوں کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔

تازہ ہوا اور روشنی صحت کے لئے ویسی ہی ضروری ہیں جیسی کہ صاف و عمدہ غذا۔ بافراط تازہ ہوا۔ تپ دق کو روکتی ہے۔ اور سورج کی روشنی سے تپ دق کے اجرام مرجاتے ہیں۔ گرد و غبار کثیف ہوا۔ نمی۔ غلاظت و روشنی کی کمی تپ دق کے ہمجولی ہیں۔ لہذا

۱- بہت سے آدمیوں کو ایک ہی کمرہ میں نہیں سونا چاہئے۔

۲- سونے کے کمرہ کے کواڑ و کھڑکیاں ہرگز نہ بند کرنا چاہئیں۔ خواہ گرمی کا موسم ہو یا جاڑے کا۔

۳- رہنے کے مکان۔ دوکانیں و کارخانے صاف ستھرے ہونے چاہئیں اور

تپدق کے اجرام بیمار سے تندرست تک کیونکر پہنچتے ہیں
تپدق کے بچولی مفصلہ ذیل سے گریز کرنے سے تم اپنے آپ کو اس بیماری سے بچا سکتے ہو!
بچپن کی شادی

چھاتی بھر کر گہرا سانس لینا ۔
آرام
عمدہ غذا
چاول
سورج کی روشنی وبا افراط تازہ ہوا
احتیاط رکھنے والے مریض کے ساتھ رہنا
نہیں
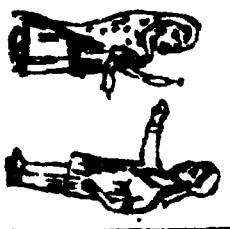
اُن میں ہوا اور دھوپ کا بخوبی گذر ہونا چاہئیے۔

۴۔ جہانتک ممکن ہو ایسے پیشہ سے گریز کرنا چاہئیے جس میں گرد و غبار سے کام پڑتا ہے یا جس میں بند کمروں یا دفتروں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ کمزور پھیپھڑے والوں کے لئے ایسے پیشے معینہ ہیں جن میں کھلی ہوا میں چلنا پھرنا پڑے مثلاً کھیتی باڑی وغیرہ۔

۵۔ سانس ناک کے ذریعہ سے لینا چاہئیے نہ کہ مُنہ کے۔ سانس لمبے گہرے و چھاتی بھر کر لینے چاہئیں۔ تاکہ تازہ ہوا پھیپھڑوں کے ہر گوشہ میں پہنچ جائے۔ رات کو مُنہ ڈھک کر ہرگز نہ سونا چاہئیے۔

۶۔ کسی شخص کو تپ دق کے مریض کے ساتھ ہرگز نہ سونا چاہئیے۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو اُس کے کمرہ میں بھی نہ سونا چاہئیے۔ جس کمرہ میں تپ دق کا بیمار رہ چکا ہو۔ اگر اس میں بود و باش اختیار کرنے سے پہلے کمرہ کے فرش و دیوار کل اسباب کو اجرام مارنے والی (ڈس انفکٹنٹ) دوا سے بخوبی دھلوا لینا چاہئیے۔

۷۔ تپ دق کے مریض کے جھوٹے برتنوں میں ہرگز نہ کھانا پینا چاہئیے۔ ایسے برتنوں کو کھولتے ہوئے پانی میں دھو لینا چاہئیے۔

۸۔ جابجا تھوکنے کی عادت چھوڑ دینا چاہئیے۔ یہ نہایت خراب عادت ہے۔ اسکی وجہ سے بیماری پھیلتی ہے۔

والدین کو چاہئیے کہ کمزور بچوں کا وقتاً فوقتاً کسی ڈاکٹر سے معائنہ کرانے رہیں اور اُن پر تعلیم کا زیادہ بوجھ نہ پڑنے دیں۔

تپ دق کے مریض کو کیا کرنا چاہئیے

ڈاکٹر سے مشورہ — اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تپ دق کا آغاز ہے تو فوراً کسی لائق ڈاکٹر سے مل کر اپنے علاج کی بابت مشورہ لو جس قدر

جلد اس بیماری کی تشخیص ہو جائے اسی قدر اس کے علاج میں آسانی و کامیابی کی امید ہوتی ہے۔ بڑھ کر یہ بیماری لاعلاج ہو جاتی ہے۔ اس لئے علاج میں دیر یا کاہلی کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

اگر تمہارے پھیپھڑے کمزور ہیں یا بیماری شروع ہو گئی ہے تو اشتہاری ادویات پر روپیہ مت ضائع کرو۔ کیونکہ ایسی دوائیوں کے استعمال سے اکثر بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ اگر کسی لائق ڈاکٹر کے زیر علاج رہنا ممکن نہیں تو دل لگا کر مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرو اور یقین مانو کہ اگر تم مذہبی عقیدہ سے ان ہدایات کی پابندی کرو گے تو ضرور تمہیں فائدہ ہوگا۔

بافراط تازہ ہوا دن رات یعنی چوبیسوں گھنٹوں کسی کھلی جگہ میں رہو جہاں صاف و تازہ ہوا بکثرت مل سکے۔ سب سے اچھا تو یہ ہے کہ کسی گاؤں کو چلے جاؤ اور وہاں درختوں کے سایہ میں جھونپڑا ڈال کر اس میں رہو۔ اگر یہ ممکن نہیں تو شہر کے قریب کسی باغ میں جا کر رہو۔ اگر یہ بھی ممکن نہیں تو اپنے مکان کی چھت پر سائبان کے نیچے یا برآمدہ میں رہو۔ صرف بارش و دھوپ کی تیزی کا بچاؤ چاہیے سردی سے مت ڈرو سردی بذات خود کبھی نقصان نہیں دیتی۔ اگر سردی زیادہ ہو تو گرم کپڑے پہنو اور اوڑھنا بچھونا جاری رکھو مگر کھلی ہوا میں ضرور سوؤ بند کمروں میں سونا تپ دق کے مریض کے لئے زہر کا اثر رکھتا ہے۔

مقوی خوراک سادہ زود ہضم و مقوی خوراک پر رہو اور جہاں تک ممکن ہو اپنی غذائیت بڑھاؤ تاکہ جسم کے وزن میں جو کمی ہو گئی ہو وہ پوری ہو جائے۔ اگر شروع میں بھوک کم ہو تو آہستہ آہستہ اپنے کھانے کی مقدار بڑھاتے رہو۔ وزن بڑھانے کے لئے روغنی چیزیں نہایت مفید ہیں مثلاً دودھ مکھن گھی۔ بالائی وغیرہ۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ روغنی

اشیاء کا استعمال کھانسی یا بخار کے لئے مضر ہے۔ تپ دق کے مریض کے لئے دودھ سے بڑھ کر کوئی غذا نہیں ہے۔ بلا اُبلے ہوئے انڈے بھی نہایت زود ہضم و مقوی غذا ہیں اور آسانی سے دودھ میں ملائے جا سکتے ہیں۔ سوائے اُن اشیاء کے جو مرغن یا ثقیل یا نقصان دہ ہیں۔ تپ دق کا مریض اعتدال کے ساتھ سب چیز کھا پی سکتا ہے

جسمانی صفائی

اپنے جسم کو نہایت صاف ستھرا رکھو۔ روزانہ غسل کرو۔ اگر ٹھنڈا پانی برداشت نہیں کر سکتے تو نیم گرم پانی سے نہاؤ اور نہانے کے بعد تولیہ سے رگڑ کر جسم کو خشک کرو تاکہ دوران خون میں ترقی ہو۔ دانت روزمرہ منجن سے صاف کیا کرو۔ کپڑوں کے نیچے ہمیشہ اونی بنیان یا پتلی فلالین کی کرتی پہنے رہو اور اسکو اکثر تبدیل کرتے رہا کرو۔ کپڑے صرف اس قدر پہنو کہ سردی نہ معلوم ہو۔ بہت سے کپڑے لادنا مضر ہے۔

آرام

کسی قسم کی محنت جسمانی یا دماغی مت کرو بلکہ جس قدر آرام لے سکتے ہو لو۔ جس وقت حرارت ہو ہرگز مت چلو پھرو بلکہ بستر پر چپ چاپ لیٹے رہو۔ حرارت میں چلنے پھرنے سے بیماری بڑھتی ہے۔ کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ بعد ضرور آرام کرنا چاہیے۔ رات کو جلد سونا اور صبح کو دیر سے اٹھنا چاہیے

ہمت و حوصلہ

تشویش و تفکرات سے بچو اور ایسا کوئی کام مت کرو جو حد سے زیادہ جوش خوشی یا رنج کا باعث ہو۔ تپ دق کے مریض کے لئے ہر قسم کی بے اعتدالی مضر ہے۔ ہمت ہرگز مت ہارو۔ اپنا حوصلہ قائم رکھو۔ ہر ہفتہ یا ہر مہینہ اپنا وزن کراتے رہو۔ حرارت صبح و شام تھرمامیٹر منہ میں لگا کر دیکھ لیا کرو۔ حرارت کا گھٹنا و وزن کا بڑھنا اس بات کی نشانیاں ہیں کہ تمہیں شفا ہو رہی ہے۔

دوسروں کی حفاظت

تمہارا فرض ہے کہ جہاں تم اپنی شفایابی کی کوشش کرتے ہو۔ وہاں اس بات کا بھی خیال رکھو کہ تمہاری بیماری

کی وجہ سے اوروں کی صحت کو کچھ نقصان نہ پہنچے۔ اسلئے تمہیں چاہیے کہ ادھر اُدھر ہرگز مت تھوکو۔ گھر میں ہمیشہ ایک علیحدہ برتن میں تھوکو جس میں آدھ بوری برادہ ہو اور روزانہ تھوک کو کاغذ کے برادہ میں ملا کر جلا دیا کرو۔ چلتے پھرتے وقت اپنی جیب میں تھوکنے کے لیے ردی لفافہ رکھو۔ اور روزانہ استعمال کے بعد اسکو جلا دیا کرو۔ کھانستے وقت اور چھینکتے وقت ہمیشہ اپنے منہ کے سامنے رومال رکھو۔

تبدیل آب و ہوا اگر تمہیں مقدور ہو تو گرمیوں کے موسم میں کسی ایسے پہاڑ پر چلے جاؤ جہاں بارش زیادہ نہ ہوتی ہو اور جہاں کی آب و ہوا معتدل ہو مثلاً المورہ - دھرم پور وغیرہ۔ پہاڑ کی ہوا نہایت صاف و تازہ ہوتی ہے اور تپ دق کے مریض کے لیے مفید پڑتی ہے۔ مگر پہاڑ پر رہنے کا انتظام معقول اور آسائش دہ ہونا چاہیے تاکہ مریض کو بجائے آرام کے تکلیف نہ پہنچے۔ علاوہ ازیں ایسے مریضوں کو جنکو ہر وقت بخار رہتا ہے یا جنکی بیماری بہت بڑھ گئی ہے کسی حالت میں گھر نہ چھوڑنا چاہیے۔ بہرحال ہر مریض کو چاہیے کہ اگر تبدیل آب و ہوا کا قصد ہے تو کسی ڈاکٹر سے مشورہ لے لے۔ ولایت میں تپ دق کے مریضوں کے لیے ایسے مقامات پر جہاں کی آب و ہوا اچھی ہو خاص ہسپتال یا علاج گاہ بنائے گئے ہیں ہندوستان میں اب تک اس قسم کا صرف ایک علاج گاہ دھرم پور میں ہے۔ ایسے علاج گاہ میں رہنے سے شفا پانے کی امید بہت زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ مریض کی نگہداشت ہر دم ہوتی ہے اور اسکی رہائش و خورد و نوش کا معقول انتظام زیر نگرانی ایک لائق و تجربہ کار ڈاکٹر کے رہتا ہے۔

یاد رکھو کہ تازہ ہوا - مقوی خوراک و جسمانی آرام تپ دق کے اجرام کے مارنے کے لیے سب سے زبردست ہتھیار ہیں۔

تیرے جھگڑے کی بابت عقل و دانش کا یہ فتویٰ ہے — وہ جاہل ہے نرا جاہل - وہ اندھا ہے نرا اندھا

جو تو صانع تو ہم مصنوع ظاہر بھی ہے ثابت بھی — جو تو خالق تو ہم مخلوق - آمنا و صدقنا

اگر تثلیث راضی ہو کہ روح اللہ انساں ہے — تو جو توحید کا مطلب وہی تثلیث کا منشا

یہ ناممکن کہ تین اعداد کا مجموعہ واحد ہے — غلط - بالکل غلط - توحید فی التثلیث کا دعویٰ

کہو تو ہم بھی کہہ دیں تین مل کر ایک ہوتے ہیں — مگر اے کاش یہ دعویٰ کا دلوں کو مطمئن کرنا

نری بت دوستی کے دام آج اٹھتے نکل آئیں — تری توحید کا سکہ جو چل نکلا تو چل نکلا

بہرحالت کوئی معبود برحق ہے تو وہ تو ہے — یہ وہ دعویٰ ہے جس کو کوئی باطل کر نہیں سکتا

یہاں بھی قابلِ عزت وہاں بھی قابلِ عزت — خوشا اس قوم کی تقدیر جس نے تجھ کو پہچانا

تو وہ آزاد آیا اور وہ اس کی صدا آئی

ہو الخالق - ہو المالک - ہو الوالی - ہو المولیٰ

دوست کا خط

اس دارِ بے بقا میں اب کون ہے ہمارا — اس کا ہی آسرا ہے اس کا ہی ہے سہارا

ٹوٹی ہوئی ہے کشتی اور بادباں پھٹا ہے — مواج ہے سمندر اور دور ہے کنارا

سارے عزیز چھوٹے اور دوست آشنا بھی — لے دیکھے رہ گیا ہے ایک اس کا بس سہارا

پروا نہیں ہے چھوٹے مجھ کو اگر جہاں بھر — جس کا ہوا وہ ساتھی وہ کب ہوا ہمارا

دیدار کو عزیزو آنکھیں ترس گئی ہیں — خواب و خیال پر بس باقی ہے اب گذارا

مکتوب کو سنا ہے دیدار ہے وہ آدھا[۵] — آدھا ہی ہے غنیمت حاصل نہ ہو جو سارا

بہرِ خدا تم اس کو دل سے نہ دور کرنا — پردیس میں پڑا ہے مشتاق جو تمہارا

۵ اس کا اشارہ ذیل کے ضرب المثل کی طرف ہے: المکتوب نصف الملاقات

ساری کلفتوں کو کر دور یا الٰہی چشم کرم کا کر دے میری طرف اشارا

ہے وطن میں بیٹھنا تو ہاں ہو ہی بہتر

پر کیا کرے یہ جی بس، ہر تقدیر سے اجارا

مہر شروانی

عروج و زوال اسلام

مومنو یاد تم کو جب تک تھا وہ سبق باہمی اخوت کا

ایک تھا دوسرے کا شیدائی جانتے تھے کہ ہیں سگے بھائی

مومنوں کی تھی جدائی شاق دور ہر قلب سے تھے رنج و نفاق

جان کر اس کو خانۂ دو ظفر جاں لڑاتے تھے دین کی خاطر

تھی نہ پروائے گرمی و سردی خون میں موجزن تھی ہمدردی

کچھ نہ رہتی تھی فکر سود و زیاں سنتے اپنے امیر کا فرماں

شوقِ خانہ زندگی سے سیر پھرتے تھے کرکے سرکشوں کو زیر

کفر کے دل میں نور بنکے رہے آنکھ میں کحلِ طور بنکے رہے

سب جہاں یک بیک ہلا ڈالا غرب سے شرق تک ہلا ڈالا

لوگ چالیس تھے ہزاروں بن چکے تو وہ سب اہل ایمان ہو چکے

ہو گئے دل سے تابع اسلام اہلِ مصر و عراق و روم و شام

کیسے شہر انکے تختگاہ بنے کیا گدا تھے کہ بادشاہ بنے

تھے زمانہ کے شاہوں کے سردار کون تھا جو نہ تھا خراج گزار

ان پہ قرباں تھی عظمت و دولت ان کی لونڈی تھی صنعت و حرفت

آج یورپ کو فخر جس پر ہے ۔ جس کا سارا جہاں ثناگر ہے
فیض پایا یہ اُس نے اِس گھر سے ۔ پُوچھو بیکن سے اور کپلر سے
رہنما اُن کی ہی دلیلیں ہیں ۔ اُن کی چلتی ہوئی سبیلیں ہیں
گھر میں تخمِ نفاق جب بویا ۔ تب وُہ اعزاز ہاتھ سے کھویا
بنے بیگانہ علم و صنعت سے ۔ ہوئی نفرت دلوں کو حرفت سے
کیوں نہ گھٹ جائے قوم کا اقبال ۔ طاقِ نسیاں پہ اب ہے علم و کمال
تھی ترقی فدا امارت پر ۔ ناز تھا ہم کو جب تجارت پر
دل میں اب جز نفاق کچھ بھی نہیں ۔ اُلفت و اتفاق کچھ بھی نہیں
کشتیاں سب بھنور میں آئی ہیں ۔ مفلسی کی گھٹائیں چھائی ہیں
غم ہر اک دل کو انتہا کا ہے ۔ سامنا ہر گھڑی بلا کا ہے
ہوتی تھی فرشِ گل پہ جن کی بسر ۔ آج وہ لوٹتے ہیں کانٹوں پر
ہوگئے خون حوصلے دل میں ۔ رہ گیا داغ ماہِ کامل میں
مونسِ قوم صرف آہ ہوئی ۔ ناؤ منجدھار میں تباہ ہوئی

چرخ پر کہہ رہے ہیں بدر و ہلال
دیکھو اسلام کا عروج و زوال

سید احمد معین الدین جلالی (حیدرآبادی)

موسمِ بہار کا آخری پھول!

تو ہی بس اک رہ گیا ہے او گلِ فصلِ بہار ۔ آہ! غربت میں نہیں کوئی بھی تیرا غمگسار
آہ! اس گلشن میں تیرا ہم نوا کوئی نہیں ۔ تیرا مونس تیرا ہمدم یاں کا کوئی نہیں

تیرے ساتھی اور ہمدم تو عدم کو چل بسے!
گرم جھونکوں سے ہوا کے آہ! سب جھڑ گئے!

ہاں! بتا اے پھول! تیری شام کیونکر آئے؟ ہمدموں کے دردِ فرقت میں گھلا جاتا ہے
کنجِ تنہائی کے شیدائی! تو ہو تنہا مگر گو بظاہر تو شگفتہ ہے یہ ہے تصویرِ یاس!
رحم آتا ہے مجھے حالت پہ تیری بار بار تجھکو نہیں رہنے نہ دونگا یوں شگفتہ زینہار
سو گئے گلشن میں بستر میں ترے ہمدم بے خبر خوابِ راحت میں ہیں سب جو ہیں جہاں سے بے خبر
تو بھی جا مل ساتھیوں سے یہ ترے حق میں بہتر ہے ہاں - تقاضائے محبت اے گلِ تر! ہے یہی
منتشر کر دیتا ہوں میں آہ! تیری پتیاں تیری ہستی کا مٹا دیتا ہوں یوں نام و نشاں

زیرِ قانونِ فنا سب ہیں - یہ سچی بات ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے

اے خدائے عزوجل! میرا بھی انجام ہو میری صبحِ زندگی کی کاش! یوں ہی شام ہو!
چل بسینگے زندگی سے جب اپنے آشنا زندگی کا لطف تنہائی میں کیا آ سکیگا
جبکہ الفت اور محبت ہونگی سرگرمِ سفر زندگی دنیا میں ہوگی کس طرح یارب بسر!
جب یہ حالت ہو تو دنیا سے اٹھا لیجو مجھے تا بصد حسرت کہیں مجھکو نہ یہ کہنا پڑے

"دور جا پہنچے کہاں اے گردشِ ایام تو*
ہاں - دکھا دے اے تصور! پھر وہ صبح و شام تو"

فضل الٰہی قریشی (از دہلی)

قومی غزل

قوم وہ شاد کام ہوتی ہے جس میں تعلیم عام ہوتی ہے

* یہ شعر حضرت اقبال کا ہے۔

شیخ سے قوم کے تنزل پر — بحث اب لاکلام ہوتی ہے
مذہبی پیر کا کلمہ گو یوں ہیں — ہر جگہ صبح و شام ہوتی ہے
بندہ و زاہد میں حرمتِ مے پر — باہمی کاف و لام ہوتی ہے
ہو ویں افراد خود غرض جس کے — قوم وہ پھر غلام ہوتی ہے
در بدر ٹھوکریں وہ کھاتے ہیں — اُن کی تحقیر عام ہوتی ہے
عارِ معرفت سے جس بشر نے کیا — عقل بھی اس کی خام ہوتی ہے
درد ہے دل میں قوم کا جس کے — اس کی عزت مدام ہوتی ہے
رات دن قوم کی بھلائی میں — عمر اس کی تمام ہوتی ہے
کثرتِ رائے جن کی ہوتی ہے — فتح اُن کی مدام ہوتی ہے
تابکے خود نمائی و غفلت — دن ڈھلا اب تو شام ہوتی ہے

کرنا ہے کچھ تو مل کے کر لو آج
ورنہ ترکی تمام ہوتی ہے

احمد رضا خاں (بدایونی)

چند آنسو

(سرور کے غم میں)

کیوں اے سرور! اتنے تھے تم مبتلائے خلد — کیوں ایسے بیقرار ہوئے تھے برائے خلد
ایسی تمہارے سر میں بھری تھی ہوائے خلد — اچھے بنے ہو زینتِ آغوشِ حورِ خلد

جب خواستگار خود تھا تو اے حبیبِ خلد — پھر کیوں رہا زمین پہ ہجراں نصیبِ خلد
جا اپنے آشیانے کو اے عندلیبِ خلد — کرتے ہیں یاد تجھ کو بہت ہی طیورِ خلد

امواج لہراتے دہر ہر دم | چاہت سے ہیں ہمکنار باہم
جگ بھر میں کوئی نہیں ہے خالی | ہر چیز کو ہے لگن کسی کی

قدرت کا ہو، میری جاں! قانون
ہو مجھ سے نفور تو، یہ ہے موزوں؟

اونچے اونچے پہاڑ سارے | ہیں بوسہ ستاں سبھی فلک کے
امواج میں بحر کی ہے کیا جوش | ہیں عشق سے ہو رہی ہم آغوش
اُس گل کو کہیگا کون اچھا | اُلفت نہ گلوں سے جو کرے گا
کس پیار سے نور مہر تاباں | ہوتا ہے زمیں کے رو پہ قرباں
کس شوق سے اے! ماہ شبتاب | ہوتا ہے نثار طلعت آب

اس بوس و کنار سے غرض کیا؟
گر پیار نہ مجھ سے تو کرے گا

(شیلی) غلام محمد طور بی۔ اے۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر

تازہ غزلیں

اے کہ گفتی! رہ و رسم تو نہ این می باید | ما همینیم که هستیم و همین می باید
هان بیا تا کنم از بوسه نشان بر لب تو | شاهدِ خستگی تو ز الفتش دگر می باید
از تو با بوسه و آغوش تسلی نه شوم | شب وصل است و بسامان تر ازین می باید
لطف با قهر درآمیخته در کار است | خنده بر لب و چین بر جبین می باید
عرشیان را بتوان گفت شب وصل از من | کاش بم گوشه از عرش برین می باید
غیر را حرف بدے گفت بخرسندی من | ولی ندانست که این شیوه نه کین می باید
قبلیا کیست؟ که زو داد سخن میخواهی | گر نظیری نبود شیخ حزین می باید

شبلی از بمبئی

قابلِ دید کتابیں

عقائد العزیز

مصنفہ عامل باعمل۔ درویش کامل۔ شاہ عزیز اللہ صاحب صفی پوری کی لاجواب تصنیف ہے جس میں ان تمام عقائد کو جو ایک حنفی المذہب مسلمان کے ہونا چاہئیں بعبارت سلیس بعد آیاتِ قرآنی اور احادیثِ قدسی و اقوالِ پیشوایانِ دین سے استشہاد کر کے ثابت کیا ہے اور کوئی مسئلہ فروعی باقی نہیں چھوڑا۔ طلبا مکتب اور ان لوگوں کے لئے جو عربی علما سے نہیں مل سکتے بیش بہا خزانہ ہے اور قیمت ہے۔ قیمت صرف ۸؍ ۔ حجم ۴۰ صفحہ

نظمِ دلفریب

مصنفہ عقائد العزیز کا عاشقانہ دیوان جو سراسر صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ارباب ذوق و شوق کی قدر دانی کے قابل ہے قیمت ۸؍

ان ہر دو کتابوں کے ملنے کا پتہ محمد علی صاحب انصاری [illegible] ڈاکخانہ

کوہ [illegible] ریاست بھوپال

وصلِ حبیب

یہ خیالی اور حیاتی ناول سید حبیب الحسن وکیل [illegible] ریاست بھوپال کی تازہ تصنیف ہے۔ اس میں حسن و عشق کی بھی تصویریں نہایت خوبی سے دکھلائی گئی ہیں۔ اور راز و نیاز کے ہوبہو فوٹو کمال صفائی سے اتارے گئے ہیں۔ اگر بازارِ عشق کی غیر متوقع کامیابی و شریفانہ ضبط و تحمل کی تاثیر و قوت اگر دیکھنا مقصود ہو۔ تو اس کا مشاہدہ کرو۔ پردہ تعلیم نسواں۔ عقد بیوگان کے حامی ہو۔ اور زن بیوہ دکن اگرچہ حریت کی اصلی تعبیر دریافت کرنا چاہو تو اسکو ضرور مطالعہ کرو۔ طوائفوں کی فطری حرکات [illegible] دوستی کے فرائض۔ بندوبست سی سالہ [illegible] کے تاریخی واقعات کی جستجو ہو۔ تو اس کی سیر کرو۔ زبان کی نفاست۔ بیان کی سلاست ترکیب کی درستی۔ عبارت کی چستی۔ فقرات کی برجستگی۔ مکالمہ کی شوخی۔ تہذیب کی [illegible] افسانوں کی [illegible] مصنف نے کمال کیا ہے کہ دل کو لفظوں میں بھر دیا ہے۔ اس کی خوبی کا اندازہ کہنے سننے سے متعلق نہیں۔ دیکھنے اور سمجھنے کے لائق ہے۔ ملک نے مقبولیتِ عام اور شہرتِ دوام کا سارٹیفکیٹ دے چکا ہے۔ لکھائی چھپائی۔ کاغذ قسم اعلیٰ حجم ۳۲۰ صفحہ قیمت ہر دو حصہ عہ

وصل حبیب و نیز دیگر کتب جات کی فہرست درخواست کرنے پر مفت مل سکتی ہے۔ مہتمم کتبخانہ حبیبیہ ڈاکخانہ کوہ [illegible] ریاست بھوپال سے طلب کیجئے۔ فرمائش کے وقت براہ مہربانی رسالہ ہذا کا حوالہ دیجئے

برادرِ مرحوم کی یادگار

ہماری دونوں ٹوپیاں محسن الملک پیٹنٹ "و" وقار الملک پیٹنٹ" جیسی ہمہ صفت موصوف تھیں۔ ویسی ہی پبلک نے ان کی قدر کی۔ جس کے لئے ہم جس قدر مشکور ہوں تھوڑا ہے۔ مگر اسی وضع کی ذرا کم قیمت ٹوپیوں کی بہت مانگ تھی۔ اس لئے ہم نے مرحوم بھائی مولوی عبد الرشید چشتی بی۔ اے کی یادگار میں جن کے نام پر ہماری دوکان کا نام ہے۔ اور جن کو ترکی ٹوپی نہایت عزیز تھی۔ ایک ٹوپی

"رشید پیٹنٹ"

اٹلی سے خاص آرڈر پر بنوائی ہے چونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ترکی ٹوپی جو اب ہمارا قومی شعار بن چلی ہے۔ ہر مسلمان کے سر پر نظر آئے۔ اس لئے ہم نے اس نئی ٹوپی کی باوجود اس قدر خوش وضع ہونے کے قیمت نہایت تھوڑی رکھی ہے۔

قیمت رشید پیٹنٹ

۱۔ چھوٹی دیوار۔ اوپر سے نیچے تک قریباً برابر۔ استر پکی چمڑہ و ریشم کا پھندنا ع

۲۔ - - - - - - نقلی سیٹن عہ۸

عبد المجید چشتی، عبد الرشید برادرز جنرل مرچنٹ۔ انارکلی لاہور

پانچ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح بن گئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی گنا جاتا تھا
آج ان سطروں کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد کی وجہ سے دس ہزار روپیہ ماہوار نہیں بلکہ دو لاکھ کی جائیداد کا
بلا شرکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ آج سے چند سال ہوئے کہ میں
نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے
جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار
بن گیا ہے۔ ملٹری کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۴۳ روپے تشخیص کرتے ہیں۔ اس سے
صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اس کی اس قدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت
داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور مشر طبیہ تجارت سے
محروم رہا ہے۔ سنئے روح کیا چیز ہے روح حیات ہی وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ کرنے
پینے سے انسان کمزور سے قہرمان بن جاتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب ڈاکٹر بی راٹن صاحب
بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ظلہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران
اور رؤسا نے روح حیات کو طاقت میں بے بدل بتایا ہے روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک
پیدا کر کے ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو اپنی بجلی کی
آگ سے چاک اور چوبند کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ اگر حرارت و اثر
تلوار بھی ماریں تو بھی چیٹ ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین لائق
اور نامور ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لیکچروں معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سارٹیفکیٹوں اور
موجودہ امتیاز عزت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کر رہی ہے اور مانگ ۸۸۴۳ روپے روح حیات
کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو نتیجہ نہ نکالے کہ روح حیات اس وقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی
دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کی بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت
عامل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھے ہیں
روح حیات تریاق کامل نہ صرف دوا ہے۔ بلکہ اعصاب کی ایک طاقت افزا غذا ہے جو دو یوم میں ہی
قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتی ہے۔ چہرے میں رونق آبداری حاصل ہوتی ہے۔ استعمال سے آپ ایسی
دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائیں گے جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی ۸ع

حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کیمیاگر پروپرائٹر شفاخانہ عالم لاہور سے طلب کرو۔

شائقینِ کتب

(ملاحظہ فرمائیں)

سنگلاخ کتابوں کا حل مندرجہ ذیل کتابیں کوئی حل نہ کر سکا اور نہ کوئی انشاء اللہ حل کر سکتا ہے۔ یعنی پتھروں کو پانی کر کے بہا دیا۔ سمجھنا شرط ہے۔

حل قصائد خاقانی مندرجہ کورس منشی فاضل ایم اے حصہ اول ۱۲ اور حصہ دوم زیر طبع ہے بے نظیر اس لئے کہ ہم کو چوروں کی پناہ نہیں جو گھات بن لگے دیتے ہیں۔ اگر کوئی مرد میدان ہے تو دوسرا حصہ حل کرے مشکل قصائد میں نے حل کر دیئے آسان باقی ہیں۔

حل کلیات اردو مرزا غالب مرحوم ... ۱۰

حل قصائد خاقانی۔ کورس منشی عالم ... ۹

حل نکات۔ مولانا مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ در تصوف۔ ۱۲

شوکت النجدیہ۔ میری کلیات جو قصائد و غزلیات و رباعیات وسلام اور اردو اور بھاشا وغیرہ کی نظم سے صحیح اور شاعری کی دنیا جس کی منتظر ہے پیشگی قیمت آرہی ہے زیر طبع ہے۔ پیشگی عہ اور بعد طبع ... ۴

اعلان عام جو صاحب کامل شاعر بننا چاہیں۔ میری جانب رجوع لائیں جیسا کلام ہوگا اسی درجے کی اصلاح ہوگی۔ کلام بھیج کر آزمائیں۔

جو صاحب کسی کتاب اردو۔ فارسی۔ عربی میں اصلاح لینا چاہیں فیس کے بارہ میں مراسلت کریں۔ اکثر کتابوں کا لٹریچر بلکہ املا تک صحیح نہیں ہوتا۔ غلطیوں کو مجدد ہی خوب جانتا ہے۔

مجدد السنۃ مشرقیہ احمد حسن شوکت میرٹھ

صبح زندگی

(چھپکر تیار ہے)

شائقین کو مژدہ ہو کہ یہ کتاب جس کا انہیں ایک عرصہ سے انتظار تھا اور جسکی فرمائشیں دفتر مخزن میں پہنچنے سے بہت پیشتر ہی موصول ہو چکی ہیں۔ اب شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوشخط قلم دو قسم کے کاغذ پر چھپی ہے۔ قسم اول کے کاغذ کی چونکہ مانگ زیادہ ہے اسلئے قسم اول کی کتابیں جلد منگوانی چاہئیں۔ یہ کتاب دو سو چھتیس صفحہ کی ہے اور اس میں ایک لڑکی کے چار برس کی عمر سے لیکر شادی کے وقت تک کے وہ تمام حالات جو تربیت سے متعلق ہیں قصہ کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور اس طرح کنواری لڑکیوں کو جس جس عمر میں جن جن باتوں کے معلوم ہونیکی ضرورت ہے نہایت خوبی سے بتائی گئی ہیں۔ مذہب کی وقعت۔ خدا کی عظمت۔ گفتار۔ کردار۔ اطوار۔ عادات کے متعلق طرز بیان ایسا موثر ہے کہ ضرور دلنشین ہوتا ہے! خانہ داری کی تفصیل میں انتظام صفائی ستھرائی کے علاوہ سینے پرونے چھاپنے۔ کاڑھنے کی بہت سی باتیں تصریح سے لکھی گئی ہیں سینے اور کاڑھنے کی ترکیب کے ساتھ نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ عورتوں کی زندگی پر استانی کا وعظ اس کتاب کی روح رواں ہے! وداع کا سماں بیوی کا بیٹی کو رخصت کرنا اور آخری نصیحتیں لکھنے سے تعلق رکھتی ہیں! زبان کے متعلق بیان کرنیکی ضرورت نہیں۔ کیونکہ کتاب ایک مستند اہل زبان یعنی منازل السائرہ کے مشہور مصنف مولوی محمد عبدالراشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ باعتبار واقعات یہ دعویٰ ہے کہ اس کی نظیر اس قسم کی کتاب زنانہ لٹریچر میں موجود نہیں۔ قیمت قسم اول عـ قسم دوم عہ علاوہ محصولڈاک۔

درخواستیں بنام مینیجر مخزن۔ لاہور۔ آنی چاہیئے

طبِ یونانی کی بقا

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی

خدمات تمام دنیا میں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطرافِ ہند میں انکا نام ہم
لے سب کی نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی
اگر کچھ امیدیں ہیں تو وہ انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب حاذق الملک [illegible]
کے ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات
لوگ کہ اس قسم بات ان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ انکے
احساسِ فرض کا ثبوت اور انکی مستقل و خاموش کوششوں کا نتیجہ ہے گو اس کی ظاہری حیثیت ایک
تجارتی حیثیت ہے لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں طب
یونانی کی بقا کا سامان ہے شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے جس غرض سے یہ
قائم ہوا ہے اس کے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے
اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکی طرز شناخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا
مقصد ہے جسے یہ پورا کر رہا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لیے عام
طور پر اطبا بتاتے ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ اعلیٰ نسخے جو صرف روسا و امرا کو میسر آتے تھے۔ بالکل
اصل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ و زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے
نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص [illegible] بھی اس دواخانہ
کو عطا فرمائی ہیں صحت و تندرستی ایک [illegible] ہے اور ہر ایک انسانی جسم اس [illegible]
تمام ارباب وطن کو ان اعلیٰ اور تجربہ [illegible] ادویات سے جو اس دواخانہ [illegible]

خط و کتابت کا پتہ منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی [illegible]

پیغام درد
مطلع فجر
فسانۂ غم
ترانۂ حمد
(از حیدرآباد دکن)
9
16
38
56

مخزن

خاقانی شروانی اور عُرفی تبریزی کے کلام کی تنقید

حکیم خاقانی جامع علوم و فنون اور شاعری میں امامِ وقت تھا اُسکا کلام تمام شعراء سے ممتاز اور نہایت مربوط و مضبوط اور صنائع و بدائع۔ نزاکت و متانت۔ بلاغت و رزانت سے معمور ہے۔ اشعار میں کثرت سے تلمیحات ہیں اسی لئے سنگلاخ اور ادق گنا جاتا ہے۔ بیشک الفاظ اور ترکیبیں اکثر غیر مانوس و اجنبی ہیں مگر وہ سلکِ نظم میں چنیوں کی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ فہم سلیم پر ناگوار نہیں گذرتیں جیسی کسی معجون کے قوام میں سنگ یشب اور زمرد وغیرہ معدنیات حل کی ہوئیں۔ اور یہ بہت بڑی استادی ہے۔ منجملہ دوسری صنائع کے تجنیس کی صنعت زیادہ ہے۔ اور سجعوں کا تقابل عجیب و غریب ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مرغ از شبستان حرم میوہ ز بستانِ ارم   گردوں ز پستانِ کرم شیرِ مصفا ریختہ

یہ ایک مدحیہ قصیدے کی تشبیب کا شعر ہے۔ دُہرا دُہرا تقابل ہے یعنی شبستان بُستان۔ پستان اور پھر حرم۔ ارم۔ کرم۔ واہ مبدأ فیاض سے یہ حصہ صرف خاقانی کو ملا ہے۔ ایک اخلاقی شعر میں صنعتِ تجنیس کا تراکم ملاحظہ فرمائیے ؎

چو زر کنوں گم شد زاں گم شدہ کمتر گو   زریں ترہ کو برخوان رو کم ترہ کو با نان

قاعدہ ہے کہ اخلاقی کلام سیدھا سادا ہوتا ہے اور رنگ آمیزی اور صناعت سے مُبرّا۔

مرکبانِ شاہ را چوں جوزہر بربستہ دم گھنگی از ہر جوزہر جوزائے ازہر ساختند

حل۔ جوزہر آسمان پر ایک روشن شکل ہے جسکی دم پر دو ستارے ہیں مراد سونیکی لڑیاں ہیں جو زین کے ساتھ گھوڑے کی دم پر لگی ہوتی ہیں یعنی بادشاہ کے گھوڑوں کی دموں پر جوزہر ستارے کی طرح سونے کی لڑیں بندھی ہیں۔ اے مخاطب تو انکو دیکھکر کہیگا کہ ان دونوں لڑوں سے ایک روشن برج جوزا بنایا ہے۔ ازہر۔ جوزہر۔ جوزائے ازہر۔ وللہ درہ ۔ سبحان اللہ۔

ہم نے جانکاہی سے خاقانی کے قصائد پروفیسروں کی فرمائش پر حل کئے ایک صاحب امرتسر سے اُٹھے اور اپنے مال پر یا حسینؑ پڑھکر ہمارا مال غصب کرکے اپنے نام سے حل مشتہر کیا۔ ایک اور نوجوان میرٹھ سے اٹھا اور یونیورسٹی الہ آباد کے کورس بی۔ اے کے قصاید خاقانی جو ہم نے حل کئے تھے اپنے نام سے چھاپ دیے۔ دہلی کالج کے ایک صاحب نے انگریزی میں ہمارے حل کا ترجمہ اپنے نام سے چھاپ دیا۔ ان قومی چوروں کو نہ شرم ہے نہ لحاظ ہے۔ یہ فوجداری اور دیوانی کے مواخذے سے بچ نہیں سکتے۔ کھایا پیا اُگلنا پڑیگا۔ خاقانی کے کسی دوسرے غیر حل شدہ قصائد کے اشعار جب عدالت میں پیش کئے جائینگے کہ انکا مطلب بھی بتاؤ تو یقیناً انکی روح سلب ہوجائیگی ہم نے قصائد خاقانی کورس منشی فاضل کا حصہ اول بھی حل کردیا ہے اور دوسرا حصہ اسی لئے چھوڑ دیا ہے کہ مذکورہ بالا صاحبوں میں سے کوئی مرد میدان بنکر حل کرے اگر انکو کچھ بھی غیرت ہے تو حل کرکے دکھائینگے ورنہ ہم تو دوسرا حصہ بھی جلد حل کرنے والے ہیں۔

تہنیت عید کے ایک قصیدے میں لکھتا ہے ؎

ہات زنل زنل حلق خامان اکر باخیر لعل قلقل حلق صراحی را برابر ساختند

معنی غل طرق و طمطراق۔ حلق نشانہ‌ہائے زاہداں زد۔ ریائی جو محض نمود و شکم پرستی کی خاطر حق کے نعرے اور حی علیٰ خیر العمل کی اذان بلند کرتے ہیں۔

حل اے مطرب طرق و زنجیر والے اور مکار زاہدوں کا گلا گھونٹ۔ جنہوں نے اپنے نعرۂ حق و حی علیٰ خیر العمل کو حلق صراحی کے قلقل کے برابر کر دیا ہے۔ یعنی صراحی کی قلقل ان کے ریائی ذکر اللہ سے بہتر ہے یا یہ معنی کہ انکے ریائی ذکر اور صراحی کی قلقل میں کچھ فرق نہیں کیونکہ ریائی عبادت اور ارتکاب مے نوشی دونوں حرام ہیں ؎

قلقل آمد قل قل اے بلبل نفس   تازہ کن قول بلے مرغان قلندر ساختند

بلبل قلقل (آواز صراحی) اور قل قل (صیغہ امر کا تکرار یعنی کہہ کہہ) پھر قول و قلند۔ دونوں مصرعوں میں تجنیس کے جواہر پاروں کی پچی کاری ہوئی ہے۔

حل۔ صراحی بول رہی ہے اے بلبل نفس (صوفی) تو بھی بول اور جو قول (عہد) مرغان قلندر یعنی مومنوں نے روز میثاق اَلَستُ بِرَبِّکُم کے جواب میں کہا تھا یعنی قَالُوا بَلیٰ اُس کو تازہ کر۔

رونقی تبریزی بھی اچھا شاعر ہے ذہین ہے۔ شوخ طبع ہے اس کا کلام بہت شگفتہ اور دلکش ہے۔ عاشقانہ رنگ زیادہ ہے۔ حکیمانہ اور فلسفیانہ طرز بھی ہے۔ علوم و فنون کے مسائل اور مصطلحات سے بھی باخبر ہے منطق۔ فلسفہ طبیعیات و فلکیات سے بھی واقف ہے علم کلام سے بھی ماہر ہے۔ مذہب امامیہ رکھتا تھا مگر قاآنی کی طرح متعصب نہیں اس کے کلام میں نہیں۔ صرف بعض اشعار میں ایہام کی طرح ہے۔ اشعار میں اہل فلسفہ کی مصطلحات نہایت خوبی اور جدت سے باندھتا ہے مثلاً امیر المومنین علی علیہ السلام کی منقبت میں قطعہ لکھتا ہے ؎

آں مایۂ دشمنی کہ بعلم است جہل را   اے کعبۂ وجود تو دار الامانِ علم

تقدیرِ ہستیت نشدے گر ضمانِ علم   اندر ضمیرِ جوہرِ اول شدے تباہ

جوہر اول او عقل اول اور جوہر کل اور روح امین اور روح قدس جبریل علیہ السلام
کو فلاسفہ کا عقیدہ ہے کہ الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد یعنی ایک سے ایک
ہی پیدا ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے صرف عقل اول کو پیدا کیا۔ اس نے عقل ثانی
کو اور عقل ثانی نے عقل ثالث کو۔ علیٰ ہذا دس عقلیں ہو گئیں۔ پھر دنیا کی پیدائش
کا سلسلہ چلا اور بجانے شئی نے گننا چھوڑ دیا۔ ماحصل یہ ہے کہ عقول و فہوم اور فنون
و علوم کا سرچشمہ اور مبدا جوہر اول ہے۔ پس عرفی کہتا ہے کہ جہل کو علم کے ساتھ جس قدر
دشمنی ہے ظاہر ہے۔ پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ جملہ مستانفہ ہے۔ یعنی اے علیؓ تیرا کعبۂ
وجود علم کا دار الامان ہے ازل میں تیری ہستی علم کی حفاظت کی ضامن ہو گئی
تھی۔ یعنی علمِ الٰہی میں یہ بات ٹھہر چکی تھی کہ علی علم کے برقرار رہنے کا ضامن ہے ورنہ
جہل جوہر اول کے دل میں بھی علم کو کھا جاتا اور تباہ کر دیتا۔ یہ قطعہ گویا انا
مدینۃ العلم و علیؓ بابہا الحدیث کی تفسیر ہے۔

عرفی کے کلام میں ہر قسم کے مضامین ہیں مگر عاشقانہ عنصر بڑھا ہوا ہے۔
قصائد میں بھی تغزل کا رنگ ہے اور صنائع بدائع اور تلازم شاذ و نادر ہے وہ
بھی ارادۃً نہیں۔ مثلاً نعت میں لکھتا ہے ؎

گر گزیند سرمہ جز خاکِ درش مژگانِ باز   چنگل اندازد بزاغِ دیدۂ بینائے من

باز اور زاغ کا تلازم اتفاقی وارد ہے نہ کہ آورد۔ یہاں زاغ سے مراد خال
سویدائے چشم ہے۔

عرفی اور خاقانی کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاقانی
تو ایک سیمرغ ہے جو قافِ سخن پر پرواز کر رہا ہے اور عرفی ایک بلبل ہے جو گلہائے
کلام پر نغمہ سنج ہے

عرفی نے خاقانی کے بعض قصائد کا جواب دیا اور بالمقابل قوافی باندھے ہیں مگر یہ کہنا بیجا نہیں کہ صرف قافیہ پیمائی کی ہے۔ ہم ذیل میں تنقید کرتے ہیں۔ خاقانی کو ایک عیسائی حاکم نے قید کر دیا تھا حالتِ قید میں یہ نعتیہ قصیدہ لکھا ہے ؎

صبحدم چوں کلہ بندد آہ دود آسای من　　چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیمای من

لغت۔ کلہ۔ چلہ۔ شب پیما۔ بیقراری شب کا گذارنے والا۔

حل۔ چلہ نشین لوگ چاروں طرف پردہ باندھ کر چلے میں بیٹھتے ہیں۔ آہ کے دھوئیں کو جو بلند ہوتا ہے چلے کا پردہ قرار دیا ہے اور شفق کی طرح آنکھ کا خون میں بیٹھنا اشک خون کا بہانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں شب بھر بیچین رہا ہوں۔ صبح کو آہ بھرتا ہوں اور روتا ہوں۔ آہ کا دھواں چلہ ہے اور آنکھ چلہ نشین ہے۔ شفق بھی صبح کے وقت نمودار ہوتی ہے۔ عرفی نے اسی مطلع سے اپنے قصیدے کا مطلع تراشا ہے ؎

صبحدم چوں در دمد دل سوز شیون ہای من　　آسماں صحنِ قیامت گردد از غوغای من

خاقانی نے ایک حالت کی نیچرل تصویر دکھائی ہے اس کے مقابلہ میں عرفی نے ایک سبک مضمون خلافِ واقعہ لکھا ہے جس میں نرا غلو اور اغراق ہے۔ اگر مصرعہ اولیٰ یوں ہوتا ؎　صبحدم چوں در دمد صور شیون ہای من

تو علاوہ ذہری بلکہ تہری صنعتِ تجنیس پیدا ہونے کے دونوں مصرعوں میں جو فاعل کی مغایرت ہے جاتی رہتی۔ کیا معنی کہ پہلے مصرعہ میں دمد کا فاعل دل ہے اور دوسرے مصرعہ میں چیخنے چلانے کا فاعل خود عرفی ہے اور غوغائے او غوغای من کی جگہ ٹھیک بیٹھتا ہے۔ دم سانس کے معنی میں بھی مستعمل ہے اور پھونک کے معنی میں بھی۔ دونوں معنی ٹھیک ہوتے ہیں یعنی خود میرا دم صور شیون ہائے پھونکے یا صور شیون ہا اپنا دم پھونکے۔ پہلی صورت میں دم دمد کا فاعل ہوگا

- -

- - - - اور دوسری صورت میں مفعول اور اس کا فاعل ہو رہا ہے شیون زا - مخزن کے ناظرین بڑے بڑے پایہ کے لوگ ہیں یہ تنقید خوب سمجھ گئے ہونگے - خاقانی ؎

مجلس غم ساختہ است و من چو بید سوختہ   تا بمن راوق کند مژگان مے پالائے من

لغت بید کے کوئلے سے شراب صاف کرتے ہیں - راوق کھینچی ہوئی منقط شراب -

حل - غم کی مجلس تیار ہے اور چونکہ مجلس کے لئے شراب کی ضرورت ہے - اس لئے میں جلکر بید کا کوئلہ ہو گیا ہوں - اشک خون شراب ہے اور پلکیں بید کے کوئلے سے اسکو صاف کرنے والی ہیں - غم کی مجلس میں تو رونا پیٹنا ہی ہوتا ہے مطلب صرف اس قدر ہے کہ میں آتش غم سے جل رہا ہوں اور اشک خون رو رہا ہوں - مگر کس خوبی سے مجلس اور اس کا ساز عیش مہیا کیا ہے - یعنی ستمزدوں کا عیش تو جلنا اور رونا ہی ہے - عرفی نے قلم پر قط لگا کر اور بہت زور دیکر اسی قافیہ میں مضمون نکالا ہے مضمون اچھا ہے اور چسپاں ہے مگر خاقانی کا رنگ کہاں وہی خلاف واقع غلو ہے ؎

زاں ملائکہ چو مگس گرد منست ام از ہر سو کہ ہست   چشمۂ لذت کشا ہر موئے غم بالائے من

پہلے مصرعہ میں (کہ ہست) اور دوسرے مصرعہ میں اس کا اسم اور خبر - یہ ترکیب کھٹکتی ہے - خاقانی کے کلام میں ایسی ژولیدہ ترکیب ہرگز نہیں - خاقانی ؎

جیب من بر صدرۂ خارا عنابی شد ز اشک   کوہ خارا زیر عطف دامن خارائے من

لغت - صدرہ صدری وغیرہ لباس جو سینے پر ہو کوہ خارا سنگ سخت کا پہاڑ دامن خارا پارچہ خارا کے لباس کا دامن -

حل - میری جیب جو خارا کی صدری پر ہے اشک خون سے عنابی ہو گئی ہے اور کوہ خارا (پہاڑی) میرے دامن خارا کے عطف (پیٹ) کے نیچے ہے یعنی میرا نے

بیڑی پر دامن ڈال رکھی ہو۔ جو سنگین ہونے میں کوہ خارا (کھردرے پتھر کا پہاڑ)
ہو عنابی مشدد کر مضعف باندھا ہو۔ خاقانی اپنے رواں دواں کلام میں
ایسی ذرا گنجائشوں کا لحاظ بہت کم کرتا ہو اُس کا خیال زیادہ تر مضامین کی
خوبی اور بلندی پر رہتا ہے۔ پھر صدری کا اشک خون سے عنابی ہو جانا
ہ نی تقاضا کر جیب کا۔ جیب حشو ہو۔ بات یہ ہو کہ جیب کا تقابل دامن سے
ہو اور صدرہ خارا کو خارا میں تجنیس ہو۔ یعنی میری صدری کی جیب کا یہ حال
ہو اور دامن کا یہ حال۔ صدری اشکِ خون سے سُرخ ہو اور دامن کے نیچے
پہاڑ ہے۔ دونوں مصرعوں میں اِس کے سوا کوئی لگاؤ نہیں۔ عُرفی ؎

دامنم تر کرد طوفانے کہ در معنی یکیست موجۂ دریا و موج حلۂ خارائے من

حل۔ میرا دامن ایسے طوفان نے تر کیا ہوا ہو (تر دامن گنہگار اور طوفان سے
مراد۔ گناہوں کا طوفان ہو) کہ معنی میں دریا کی موج اور میرے لباس کی
موج جو خارا کپڑے سے بنا ہوا ہے اور تر ہے۔ ایک ہی ہے۔ یعنی میں اب
تر دامن ہوں کہ میرے دریائے دامن کی موج اوروں کو بھی ڈبو دیے۔ مضمون
بہت بلند سوجھا تھا۔ مگر بند ہو نہ سکا (موج حلۂ خارا) کی ترکیب بے تکی ہو
پھر موجہ اور موج۔ دونوں جگہ یا تو موج ہوتا یا موجہ ؎

موج دریا بار و موج دامن خارائے من

موج کا دو جگہ آنا یہاں موزون ہی۔ ناگوار نہیں۔ گنہگار کو تر دامن کہتے
ہیں نہ کہ تر حلہ یا تر لباس۔ خاقانی کے شعر میں دو جگہ خارا آیا ہے مگر معنی
جُدا جُدا ہیں۔ عرفی کے شعر میں ایک ہی معنی ہیں +

مجدد السنۂ مشرقیہ احمد حسن شوکت
(میرٹھ)

ہندو مسلمانوں کا اتفاق

جنوری گذشتہ میں اتحادی کانفرنس کے انعقاد کے وقت ہم نے یہ مضمون لکھا تھا لیکن بوجوہ اس کے شائع ہونے کی نوبت ابتک نہیں آئی۔ امید ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت ملک کے اہل الرائے حضرات کو اس پر غور کامل فرمانے کی طرف متوجہ کرے گی۔

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا مسئلہ ہمارے ملک میں کئی سال سے زیر بحث ہے بعض محبان وطن بہت سرگرمی کے ساتھ اس امر میں کوشاں ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی دو قوموں ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات رفع ہوں اور ان میں اتفاق و یکجہتی پیدا ہو۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی کوئی مجلس اور کوئی صحبت ایسی نہیں ہوتی جس میں یہ اہم مسئلہ نہ چھیڑا جاتا ہو۔ چنانچہ سر ولیم وڈربرن جب انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہونے کے لئے ہندوستان کا عزم کر کے اپنے وطن سے روانہ ہونے لگے اور انگلستان میں ان کی ایک بڑی دعوت کی گئی جس میں ہندوستان کے چند سربرآوردہ افراد بھی شریک تھے تو اس موقع پر بھی یہی بحث چھڑ گئی اور اس بات پر غور ہونے لگا کہ کن تدابیر سے اس عمیق خندق کو پاٹا جا سکتا ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بے طرح حائل ہو گئی ہے۔ بہت کچھ غور و خوض کے بعد آخرکار ہز ہائی نس سر آغا خاں۔ سر ولیم وڈربرن۔ رائٹ آنربل مسٹر سید امیر علی اور مسٹر فیروز شاہ مہتہ کی تحریک پر باتفاق رائے یہ طے پایا کہ ہندوستان میں ایک کانفرنس اس غرض سے منعقد کی جائے جو اس پورٹ گری کے ہندو اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات رفع کرنے کی تدابیر اختیار کر کے ان میں صلح و آشتی پیدا کرے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس مبارک تحریک کا نہایت گرمجوشی کے

ساتھ غیر منعقد کیا گیا اور ۱۹۱۱ء کی پہلی جنوری کو بمقام الہ آباد اس اتحادی کانفرنس
کا پہلا اجلاس کامیابی کے ساتھ ہوا۔ اس اتحادی کانفرنس نے اس سال جو کارروائی
کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک ایسی کمیٹی قائم کر دی جس میں ہر دو اقوام کے
منتخب منتخب اور ذی اثر بزرگ شامل ہیں اور جن کا یہ فرض قرار پایا ہے کہ باہمی
بغض و عناد کے اسباب دریافت کر کے ان کے دفعیہ کی مناسب صورتیں اختیار کریں[۱]۔
اس میں شک نہیں کہ اب تک جو کوششیں اس بارہ میں ہوئی تھیں۔ ان میں
ایسا مستحکم طرز عمل نہیں اختیار کیا گیا تھا اور اب اس طریقہ کارروائی سے امید ہے کہ
کامیابی حاصل ہو گی۔ ہم یہ عرض کرنے کی معافی چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اصلاح
کی جو تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں وہ ہمیشہ سطحی اثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ اس لئے
ان سے کبھی خاطر خواہ فائدہ نہیں حاصل ہوتا اور بعض دفعہ اگر ہوتا بھی ہے تو اتنا
اثر ہوتا ہے کسی بات کی اصلاح نہ تو وعظ و لکچر سے ہوتی ہے اور نہ تنہا
اخباروں یا رسالوں کے مضامین سے۔ بلکہ اصلاح اسی وقت ہوتی ہے جبکہ
خرابی کو دور کرنے کی کوشش کر کے اصل بنیاد کو درست کیا جائے۔ کسی بات
کا خیال کرنے اور اس پر عمل کرنے میں بہت بڑا فرق ہے۔ وعظ و لکچر۔ کتابیں
اور رسالے اس میں شک نہیں اصلاح کا خیال پیدا کر دیتے ہیں مگر اس خیال
کو عملی صورت میں لانا ان کے دائرہ اثر سے کسی قدر باہر ہے۔ ایسی صورت
میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرانے کے لئے
صرف چند رزولیوشنوں کا پاس کر دینا یا اتحاد و اتفاق کے فوائد کو بلند
آہنگی کے ساتھ ابنائے ملک کے سامنے بیان کرنا یا نااتفاقی اور پھوٹ

---

۱ اس کانفرنس کے مقاصد سے ہم کو بالکل ہمدردی ہے مگر یہ سننے کے منتظر ہیں کہ پہلے جلسے کے بعد آج تک کیا کارروائی مقاصد کی تکمیل کے لئے کی گئی۔ اڈیٹر۔

کی برائیوں کو گنایا اُن امور کا ذکر کرنا جن کی بنا پر ہندو مسلمانوں میں رنجش پیدا ہوجاتی ہے۔ یا نصیحت و بلیغ الفاظ میں باہمی صلح کی تلقین کرنا ہی کافی نہ تصور کیا جائے۔ اس سے کبھی کسی فائدہ کی امید نہیں ہوسکتی بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر دو گروہ اور زیادہ ایک دوسرے سے ناراض ہوں اور دلی نفرت و عداوت میں ترقی ہو۔ جس کا مدت سے تجربہ ہو رہا ہے۔ پس اصلاح کا یہ طریقہ تو اس قابل ہے کہ اس کو چھوڑ ہی دیا جائے اور اس کے عوض اس بات کی کوشش کیجائے کہ باہمی منافرت کی اصلی وجہ معلوم ہو، اور جو کوئی وجہ دریافت کیجائے اُس کو دور کرنے اور اس کی جگہ ارتباط و محبت قائم کرنے کی ایسی عملی ترکیب اختیار کیجائے جس کا اثر دونوں اقوام کی طبیعتوں پر بالکل نامعلوم طور پر ہو اور یوں ان کی طبیعتیں باہم لطف و یگانگت برتنے پر خود بخود مجبور ہو جائیں۔ اس قسم کی تدبیر جس قدر کارگر ہوسکتی ہے اس کو ہر شخص محسوس کرسکتا ہے اور اسکو اختیار کرکے اس پر عمل پیرا ہونا بھی چنداں دشوار نہیں۔

ہندو مسلمانوں کی عداوت اور رنجش کے اصلی وجوہ دریافت کرنے کوئی مشکل نہیں ہیں۔ آجکل جن باتوں کو وجہ مخاصمت ٹھہرایا جاتا ہے وہ زیادہ تر گاؤکشی یا مسجد و مندر کا جھگڑا یا بعض ایسے ہی امور ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ باتیں وجہ فساد نہیں کہی جاسکتیں۔ بلکہ ایسا کہنا اصلیت کو چھپانا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان امور کی بدولت دلی عناد کو ظاہر کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ ہندو مسلمانوں کا ساتھ اس ملک میں آجکل کا نہیں ہے۔ زمانہ دراز سے دونو قومیں یہاں بستی ہیں۔ مسلمانوں کی مساجد اور ہندوؤں کے دیول بھی آجکل کی ایجاد نہیں ہیں اور نہ گاؤکشی کوئی نئی بات ہے۔ ہاں جو نا اتفاقی اور بے لطفی اس وقت موجود ہے اس کا پہلے پتہ بھی نہ تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا اگلے

لوگ اپنی قوم اور اپنے مذہب کی عزت کرنا نہیں جانتے تھے؟ کیا ان لوگوں میں مذہبی اور قومی پاس نہ تھا؟ کیا وہ اپنے معابد کی تحریم و تکریم سے ناواقف تھے؟ کیا ان میں حمیت و غیرت نہ تھی؟ اگر یہی مفروضہ وجوہ رنجش کے ہیں تو پھر کیوں وہ لوگ ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے اور ان میں فساد نہیں ہوتے تھے؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں وجہ فساد اور بنا ر مخاصمت نہیں ہیں۔ اور انکو بنا ر مخاصمت سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ صرف اظہار مخاصمت کا ایک ذریعہ بن گئی ہیں۔ اس لئے بغض و عداوت کی وجہ یہ کبھی نہیں ٹھہرائی جا سکتی۔ اس کا سبب کچھ اور ہونا چاہئے۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کے آئے دن ہمارے ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو کشیدگی پائی جاتی ہے۔ اگر اس کے اسباب پر غائر نظر ڈالی جائے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ناتربیت کے نئی تعلیم کا رواج پا جانا اس کا اصلی باعث ہے۔ اس نئی تعلیم کے ساتھ موجودہ ترقی یافتہ زمانہ کے مطابق تربیت کا سامان بھی مہیا ہوتا اور سوسائٹی کی حالت میں بھی حسب ضرورت اصلاح کی گئی ہوتی تو ایسی تباہ کن خرابیاں اور بربادی اور پیچیدگیاں نہ پیدا ہوتیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قسم کی بے لطفی اور باہمی کش مکش کی تاریخ نئی تعلیم کی ابتدا کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ پرانی طرز کے تعلیم و تربیت یافتہ ہندو اور مسلمان نہ کسی باہمی مخالفت کے مرض میں گرفتار ہیں اور نہ ان میں کوئی ایسی کشیدگی و رنجش پائی جاتی ہے۔ بلکہ بخلاف اس کے ان کی ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی یکجہتی و یکدلی بے نظیر ارتباط و اتحاد اور عجیب و غریب اخلاص و محبت قابل رشک ہے۔ اس کے ساتھ ان کو اپنی قوم سے بھی ہمدردی ہے اور وہ اپنے مذہب کے بھی بہت سختی کے ساتھ پابند ہیں۔ محبت و یکدلی کے باعث ان لوگوں نے اپنے قومی اغراض کو پامال نہیں کیا ہے بلکہ وہ اپنی قوم

کے ویسے ہی ہمدرد اور طرفدار ہیں جیسے نئی تعلیم کے نام لیوا بلکہ اگر سچ پوچھو تو اُن سے زیادہ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وُہ اپنی سخت ترین خود غرضی اور نفس پرستی ہمدردیٔ قوم کے رنگ میں ظاہر کرنا نہیں جانتے۔ پس ایسی حالت میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یگانگت بڑھانے اور نفاق دُور کرنے کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو پورے طور پر اس باہمی منافرت کی بیخ کنی کر کے ان ہر دو اقوام میں خلعت یگانگت کی بنیاد اچھی طرح ڈال سکیں۔ اس کے لئے سب سے بہتر و موثر تدبیر ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان ہر دو اقوام کے اُس برگزیدہ طبقہ کو آمادہ کیا جائے جس کے ہاتھ میں ان کی طبیعتوں کی باگ ہو اور جو ان کے عادات و خصائل کا بنانے والا ہے۔ انسان کی شخصی زندگی مختلف اثروں سے متاثر ہوتی ہے۔ کچھ تو وُہ قانونِ قدرت کی اطاعت پر مجبور ہوتا ہے اور کچھ اسے اپنی اور دُوسروں کی اختیاری خواہشوں کی تحریک کا تابع ہونا پڑتا ہے۔ غرض انسان کی زندگی معجون مرکّب ہو اور اس معجون کے تیار کرنے میں قدرت نے بنی نوع انسان کے بہترین صنف نسوان کو بہت کچھ اختیار دے رکھا ہے آئینہ زندگی میں مختلف اثرات کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا تو بالکل عورتوں ہی کا کام ہو اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ وہی سوسائٹی کی بنیاد ہیں۔ لہٰذا ان کے لئے یہ کوئی دشوار بات نہیں ہے کہ اپنی قوم کی طبیعت میں کوئی انقلاب پیدا کرسکیں۔ یہ بالکل اُن کے اختیار میں ہو کہ وُہ اپنی قوم میں سے بغض و کینہ کے خیالات کو دُور کر کے صلح و آشتی اور محبت و خلوص کے جذبات پیدا کریں۔ قوم اور ملک کے جذبات ہمیشہ عورتوں ہی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ پس ان لوگوں کا جو ہندو مسلمانوں کے ارتباط و اتحاد

کی آئندہ و سمجھتے ہیں اور ان دونوں میں محبت کے پیدا کرنے کی فکر میں ہیں یہ فرض ہے کہ وہ ہر دو اقوام کی مدد سے اس کام کو سرانجام دینے کی کوشش کریں۔ عورتوں کے ذریعہ جس طرح آسانی کے ساتھ یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ابنائے ملک ابتک اس سے بالکل غافل ہیں حالانکہ ہندوستان کے ایک زبردست عالی پایہ شخص نے کئی سال ہوئے جن مفید نکات و اہم تدبیر کو بڑی ہی دلسوزی سے اہل ہند کے سامنے پیش کیا تھا۔ اپریل ۱۹۰۰ء میں الگزینڈرا گرلز اسکول" بمبئی کے سالانہ جلسے کے موقع پر آنریبل جسٹس رانا ڈے مرحوم نے جو پرزور تقریر کی تھی۔ اس کے دوران میں کہا تھا کہ:-

"ہندوستان کے ان مختلف فرقوں اور مذہبوں کے
آدمیوں میں اس وقت تک اصلی اتفاق اور اتحاد پیدا نہ ہوگا
جب تک کہ ان کی عورتیں چھٹ پن میں باہم ملائی نہ جائینگی
اور ان میں دوستی اور باہمی ارتباط قائم نہ کیا جائیگا"

اس قول کی صداقت اور اس تدبیر کے سریع الاثر ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے جسٹس رانا ڈے کی دور اندیشی اور دانشمندی نے متواتر و مسلسل غور و خوض کے بعد آخر انہیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ہندو مسلمانوں کے باہمی ارتباط کے متعلق ان دونوں قوموں کے برگزیدہ افراد جس قسم کی سعی و کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے انکی غایت حاصل ہونی قریب قریب محال ہے۔ اصل مقصود اگرچہ بہت صحیح ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راہ اختیار کی جا رہی ہے وہ بالکل غلط ہے جسٹس رانا ڈے کی روشن خیالی عالی دماغی۔ عاقبت بینی اور مصلحت اندیشی نے ہندو مسلمانوں کے اتفاق

واتحاد کا جو رستہ دریافت کیا ہے اس سے زیادہ ٹھیک۔ آسان اور یقینی راستہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارے ہموطن بھائی اس پند پیرانا پر ٹھنڈے دل سے غور کرکے اس پر کاربند ہوں تو موجودہ بدمزگی کا کیا کچھ انسداد ہو سکتا ہے۔

اب جبکہ ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی نے محبان وطن کو اس درجہ ہراساں اور پریشاں کر دیا ہے کہ اس کے علاج کی غرض سے ایک باقاعدہ کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور بہی خواہان ملک اس کے دفعیہ کی تدابیر اختیار کرنے پر مستعد نظر آتے ہیں۔ ہم نہایت ادب کے ساتھ مادر ہند کے واجب الاحترام فرزند رشید آنریبل جسٹس راناڈے مرحوم کی مذکورۂ بالا معقول اور مبارک تجویز کو اہل ملک کے سامنے پیش کرنے کی اجازت چاہتے ہیں +

(از حیدرآباد دکن) **سید خورشید علی**

غزل

(حضرت شرر کاکوروی تلمیذ داغ مرحوم)

وصل کی رات ہے باقی نہ کوئی بات رہے / اور باقی جو رہے کچھ تو یہی رات رہے
درد کرتا ہے تقاضا کہ رہوں تیرا صف ماتم / ضبط کہتا ہے کہ اللہ میری بات رہے
آگئی آمد پہ کرم کو نصیحت ناصح / آج کی رات یہ موقوف خرافات رہے
آپ تسلیم نے دعوے الٰہی گنہ کی نسبت ہیں / حشر میں کچھ نہ ہوئی رند خرابات رہے
وہ بھی کیا درد محبت جو اٹھا اور تھما / لطف اٹھنے کا تو جب ہے کہ دن رات رہے
اب جو ملتے ہو تو ملتے جاؤ اسی طور سے / بس یہی طرز یہی لطف ملاقات رہے
پہلے آنے سے نہ آنا تھا کہیں بہتر / آئے تو رات گئے اور گئے رات رہے
شور دل اشک فشانی ہے باقی جو شرر / یا الٰہی یہی گرمی یہی برسات رہے

تم نہیں دار محن سے ہیں چھٹنے کا شرر
کیا رہے ہم جو یہاں مورد آفات رہے

سود اور نفع

سود کی کمی بیشی کے اسباب اس مقام پر ہم دو ضروری باتوں کے متعلق جن سے ہر شخص کو روزانہ زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ بحث کرینگے۔ ان میں سے ایک تو زر کی شرح سود ہے اور دوسرے عام کاروباری نفع۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے غریب لوگ ان اسباب کو جن کا شرح سود کی کمی بیشی پر اثر پڑتا ہے مطلق نہیں سمجھتے بلکہ یہاں کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ بھی اس مسئلہ سے بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اس کے متعلق لکھنے پڑھنے اور گفتگو کرنے میں بیشمار غلطیاں کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کا عام خیال ہے کہ سودی روپیہ چلانے والے پرلے درجہ کے حریص اور دیگر تجارت پیشہ اشخاص کی نسبت زیادہ قسی القلب اور بے رحم ہوتے ہیں۔ اور یہ خیال ملک کی طبائع میں ایسا راسخ ہوگیا ہو کہ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے۔ سود کی زیادتی کو روکنے کے لئے قانون بنائے جاتے تھے۔ ان کا منشا تھا کہ شرح سود کی روک تھام سے لوگوں کو مقروض سود خواروں کی زبردستی سے محفوظ کیا جائے۔ مگر حال کے دانشمند اس خیال کے قائل نہیں ہیں۔ نہایت مستثنیٰ حالتوں سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شرح سود کی زیادتی کے بھی تقریباً وہی اسباب ہیں۔ جن سے دوسری تجارتوں میں اشیا گراں ہوجاتی اور زیادہ قیمتیں پانے لگتی ہیں۔ ممکن ہو اور اکثر حقیقت واقعہ یہی ہوتی ہے کہ بہت صورتوں میں قرضہ کی شرح سود میں بیشی ویسے ہی معقول اور مناسب حالات کے تحت عمل میں آتی ہے۔ جن پر ہم ایک جوتی کے جوڑے میں قیمت کی زیادتی کو بیشی سمجھتے ہیں۔

پہلے تین بڑے بڑے اسباب ہیں جن پر سُود کی شرح کی کمی او بیشی کا دارو مدار ہوتا ہے اور وُہ یہ ہیں :-

اوّل - ضمانتِ قرضہ کا کافی یا ناکافی ہونا -

دوم - مقدارِ زر جو ایک وقت منڈی میں قرضہ دینے کو موجود ہو -

سوم - تجارت اور زراعت کی عام حالت - اگر تجارت کی گرم بازاری ہے اور زراعت کے کاروبار رونق پر ہیں تو بچت روپیہ یعنی سرمایہ کی مذکورہ بالا کاموں میں اشد ضرورت ہوگی اور وُہ گراں ہوگا - زیادہ شرح سُود پر قرض مل سکیگا - برعکس اس کے اگر ان کاروبار کی حالت ابتر ہو - اور سرمایہ کی کسی کو ضرورت نہیں تو زر خواہ مخواہ ارزاں ہوگا -

ناکافی ضمانت بھاری سُود :- پہلی شرط تو ایسی صاف ہے کہ اس کے سمجھنے میں کچھ دشواری نہ ہوگی - دُنیا بھر میں یہ بات ایسی مشہور ہے کہ بمنزلہ ضرب المثل کے ہوگئی ہے - یعنی ناکافی ضمانت پر بجز بھاری شرح سُود کے روپیہ قرض نہیں مل سکتا - کیونکہ جس شخص کے پاس روپیہ قرض دینے کو ہوتا ہے وُہ قرض دینے سے پہلے یہ ضرور دیکھتا ہے - کہ مجھے اصل زر کے بھی واپس وصول ہونیکی امید ہے یا نہیں - اگر اصل کی وصولی کی امید قوی اور اطمینان بخش ہے تو سُود کم ہوتا ہے اور اگر اس کے غارت ہوجانیکا اندیشہ ہو تو چونکہ جان بوجھ کر کوئی بھی اپنے مال کو جوکھوں میں نہیں ڈالتا - لہٰذا جوں جوں اس نقصان کا خطرہ زیادہ ہوتا جاتا ہے سُود کی شرح میں زیادتی واقع ہوتی جاتی ہے - علم اقتصاد کے رُو سے اس کی تعبیر یُوں کرتے ہیں کہ شرح سُود کی بیشی زرِ اصل کے مخاطرہ کے برابر برابر چلتی ہے یعنی اس کے ساتھ متناسب ہوتی ہے -

بھلا وہ غریب کاشتکار جس کی نسبت پہلے سے معلوم ہے کہ بیچارہ قرض کے

بوجھ کے تلے دبا ہوتا ہے۔ اس شخص کے مقابلہ میں جو بڑا جاگیردار، زمیندار یا تاجر ہے
جس کے پاس زمینیں۔ جائدادیں اور مواشی کا شمار نہیں اور جس کی کوٹھیاں مال و
متاع سے بھرپور ہیں۔ بروقت ضرورت یکساں شرح سود پر کیونکر قرض حاصل کر سکتا
ہے اور مزید برآں ایسی صورت میں کہ اول الذکر کو روپیہ نیا کنواں کھدوانے
یا خرید مواشی کے لئے درکار نہ ہو۔ کاشتکار کو اسے اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی
پر لگانا ہے۔ اول الذکر اشخاص کے بارہ میں مہاجن کو علم ہے کہ جائداد کافی و
وافی اور ضمانت اطمینان بخش ہے۔ درحالیکہ موخر الذکر کی نسبت اُسے یقین
ہے کہ سود بھی بڑی مشکل طرح سے ادا ہوگا۔ اور اصل کے بجائے ترنے کے ڈوبنے
کی زیادہ امید ہے۔ بلاشبہ بہت لوگ اس طرح ظالم اور زیادہ ستانیوالے
قرض دینے والوں کے غلام اور ہمیشہ کے لئے دست نگر ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ امر
فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہر ملک میں بباعث بدقسمتی۔ افلاس۔ جہالت اور
کاہلی مجبوراً بعض لوگوں کو اپنے سے زیادہ مالدار اور باقبال اشخاص کے پنجے میں
کم و بیش گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ پیش بینی
و پیش بندی اور کفایت شعاری کی عادات پختہ کی جائیں تعلیم پھیلائی
جائے اور قرض کے نام سے کوسوں دور رہا جائے۔ ہندوستان میں قریب
سب قسم کے لوگ شادی بیاہ کے موقعوں پر اپنی وسعت سے زیادہ خرچ کر دیتے
ہیں۔ اور اس گھمنڈ میں کہ ایک بار ایسا جشن کیا جائے کہ کسی نے دیکھا نہ ہو
اتنا روپیہ رائیگاں کھو دیتے ہیں کہ بعض اوقات پھر ساری عمر اس کا خمیازہ اٹھانا
پڑتا ہے۔ جو لوگ ایسے غیر منفعت بخش امور کے لئے روپیہ لیں بھلا انکو واجبی
سود پر کون قرضہ دے؟

قرض کی ضمانت کے ضمن میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ حکومت جس کے

زیر نشانہ قرض لینے اور دینے والے رہتے ہیں کیسی ہے۔ یعنی عادل اور محکم ہے یا نہیں۔ اگر ملک ایسا ہے جہاں بدنظمی اور ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ جان و مال کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ امن عامہ میں خلل ہے۔ یا ملک میں قانون نہیں اور اگر ہے تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر منصف رشوت خوار اور حاکم بے انصاف ہوں تو قرض دہندہ سمجھ جائیگا کہ میرے روپیہ کے ڈوبنے کے راستے کھلے پڑے ہیں۔ اس لئے جہانتک ممکن ہوگا وہ اُسے تھیلکہ میں ڈالنے سے بچیگا۔ اس کے ساتھ اگر یہ خطرہ بھی دامنگیر ہو کر خدا جانے کل کیا پیش آئے تو سرمایہ دار اس بات کو ترجیح دیگا کہ اپنی نقدی کو صندوق میں مقفل بند کر کے سپرد کر کے سرمایہ کی حفاظت کرے۔ بجائے اس کے کہ اُسے کام میں لگا کر اصل اور سود دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ولایت انگلستان میں شرح سود کے نہایت کم ہونے کا ایک بڑا باعث گورنمنٹ کا استحکام ہے استقلال اور اس کی دیانت اور امانت ہے۔ اس کے بغیر کبھی روپیہ ارزاں نہیں ہو سکتا۔ اور باوجود ان رخنہ بندیوں کے امکان ہے کہ روپیہ پھر بھی گراں ہو جائے لیکن اس کے محرک دوسرے قومی اسباب ہونگے۔

شرح سود کی کمی بیشی کا دوسرا سبب ملک کا الدار یا مفلس ہونا ہے یعنی یہ کہ آیا کسی صوبہ یا ملک میں اس روپیہ کی مقدار جو قرض پر دیا جائیگا کثیر ہے یا قلیل۔

مفلس سے وہ ملک مراد ہے جہاں بچت کے روپیہ کی مقدار یعنی سرمایہ آبادی کے لحاظ سے کم ہو اور ہندوستان سے بہتر مثال اس کی نہیں مل سکتی ظاہر ہے کہ جہاں کہیں بچت کا روپیہ یعنی فاضلہ سرمایہ نہ ہوگا۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں قرضہ کی شرح سود سخت بھاری ہو۔ کیونکہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ جو چیز کمیاب

ہو بشرطیکہ اس کی ضرورت بھی ہو۔ گراں قیمت ہوتی ہے۔ اور روپیہ ایسی شے ہے کہ اس کی ہمیشہ ضرورت ہی ضرورت رہتی ہے۔

تیسرا باعث شرح سُود کی کمی بیشی کا تجارت کی گرم بازاری اور زراعت کی رونق ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ آیا ان سے کافی نفع ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر کسی کاروبار میں نفع کافی نہیں ہوتا تو لوگ اس کی طرف رُخ نہیں کرتے اور نفعِ قلیل کے باعث اس میں ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے۔ ایسی تجارت سرسبز نہیں کہلا سکتی۔ لہٰذا اگر تجارت۔ زراعت یا حرفت میں نفع کثیر ہوگا تو اس کا بدیہی نتیجہ یہی ہوگا کہ شرحِ سُود میں زیادتی ہو جائے۔ اس کی وجہ صاف ہے جس کاروبار میں بہت نفع کی امید ہو اس میں ہر شخص روپیہ لگانے کو کمربستہ اور مقابلہ کو تیار ہوتا ہے۔ اس لئے روپیہ کی اشد حاجت ہوتی ہے اور جس کو جس شرط پر جہاں سے ملتا ہے وہ لینے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور قاعدہ ہے جب کسی چیز کی بہت خواہش کیجاتی ہے تو وہ بھاری یعنی گراں ہو جاتی ہے اور جو شے مہنگی ہوتی ہے۔ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب زر مہنگا ہو جائیگا تو اس کے لئے بھی زیادہ قیمت یعنی بھاری شرح سُود دینی پڑیگی۔ اور جب کوئی شخص اپنی تجارت میں بہت سا نفع کماتا ہے تو اُسے زیادہ سُود ادا کرنا کچھ بار نہیں ہوتا۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص نے ایک روپیہ اُدھار لیکر نارنگیاں بیچنی شروع کیں اور شام تک ڈیڑھ روپیہ کما لیا تو گویا اسے پچاس فی صدی نفع ہُوا۔ یعنی اس نے ۱۲۲۵۰ فی صدی فی سال فائدہ اٹھایا اور اب اگر اسے ایک آنہ یومیہ بھی سود دینا پڑے جو قریب ۶ فی صدی کے ہو تو اس کی رقم ۶ × ۳۶۵ سال کے دنوں میں ضرب دینے سے ۲۱۹۰ بنی پھر بھی سُود ادا کرنے کے بعد اس کے پاس سالانہ (۱۲۲۵۰ - ۲۱۹۰) = ۱۰۰۶۰

خالص فی صدی بچت ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے منافع اور سود شاذ یا غیر معمولی ہیں۔ تاہم اس مثال سے نہ صرف یہی توضیح ہوتی ہے کہ سود کا مدار نفع پر ہے بلکہ یہ بھی روشن ہو گیا کہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ بھاری سے بھاری سود بھی مقروض کے لئے ہمیشہ گراں ثابت ہو۔

نفع کی تعریف۔ اس سے ہم منافع کے عام مسئلہ پر پہنچ گئے ہیں قیمتِ فروخت سے پیدا وار کی لاگت منہا کرو۔ جو باقی رہے وُہ نفع ہے۔ جب لاگت سے قیمت فروخت زیادہ ہوگی تو نفع ہوگا اور جب اصلی لاگت سے قیمت فروخت کم آئیگی تو نقصان رہیگا۔ اس حاصل تفریق کی ہفتہ وار۔ ماہانہ یا سالانہ رقم شرح نفع کہلاتی ہے۔ جب کوئی رقم بطور قرضہ دیکر اس پر نفع حاصل کیا جائے۔ اس کو سود کہتے ہیں۔ اب اس امر کا ذہن نشین کر لینا بھی مناسب ہو۔ جیسا کہ اوپر نارنگی فروخت کرنے والے کے معاملہ میں ثابت ہو چکا ہے۔ کہ جوں جوں وقت کی مقدار جس میں نفع حاصل ہو کم ہوتی جاتی ہے اس نفع کی شرح بڑھتی جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص اپنے سرمایہ پر روزانہ ایک فیصدی نفع کماتا ہے وُہ سال کے عرصہ میں اس سرمایہ پر فیصدی ۳۶۰ حاصل کرتا ہے۔ زیادہ وضاحت کے لئے یوں سمجھو کہ اگر ایک شخص کو ایک ہفتہ کی فروخت میں ایک فی صدی نفع ہوتا ہو۔ تو سال میں ۱ × ۵۲ یعنی ۵۲ فی صدی منافع ہوا۔ روز کی مقدار ہفتہ سے کم ہے اور ہفتہ کے حساب سے ۵۲ فیصدی فی سال شرح منافع ہے۔ اور یہ شرح بقدر ۳۱۳ کے ۳۶۵ فی صدی سے کم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرح منافع بڑھتی جاتی ہے جوں جوں اس مقدار وقت جس میں یہ منافع پیدا ہوا۔ گھٹتی جاتی ہے۔

تجارت کے کاروبار میں منافع کو عموماً تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

پیدا ہو اور سب سے ضروری حصہ معمولی سود ہے۔ اگر کوئی اپنے روپیہ سے
سرکاری نوٹ خرید کر لے تو یہ ظاہر ہے کہ اُس کو کچھ فیصدی سود اُس پر
ملیگا لیکن اگر وہ شخص اسی روپیہ کو کسی تجارتی کاروبار میں لگائے گا تو
اُسے کم از کم بقدر اسی مقدار کے جو سرکار دیتی ہے اپنے روپیہ پر سُود
حاصل ہونے کی امید ہونی چاہیئے۔ دُوسرا حصّہ وہ رقم ہے جو وہ اپنے
روپیہ کو تجارت کے مخاطرہ میں ڈالنے کی وجہ سے لینا چاہتا ہے۔
کیونکہ کاروبار میں بسا اوقات سرمایہ کے تلف ہو جانیکا بھی خیال ہوتا
ہے۔ تیسرا حصہ اس معاوضہ یا محنتانہ کا ہے جو شخص اپنے وقت
اور ہنرمندی کو کام میں لگانے سے وصول کرتا ہے۔

جو لوگ اپنا روپیہ صرف سرکار کے حوالہ کر دیتے ہیں انکو منافع کا صرف
پہلا حصہ ملتا ہے۔ انکو اس سے زیادہ کوئی تکلیف نہیں کرنی ہوتی کہ
گورنمنٹ نوٹ خریدیں اور بیٹھے بیٹھے ان کا سود وصول کرتے رہیں اور
جو لوگ اپنے سرمایہ سے کسی بنک یا کمپنی میں حصہ خرید کرتے ہیں ان کو
منافع کا پہلا اور دوسرا حصہ دونوں وصول ہوتے ہیں یعنی ایک تو
وہ سود جو سرکاری نوٹ خریدنے کی صورت میں پیدا ہوتا اور نیز کچھ
منافع تاکہ اگر کمپنی یا بنک کے کاروبار میں سرمایہ ضائع ہو جائے تو اس خطرہ
اور نقصان کا قدرے معاوضہ ہو سکے۔ سب سے اخیر وہ اشخاص جو دکانداری
کرتے ہیں یا زراعت میں یا کوئی اور کاروبار وہ مذکورہ بالا منافعوں کے
علاوہ اپنے محنتانہ یا ہنر کے مساوی مزید نفع کے بھی طلبگار ہوتے ہیں۔ جس کے
وہ بسبب اپنا وقت اور ہنرمندی کام پر صرف کرنے کے مستحق ہوتے ہیں
اس طرح زیادہ سے زیادہ نفع ان لوگوں کے حصہ میں جاتا ہے جو اپنے زر کو

تجارت۔ زراعت۔ یا حرفت میں خواہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے کام کریں یا دوسرے لوگوں سے کرائیں۔ لگاتے ہیں۔ اور کم سے کم منافع انکی قسمت میں ہوتا ہے جو اسی بات پر قناعت کریں کہ آرام سے گھر میں بیٹھے رہیں اور روپیہ کو کسی بالکل محفوظ ٹھکانے لگا رکھیں۔

جو لوگ کسی تجارت مثلاً دکانداری میں داخل ہوتے ہیں انکی علت غائی یہ ہوتی ہے کہ اچھی طرح بسر اوقات ہو سکے۔ کیونکہ اگر ان کا گذارہ اس سے نہ ہوا تو وہ اس کام ہی کو ترک کر دینگے۔ پس جب ایک چھوٹا دکاندار ایک چھوٹے گاؤں میں۔ ایک بڑے شہر کے بڑے تاجر کی نسبت زیادہ قیمتیں لگاتا ہے اور گراں فروش کو یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ چھوٹا آدمی دن میں تھوڑا ہی مال فروخت کرتا ہے اور اس کو اسی میں سے اپنا اور گھر والوں کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے) تو وہ اپنے گذارہ کے لئے زیادہ ہی قیمتیں لگانے پر مجبور ہے۔ بڑے شہر کا بڑا دکاندار دن میں بہت مال فروخت کر لیتا ہے۔ اس لئے شاید وہ اس مال پر کم فائدہ اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے یا دوسرے لفظوں میں ارزاں بیچتا ہے +

صادق علی

جذبۂ شوق[1]

اللہ رے اس کا اشتیاق، اس کا ولولہ، اس کی وحشت قیامت خیز وحشت جو کسی سمندر پار سونا پیدا کرنے والی سرزمین میکسیکو سے کھینچ کر اس کو مضافات لندن میں ایک سڑک کے کونے پر لے آئی۔ مگر اس از رفتہ کو اس جذبۂ کشش کا احساس بھی نہ ہوا۔ آخر چلتے چلتے ایک جگہ رُک گیا۔ رستہ پر بڑے غور سے نگاہ ڈالی اور اب اس آشفتہ سر کو یقین ہوا کہ وہ بھی اس مہمل حرکت پر مضحکہ نہ سہی، تبسم ضرور کر گی۔

پھر ٹھہر گیا، پھر کچھ شمار کرنے لگا اور اس کو تو گنتے گنتے یوں ہی پندرہ دن گذر گئے تھے۔ وہ بھی کیا مبارک ساعت تھی جب یہ وفا کا مارا اس جنون خیز وحشت میں پھنسا تھا اور لاتنے لیل و نہار اسی عالم خود فراموشی میں بسر کر دیے تھے۔ پہلے تو دن، پھر گھنٹے، پھر منٹ شمار کرتا رہا اور اب تو کیفیت ہی اور تھی۔ سکنڈ تک گن رہا تھا۔ اسٹیشن سے چلکر اس مقام تک جہاں وہ کھڑا ہو گیا تھا اس رہگزر پر اس نے قدم نہیں اُٹھائے تھے بلکہ ہر لحظہ میں ایک ایک جست لگائی تھی، اور ہر جست پر مضطرب دل، بیقرار دل اچھل جاتا تھا۔

ہاں اس نے تو یہ سفر اسی غرور کامیابی کے ساتھ شروع کیا تھا جو اب تک نہ صرف یاد بلکہ دل و دماغ میں موجزن تھا۔ عہد طفلی کی وہ مستانہ

---

[1] "دی ہیئرن" کے عنوان سے یہ مضمون انگلستان کے کسی جادو نگار نے لکھا تھا۔ دوستوں کی خواہش سے اس کو میں نے اپنی زبان اور اپنے رنگ میں لے لیا ہے۔ مقبول

نگین نازنین جب بڑے اشتیاق بڑے انتظار کے بعد روز معین آتا اور وہ
ایام تعطیل کے لئے بحیرۂ آرزو اور بے انتہا تمنا کے ساتھ مدرسہ سے رخصت ہوتا
سلسل پندرہ روز تک اس کا تن خاکی ایک آہنی کل کی مثال تھا جس میں کوئی
بھر دیگئی تھی اور جس قوت نے یہاں تک اُسے پہنچا دیا تھا۔ تعجب خیز تھا تو یہی کہ
قلب سے ارادہ اور جسم سے قابو کوسوں دور تھا۔ اس کے خیال بیجا نے
تصور جاناں میں کسی ناپیدا کنار کا رُخ اختیار کر لیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ
اسی کیفِ بیخودی میں چند لمحے تو بسر کر دے۔ اس خوابِ شیریں یا خیالِ دلکش
کے سوا دنیا و مافیہا سے بے خبر و آزاد رہے وقت کا تقاضا بھی اس انتظار میں تھا
کہ یہ خواب دیکھیے کب تک واقعہ ہو جائے۔ گو یہ انسانی مشین اس قدر چل چکی
تھی اور منزل گہ مقصود صرف چار سو قدم رہ گئی تھی۔ لیکن ؎

ہوئے تھے پاؤں ہی پہلے نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے تھا اُس سے نہ ٹھہرا جائے تھا اس سے

دیوانہ بکارِ خود ہشیار۔ دیوانہ نہ تھا مگر اپنے احمقانہ فعل کو دیوانگی پر
محمول کرکے غور کر رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ جب کچھ فیصلہ نہ کر سکا مجبورانہ
دانت پیسنے لگا۔ نہ قدم اُٹھتا تھا کہ آگے بڑھ جائے نہ ہمت پڑتا تھا کہ لوٹ چلے
اگر آستانِ حبیب تک پہنچ جائے اور دیدار نگار میسر ہو تو کیا کیا عرض کرے
مبادا وہ جمالِ جانفروز وہاں جلوہ افروز نہ ہو تو واسے ناکامی پھر کیا کرنا
ہوگا۔ کبھی اپنے دل سے کہتا "کاش حضرت متوسط ہوشمندی سے کام فرماتے
اور اس نو بہارِ ناز کو تیار و منتظر رہنے کے لئے پیشتر سے تاکید بھیجتے
تو کیا خوب ہوتا" کتنی بلائیں ٹل جاتیں۔ ہاں اس لطف منزل میں کچھ کمی ہو جاتی
جو بے عقل لوگوں کا حصہ صبر آزما عشاق کا مدعا اور پُر شوق و تعیین نظر کا [illegible]

بات اور جو کسی گل پیرہن کے ناگہاں پہنچ جانے کی مسرت! حیرت سے پیدا ہو جاتی ہے ذرا افسوس سے

ہمیں جن سے چشم امید تھی وہی آنکھ ہم سے چرا گئے
دل و دیدہ اپنے جو یار تھے سو وہ درد و غم میں پھنسا گئے

کیفیت یہ ہے کہ منزل عشق کا یہ راہ رو دو سال تک باہوش و خوددار رہا۔ اپنے پیشہ اور اپنے فرائض کو مستعدی و توجہ سے انجام دیتا۔ اس کو فن گیاس سازی میں مہارت تامہ تھی۔ یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ حسب ضرورت آلات گیاس خود تیار کرتا۔ ان کو وسیع ممالک کے مختلف اقطاع میں نصب کرتا۔ البتہ شہرت و دولت دونوں اس ہنرمند کا ساتھ دے رہی تھیں اور اس نے بھی عہد واثق کر لیا تھا کہ اس پیکر حسن سے خانہ آبادی کرنے کے قبل مال اور نام دونوں کو حد کمال تک حاصل کریگا۔ مگر کسی محبت پیشہ کی نا بود کاوش ہی کیا اور عزیمت ہی کیا۔ یکایک یہ خیال، یہ شوق، یہ تپش انگیز جوش پیدا ہو گیا کہ چل کر ایک بار اس کا فرادا کا پھر نظارہ کر لینا چاہئیے۔ حصول اجازت کے لئے افسران بالادست سے معذرت کر کے خانگی وجوہ سے کچھ عرصہ کے لئے انگلستان میں اپنی موجودگی کی شدید ضرورت ثابت کی۔ بطیب خاطر چھ ہفتہ کی رخصت عنایت ہوئی تھی اور تین منزلیں طے کر کے یہ ستم کش وہاں پہنچ گیا تھا۔ جہاں کبھی اپنی ناکام بینی پر دل میں کڑھتا اور کبھی استقلال و ہمت کے ساتھ اپنی فلسفی رہبر کے اس قول پر راسخ قدمی ظاہر کرتا ہے

معشوقت ز میں نشنے بیزار این ہمہ کار   بگزار ند و سر شتہ حور سے گیرند

وہ گھر وہ در وہ جلوہ گاہ ناز پیش نظر تھا۔ موڑ کے قریب، دروازے کی سفیدی اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ارغوانی رنگ کی خوشنما کھڑکی کمرہ طعام کی صاف

دکھائی دیتی تھی۔ بلکہ یہ فنا فی المحبوب تو بالکل یہی خیال کر چکا تھا کہ اس بُت
خود آرا کو بھی دیکھ رہا ہے۔ یہ وہی دلفریب جھروکہ تھا جہاں شام کو اکثر وُہ
مہوش کھڑی ہوتی۔ اپنے شیدائی کو سڑک پہ تکتے ہوئے دیکھ کر اس کا معشوقانہ
تبسم اس کے لب ہائے لعلین کی دلربا جنبش اس خود فراموش کو خوب
یاد تھی۔ یہی غمازِ خندہائے زیر لبی اس ایمان فروش کو اس کرشمہ باز کا فرنگِ
کی مسرت و ناکامیابی کی خبر دیتے تھے جس نے اپنی مراد تو پالی تھی مگر اپنے
دیدہ و دل کا انتظار اپنا چشم براہ رہنا چھپانا چاہتی تھی ؎

دو دن نہ چھپ سکی تو چاہت ترا بُرا ہو
سب کھل گیا ہے سب پہ اب دیکھیے کہ کیا ہو

یہ تو آغازِ اُلفت کا زمانہ تھا جسکو دونوں اس وقت تک خود ہی نہ
سمجھتے تھے مگر جب پیوند محبت استوار ہوا راز ناگفتہ آشکار ہو گیا۔ ان کی
بابت غیروں کو غور و تجسس میں دلچسپی و استقامت نہ رہی تاہم یہی شرمگیں
تلطف یہی دلکش تبسم اس کے لئے قائم تھے وقت پر ضرور اپنا جوہر دکھاتے
اور اپنے رنگ میں کسی تشنا مند کی عیش دائم کی پاکبازانہ تجویز پیش کر دیتے۔
اگر یہ شوریدہ سر کسی بات پر اپنے پندار سے باہر ہو جاتا تو یہی تاس کی ضد یا
تجت ناروا کے رفع کر لینے میں وُہ کام کرتی جو صبح کے وقت لہر کے دور
کرنے کو آفتاب کرتا ہے۔ الغرض اسی مستیِ ادا اسی عشوۂ دلربا اسی
غمزۂ ناز کا لطف اٹھانے یہ بوالہوس ہزاروں کوس طے کر کے یہاں آیا تھا
اور وُہ بھی ؎

کب کب تری گلی میں بے بیقرار آیا   سو بار جی نے چاہا تب ایک بار آیا

قصہ مختصر۔ اب یہ جادۂ پیمائے محبت خود کو نیم مدہوشی کے عالم میں پاتا تھا

ومتانت کے ساتھ باقی ماندہ چار سو قدم بھی تیزی سے طے کر لئے۔

آخر کار محنت ٹھکانے لگی راستہ ختم ہوا۔ مگر جس کے لئے یہ سب کچھ ہوا وہی ڈرائنگ روم میں کھڑی نظر نہیں آتی۔ نگاہ شوق نے بے تابانہ اور دریچوں میں بھی تلاش کیا مگر اس رشکِ مہر کی جھلک نصیب نہ ہوئی۔

یاد ش بخیر سب سے پہلے اس کی مادر گرامی کی زیارت ہوگی۔ مگر سب سے زیادہ نواسی مہربان کا اندیشہ ہے۔ ہرچہ بادا باد جرأت کر کے گھنٹی بجا دی اب اور بھی وسوسے دامنگیر ہو گئے۔ یہ تو سہ پہر کا وقت ہے چائے کا دور ہوتا ہوگا۔ ممکن ہے حسب معمول کوئی اور شناسا خاتون بھی تشریف فرما ہوں۔ رفتہ رفتہ طبع روشن اور بھی جودت دکھانے لگی۔ عالم تصور میں بعض سنجیدہ بعض خوشمزاج بیگمات کی تصویریں بھی کھنچ گئیں۔ اُن کی پُر مغز گفتگو معنی خیز سوالات اپنی پریشان باتیں "مہمل جوابات" اس متوحشانہ آمد کی رکیک توجیہات کے بعواسب مختصراً ایک وحشت ناک سماں پیش نظر ہو گیا۔ وحشت نے پھر گھیرا۔ اس مرتبہ اس کشمکش ناکام کو تو بھاگنے کی نوبت آگئی ہوتی۔

الحمدللہ۔ دروازہ کھلا۔ نوعمر خادمہ باہر آئی۔ گو چہرہ غیر مانوس تھا دل اور بھی دھڑکنے لگا۔ آناً فاناً یقین کامل ہو گیا کہ اپنی عدم موجودگی میں کوئی امر ناشدنی وقوع پا گیا ہے۔

کیا مس صاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔ سوال تو کر لیا مگر ایسے خطرناک انداز اور متغیر لہجے سے کہ بھولی بھالی لڑکی سہم گئی۔

"ہاں میں اور تنہا ہیں" کتنا مسرور جواب تھا اس پر مستزاد "بڑی بیگم صاحبہ تشریف لے گئی ہیں"۔ دفور مسرت سے دل بے اختیار ہو گیا۔

"خوش نصیب نے اپنا نام بتایا۔ تمہارے سے عرض ڈرائنگ روم میں جگہ پائی

لاہور کی تاریخی دلچسپیاں

شہر لاہور دار السلطنت پنجاب۔ ہندوستان کے اعظم بلاد میں شمار کیا جاتا ہے آثارِ قدیمہ و عماراتِ عظیمہ کے لحاظ سے اگر فی الحال یہ شہر دہلی اور لکھنؤ سے کم دکھائی دے تو تعجب نہیں۔ کیونکہ ناسا عدتِ روزگار سے اسے وہ دن دیکھنے پڑے ہیں۔ کہ خدا بچائے۔ لٹیروں کے ہتھیاروں اور مزدوروں کے اوزاروں نے لاہور کی عمارتوں پر فرہاد صفت کوہ کنی کے منصوبے باندھے ٹھیکیداروں کے عزم ان کوہ صفت عمارات کی بیخ کنی پر آمادہ رہے۔ مگر تیشے ٹوٹ گئے اور جی چھوٹ گئے۔ یہ نشان نہ مٹے پر نہ مٹے۔ خدا کی شان کیا عمارتیں کھڑی کی تھیں۔ ساری کی ساری عمارت۔ یوں معلوم ہوتی ہے جیسا دیووں نے ایک سنگِ عظیم کوہ قاف سے لیکر تراشا ہے اور اس پر پریوں نے نمونے لیکر پچی کاری کی ہے۔ اور لاہور میں لاکر کھڑا کر دیا ہے ہر خشت سنگ سرشت اور ہر چونا لوہا توڑ۔ شروع سے اخیر تک اور اوپر سے نیچے تک ایک جان ہے۔ تیشوں کے منہ پھر گئے مگر بے رحم انسان نے انسان کے کام کو بگاڑنے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ سنگِ سرخ میں اب بھی کہیں کہیں تجلی جھلک کر گویا اپنے بدخواہوں کی ہمت پر نظرِ حقارت ڈالتی ہے۔ اس لئے اے مسافر اس سرزمین پر سے صرف سرسری نگاہ کر کے نہ چلا جائیو۔ بلکہ چشمِ حقیقت بین سے وہ نظارے تماشا کیجیو جو ایک وقت یہاں موجود تھے۔

[1] خواجہ دل محمد صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج نے یہ مضمون کچھ مدت ہوئی بزم اردو کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا

اس نمونہ لاہور کے بانی بنہ کے مجسم شجاعت راجا اُن کے ہیرو سری رام چندر جی کے صاحبزادہ لوہ تھے حضرت مسیح سے ایک صدی بعد کی - اور مسلمانوں سے پہلے یہ راجپوتوں کی ایک نسل حکمران تھی - بھاٹیہ قوم جنکے نام سے لاہور کا بھاٹی دروازہ مشہور ہے انہی راجپوتوں میں تھی - لاہور کا نام دمشق - بھاگا کا بیان میں لاو پور اور راجپوتوں کے فسانوں میں لوہ کوٹ لکھا ہے : مسلمان اسے لوہاور - لوہار - لہانور اور لاہوار کے نام سے بھی تعبیر کرتے رہتے ہیں - زیادہ رونق شہر کو مسلمانوں ہی کے عہد میں ہوئی چنانچہ شہنشاہ اکبر نے بہت سا حصہ شہر کا اور قلعہ از سر نو تعمیر کیا اور جسقدر عالی دید عمارتیں اس وقت موجود ہیں وہ قریباً سب مغلوں کے وقتوں کی ہی بنی ہوئی ہیں - یہ شہر برباد ہو چکا تھا مگر سلطان محمود غزنوی نے سنہ ۱۰۲۳ء میں اسے پھر آباد کیا اور ملک ایاز کو یہاں حاکم مقرر کر گیا - جس کی ہمت سے شہر نے ترقی کی اور رونق پائی - یہ وہی ایاز ہیں جنکی وفا کا ذکر شعراء اب تک اپنے کلام میں کرتے ہیں - اب انکا سادہ مزار شہر لاہور کے بازار ٹکسالی میں واقع ہے - اور اس گوہر درج وفا کے مرقد سے وہی خاکساری ٹپکتی ہے جو اس کا زندگی میں شیوہ تھا - افسوس شہر کے اکثر لوگ ان کا نام بھی بھول گئے ہیں - اور اس مزار کو ملک الیاس کا مزار کہتے ہیں -

آجکل کوئی نووارد شہر میں داخل ہو تو بلند مکان سنہری مینار بارونق بازار سوداگری کی دکانیں اُسے خوب لطف دیتی ہونگی - باہر کھلی کوٹھیاں تفریح بخش باغ وغیرہ کو دیکھ کر لاہور کی عظمت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھتا ہوگا مگر آپ جہانگیر اور شاہجہان کے وقت تشریف لاتے تو کچھ اور ہی بات نظر آتی - اس وقت یہ شہر یہی شہر نہ تھا جو اب نظر آتا ہے - بلکہ غور کیجئے تو

پرکہنہ مساجد۔ گنبد۔ مزار اور باغات اس بات پر دال ہیں۔ کہ شہر کا حلقہ بہت
وسیع تھا۔ اور شہر کی آبادی اتنی تھی کہ پھر اس قدر اب تک نہیں ہوئی۔ سارے
شہر کے چھتیس گزر (یعنی حصے) تھے۔ جن میں سے موجودہ شہر میں صرف نو حصے
شامل ہیں۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس وقت شہر کا دائرہ کوئی ۱۲-۱۶
میل سے کم نہ تھا۔ اور شہر کے باہر مغل پورہ۔ محلہ لنگر خانہ۔ محلہ پیر عزیز۔ محلہ عبداللہ
داری۔ نکمی محلہ۔ محلہ زین خانہ۔ گنج محلہ وغیرہ گویا فی ذاتہٖ قصبے تھے۔ جو سب
مل کر شہر کی عظمت بڑھانے تھے۔

۱۶۱۴ء میں آئین (ہسپانیہ کا ایک پادری یہاں آیا اس وقت شاہجہان
کا عہد تھا۔ اس نے جو نقشہ لاہور کا کھینچا۔ ایسا دلکش ہے۔ میں اسے ضرور یہاں
نقل کرتا۔ مگر وہ بہت طویل ہے۔ مختصراً یہ کہ شہر کی صفائی اور خوبی نے اسے
قائل کر دیا۔ ازدحام خلق۔ دوکانوں کی رونق۔ سراؤں کی کثرت اور مسجدوں
کی عظمت کا ذکر کرتا ہے۔ اس نے ایک بازار کا نقشہ کھینچا ہے۔ جس کا نام
دلکشا بازار تھا۔ اگر صحیح ہے۔ تو انارکلی کو اس حساب سے اس کا دسواں حصہ
رونق بھی نصیب نہیں ہوئی۔ اس پر اس وقت کی ارزانی کا ذکر دلچسپ ہے۔
۵ دمڑیاں سیر ہو کر دونوں وقت شاہی کھانے کھا لو۔ لذیذ کلچہ۔ روغنی روٹی۔
مرغ کا سالن۔ میوہ جات۔ غرض ہمہ نعمت موجود۔ تجارت کا یہ حال کہ بارہ
چودہ ہزار اونٹ یہاں سے ہر سال فارس و قندہار کو جاتے تھے۔ اور کیوں
نہ ہو مغلیہ راج کے زرین زمانے نے اسی شہر میں جنم لیا۔ اکبر نے اس شہر کو اپنا
پایۂ تخت بنائے رکھا۔ اور اسی زمانہ میں وہ مشہور و معروف مذہبی اور لٹریری
مناظرے ہوتے رہے جن سے اکبر کی فراخ دلی اور دانائی کا ثبوت ملتا ہے۔
لکھا ہے کہ اس قلعۂ لاہور کے اندر حکیم علی گیلانی نے ۱۵۹۳ء میں ایک

خشتہ میں زرین اور مینا کار کمرے ہیں۔ سنگ مرمر کی جالیاں جن میں سے کنارِ دریا کی خوشگوار ہوا چھن چھن کر آتی ہے۔ کھٹ بست پر پڑ کا نظارہ پیش کرتی ہیں۔ جہاں کبھی دریا بہتا تھا۔ خیال فرمائیے اُس وقت کیا لطف ہوگا۔ انہیں کمروں میں بیٹھ کر شہنشاہ اکبر اپنے مشیروں ابو الفضل۔ بیربل۔ ٹوڈرمل اور مان سنگھ وغیرہ کے ساتھ فتح کشمیر کی تدابیر سوچا کرتے تھے۔ اس جگہ منصف مزاج جہانگیر نے اپنے آرامگاہ کے اوپر سونے کا گھنٹہ لگوایا تھا۔ جس میں بذریعہ ایک طلائی زنجیر کے اسی سونے کی گھنٹیاں لگی تھیں۔ ہر مظلوم کا ہاتھ جنبش دیکر اسے بجا سکتا تھا۔ اور بلا وساطت احدے ندائے مظلوم بادشاہ کے کانوں تک پہنچا سکتا تھا۔ انہیں محلوں سے نورجہاں ہندوستان کی باگ ہاتھ میں لئے پولیٹیکل اور سوشل دانشوری کا تاج سر پر رکھے مشکل سے مشکل انتظامی گرہیں اپنے ناخن تدبیر سے وا کیا کرتی تھی۔ ہائے ایک وقت اب ہے۔ کہ وہی رشک لعبتان چین حسین مہ جبین راوی کے کنارے ایک ٹوٹی پھوٹی بارہ دری کے نیچے نیند کی بہن موت کے ساتھ گلے مل کر سو رہی ہے۔ مقام عبرت ہے ایک وہ وقت تھا کہ مخملی بستر پر اگر بل لے تو چبھنے کا احتمال تھا۔ اور ایک زمانہ اب یہ ہے کہ خشک خشت اور بوریا ہوا خاک بستر تنہا پڑی مر رہی ہے۔ اے علم و فضل کی ملکہ! اے حسن و زینت کی شان! تو جنگل ہی میں پیدا ہوئی اور اب پھر جنگل ہی میں پڑی ہے۔ وہ تیرا شاہی تاج وہ جہانگیر راج وہ شان و شکوہ۔ وہ خواصوں کا گروہ کیا ہوئے۔ اب تو ہے اور عالم تنہائی۔ کہ کمبخت شب تاب تیری گور غریباں پر رحم کھا کر یوں چلتے چلتے دمک جائے تو خیر۔ ورنہ چراغ گیا۔ اور عروج ہوا گل شب دیدہ کا پتا کہیں اڑتے اڑتے آئے تو کہہ نہیں سکتے۔ اگر تیری تربت پر پھول چڑھانے والا کون کفن چور تو ہوتے ہی ہیں۔ مگر تیرے مزار سے

انہیں جُھانے والے بھی پیدا ہو گئے۔ اُن کی نگاہوں میں تیری لوح مزار کے سنگ مرمر نے وہ کیا جو لٹیروں کی آنکھوں میں چاندی اور سونا کرتے تھے۔ تجھے اکیلا سمجھ کر شیر ہو گئے۔ انجام کار وہ بھی راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ چند دن کی بات تھی۔ اب وہ ہیں اور گمنامی یا اُن کی یادگار بدنامی۔ تیری عظمت کا سکہ ہمیشہ دلوں پر رہیگا اور جب تک تاریخ ہند موجود ہے۔ تیرا ذکر محو و ضائع نہ ہوگا۔

لاہور کی تاریخی دلچسپیاں سب کی سب بیان ہو سکیں۔ مضمون کا حق ادا ہونا محال ہو جبتک اُن عمارات ذی شان۔ مقابر عالیہ اور مساجد واسعہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ جو اُن صنادید ہند کی یادگار ہیں۔ مقبرۂ جہانگیر کا ذکر کیجیے۔ وہ سنگین سرخ دروازہ وہ نقش و نگار رشک گلشن بہار وہ سربفلک مینار۔ وہ غالیچہ ہائے رنگین بتکلف دری کے فرش وہ سبزہ زار وہ دلکشا گلزار۔ وہ راوی کا کنار غرض کس کس کا بیان ہو۔ وہ وسیع اور مربع سرائے۔ وہ آصف جاہ برادر نور جہاں وزیر جہانگیر کا مقبرہ جس کے پتھر اُتروا کر رنجیت سنگھ نے حضوری باغ میں بارہ دری بنوائی۔ وہ شاہی مسجد یعنی مسجد ابوظفر محی الدین محمد عالمگیر بادشاہ غازی وہ سربہ سنگ سرخ کے چار مینار عظمت آثار۔ گلابی باغ جس میں کبھی پھول اور میوے شاخوں پر جھومتے اور مہوشان پری رو صبح و شام گھومتے ہونگے۔ اور جسکی یادگار اب صرف وہ دلکش دروازہ ہے۔ جو شالامار والی سڑک پر ہر رہرو کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس باغ کی گذشتہ عظمت دکھلاتے بیگم پورہ کے دلاویز کھنڈرات کا حال بتلایئے۔ یا صحن گلشن بہار۔ سیرگاہ ابر بہار یعنی شالامار کے طبقات فرح بخش و فیض بخش کے اصلی فوٹو پیش کیجیے۔ ساون بھادوں کی بہار لوٹیے۔ یا خوابگاہ میں بستر جمایئے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم بہار دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

اب کوئی کیا شالامار کی سیر کریگا۔ یا جائیگا بھی تو اس باغ میں کیا دیکھیگا۔ وُہ وقت - وُہ زمانے گذر گئے۔ چاروں طرف باغ ہی باغ تھا۔ عنایت باغ۔ انگوری باغ۔ ماہتابی باغ۔ گلابی باغ۔ باغ داد اور دلکشا باغ۔ اللہ اللہ کیا چہل پہل ہوتی ہوگی۔

مقابر کا ذکر کیجئے۔ علی مردان خاں۔ انجنیران چیف بحیثیت بانیٔ شالامارؔ کا عظیم الشان مقبرہ۔ حضرت ایشاںؒ کا جلیل القدر روضہ۔ نواب بہادر خاں و نصرت خاں کے مقابر۔ جان محمد حضوریؒ و میاں میرؒ کی خانقاہیں۔ شرف النسا۔ نادرہ بیگم۔ انارکلی کا سنگ سفید کا وہ خوبصورت اور دلپذیر مقبرہ جسے جہانگیر نے تعمیر کرایا۔ وُہ خوبصورت چوبرجی۔ اور قمری گلستان شیریں بیانی - زیب النسا بیگم مخفی کا شکستہ اور کس مپرسی مزار جسکی تاریخ یوں تھی -

آہ زیب النسا بحکم قضا ناگہاں از نگاہ مخفی شد
منبع علم و فضل و حسن و جمال ہمچو یوسف بچاہ مخفی شد
سال تاریخ از خرد جستم
گفت ہاتف کہ آہ مخفی شد

غرضیکہ کس کا ذکر کریں اور کس کا نہ کریں۔ اس مختصر رقعہ پر اکتفا کر ناظرین اور شائقین تاریخ کی لالٹین ہاتھ میں لئے۔ ان کھنڈرات میں سے گذریں اور چشم حقیقت بین سے نظارہ کریں تو امکان ہے کہ گو شب تیرہ و تار ہے اور روشنی ناکافی۔ مگر پھر بھی شاید کوئی گرا پڑا ہیرا ان کے ہاتھ لگجائے +

دل احمد

کلام نسیم

سید محمد عابد جعفری صاحب نے کچھ منتخب کلام نسیم بھرت پوری مرحوم کا عنایت کیا ہے جسے ہم خوشی سے شائع کرتے ہیں۔ مرحوم پرانے رنگ کی شاعری کے اس آخری دور کے خاص آدمیوں میں تھے۔ اور انکی شاعری والی چٹکیاں لینے کے لحاظ سے اپنے استاد کی شاعری سے بہت ملتی ہے

ہے بتوں کا لب پہ کلمہ رات دن / تجھ کو اے دل کیا خدا کی مار ہے

بے طلب ملتا ہے سب کو رنج و غم / آسماں کی بھی بڑی سرکار ہے

جان گسل تھی درازیِ شب ہجر / بوسۂ کاکل بھی چارہ گر نہ ہوئی

دل بے غیرت کو بہر وصل صنم / آہ منت کش اثر نہ ہوئی

وہ عیادت کے لئے آئے ہیں / اچھی صحت سے یہ بیماری ہے

کر دیا دل کا میرے کام تمام / یہ تغافل ہے کہ ہشیاری ہے

چھوڑ سکتے نہیں تم دشمن کو / نام اس کا ہی تو ناچاری ہے

جوش پر آ کے یہ نہیں رکتا / دل مرا آپ کی جوانی ہے

دیدۂ تر سے کس طرح ڈھل جائے / اشک بھی کیا مری جوانی ہے

لذت جور و ستم لینے دو / زیر شمشیر تو دم لینے دو

جگرِ مصیبت کو رو کو نہ ابھی | بزم کا رنگ تو جم لینے دو
داستانِ شبِ غم سن لینا | سانس تھم جانے دو دم لینے دو
ٹھہرو تھم جانے کی جلدی کیا ہے | دلِ بے تاب کو تھم لینے دو

اب یہ کیوں ضد کہ وہ قصہ گیا رسیت کے ساتھ | اپنے کوچہ میں مری لاش گند جانے دے

قبول ہوتی ہے منت نہ التجا میری | یہ بت ذرا نہیں سنتے مرے خدا میری
تجھے بتائی بھی جاتی نہیں خطا میری | مجھی سے پوچھی بھی جاتی ہے پھر سزا میری

موت آتی نہیں یارب مجھے کیوں فرقت میں | چشمۂ خضر کو کیا دل میں چھپا رکھا ہے
قتل کر سامنے آ میاں سے خنجر کو نکال | یہ بھی کیا رازِ عدو ہے کہ چھپا رکھا ہے
کیوں ہیں دزدیدہ نگاہیں مرے پہلو کی طرف | تو نے باقی دلِ گم گشتہ میں کیا رکھا ہے

کبھی یارب محبت کا نتیجہ ہم بھی دیکھیں گے | کسی کو اپنے پہلو میں بیٹھا ہم بھی دیکھیں گے
قیامت بھی اب آئی جاتی ہے حضرت ضبط | تمہیں اللہ حدیں بخشیگا ہم بھی دیکھیں گے

یوں چلے حشر میں وہ تن تن کر | چھکے چھوٹ گئے قیامت کے
شمع مرقد کے بجھ گئے آنسو | رو کے وہ گرد پھر کے تربت کے

برا نہ کہیے لگے بتوں کو اے زاہد | گنہگار نہ کر واسطے خدا کے مجھے
قدم تیرے وصل جو پہلو سے چلے اٹھ کر | تو بیکسی میری روئی گلے لگا کے مجھے

مر جائیں گے تو تجھ پہ مریں گے میری جان   جئیں گے تو تیری تمنا کریں گے

نظر بہ دم نہ کریں میرے سنبھلنے کیلئے   یہ سانس کیا پائے ہیں ارمان نکلنے کیلئے

تم ہو کہ یاد بھول کے کرتے نہیں ہمیں   ہم ہیں کہ خواب میں بھی تمہارا خیال ہے
گو دل میں ذکر غیر سے ہوتی ہے گدگدی   لب پر رقیب کا نام نہیں یہ کمال ہے
مرنا تو کچھ خدا کی قسم بات ہی نہیں   جینا ہی تیرے ہجر میں ظالم محال ہے
آتا ہے کس کے دیدۂ مخمور دیکھ کر   کچھ آج تو نسیم کی مستانہ چال ہے

ذبح عصیاں سے بری حشر میں ہو زود حساب   خوش نصیب آج تو محروم کی قسمت آئی
آپ کی محفل عشرت کو نہ چھوڑا خالی   میں اگر آ نہ سکا میری شکایت آئی

گرا رہا ہے زمانہ مجھے نگاہوں سے   سنبھال مجھ کو مری بیکسی خدا کے لئے

میرے پہلو میں نہ بیٹھو کہ مجھے ہو تسکیں   ہاتھ سینہ پہ نہ رکھو کہ مرا دل ٹھہرے
مجھ کو سمجھاتے ہو اپنی نہیں لیتے ہو خبر   نگہ شوق کو روکو کہ مرا دل ٹھہرے
بات پوچھی ہے کبھی تم نے کہ بیتاب نہ ہو   ہاتھ رکھا ہے کسی دن کہ مرا دل ٹھہرے

زاہد یہ شکل اور چمن خلد کی ہوس   تو اور حور شان ہے پروردگار کی

فکر دنیا فکر عقبیٰ۔ فکر دشمن فکر دوست   یہ بکھیڑے چار دن کی زندگی کے واسطے

آسمان کے جور جنت کی ہوس دوزخ کا خوف ۔۔۔ آفتیں سی آفتیں ہیں آدمی کے واسطے

یہاں تو سو خوشی سے رات دن ارمان تھے ہیں ۔۔۔ دل بیتاب سے کیوں جل کے آہ آتشیں نکلی
کچھ اس انداز سے اونہنے لگائے وار خنجر کے ۔۔۔ کہ میں تو نیں میرے زخموں کے منہ سے آفریں نکلی

بھلا اے شیخ اتنے بخل سے حاصل ہے کیا تجھ کو ۔۔۔ نہیں ہیں ہم دہانِ ساقی کا ترا کیوں دم نکلتا ہے
رہی جاتی ہیں لاکھوں حسرتیں سر پیٹتی دل میں ۔۔۔ بپا کرتا ہوا محشر ہمارا دم نکلتا ہے
یقیں ہے یہ کہ وہ میری بالیں پہ آ بیٹھے ۔۔۔ بھلا ہم بھی تو دیکھیں ہے کیونکر دم نکلتا ہے
وہ بت جور و جفا کرتا ہے مجھ پر تجھ کو کیا ناصح ۔۔۔ تری کیوں جان جاتی ہے ترا کیوں دم نکلتا ہے
ہمارا کوچہ ہے محشر بپا ہے خانۂ تن میں ۔۔۔ گرہ سی کھینچتی ہے ہچکی لگ رہی ہے دم نکلتا ہے

میں نے اسکو برا کہا نہ کہوں ۔۔۔ اس نے اچھا مجھے کہا نہ کہے

بے سوچے ہوئے پھیر دیے تلوار گلے پر ۔۔۔ ایسا کوئی بیباک ستمگر نہیں ملتا
اللہ یہ کس شوخ نے کی مجھ سے شرارت ۔۔۔ در پہ میرے لکھا ہے ترا گھر نہیں ملتا
اک تیر کی واں نرگس قاتل میں کمی ہے ۔۔۔ یہاں ہم کو ہمارا دل مضطر نہیں ملتا

ساتھ لیکر جگر و دل ترا پیکاں نکلا ۔۔۔ کرکے سب گھر کی صفائی مرا مہماں نکلا
اس قدر رنج و غم ہجر سے گھبرایا ہوں ۔۔۔ دم بھی نکلے تو یہ جانوں مرا ارماں نکلا
دل کو پہلو سے اڑا کر نکل آنا باہر ۔۔۔ کوئی ایسا نہ ترے تیر کا پیکاں نکلا

نیم جاں ہم ہو چکے تھے اب کمپ ہوا — ترک کیا خفا ہوتے کہ زمانہ خفا ہوا
جو تاب و توان تھے گئے تمسے وقت رخصت — آیا کبھی جو سانس تو وہ بھی رکا ہوا
میں مجھ کو قتل کر کے پشیماں ناں فضول — جو ہاتھ تیغ میاں میں کہ فیصلہ تھا

لو نہیں نکلے کا مرے ارمان ہو گیا — ناصح سے بات کر کے گنہگار ہو گیا

تمہے سوا اس کے اور آپ کو کیا کرنا — اپنوں کو برا کہنا غیروں کا بھلا کرنا
کیا تم سے زیادہ ہے دنیا میں ستمگر کوئی — ایمان سے کہدینا انصاف ذرا کرنا
بوسہ بھی نہ مجھے دینا ہونٹوں میں بھی کچھ کہنا — جینے کی دوا دیکر مرنے کی دعا کرنا
جاتے ہو جو گھر جاؤ پھر وعدہ کر جاؤ — جب یاد میں آجاؤں مرنے کی دعا کرنا
قرآن میں عصیاں کے بخشش کی ہی دولت — صد شکر کہ محشر میں کام آیا خطا کرنا
ترچھی تری چتون نے لاکھوں ہی کئے بسمل — اے ترک ترا ناوک کیا جانے خطا کرنا
دل تم کو یونہی دینگے کیا عہد وفا لینگے — اب جور و جفا کرنا یا مہر و وفا کرنا

بھول کر لب پہ اگر شکوہ بیداد آیا — میں نے توبہ کی وہیں لطف ترا یاد آیا
حسرت دید دم مرگ بھی نکلی نہ ذرا — ذبح کرنے مجھے منہ پھیر کے جلاد آیا
یاد میں زلف کے میں ہو ہی چکا تھا کافر — یہ دیئے رنج بتوں نے کہ خدا یاد آیا

اتنی رحمت ساقیا اک جام پر — آج پلوا دے خدا کے نام پر
دی ہے جب ساقی نے بھر کر لطف سے — ٹوٹ کر توبہ گری ہے جام پر

نعت حمد خدا کی قسم احساں میں نہیں — جو مزا تیری نہیں میں ہے تیری ہاں میں نہیں

گرتی اشک سکھا دیتی ہے شاید اُس کو — نام کو بھی تو نمی دامنِ مژگاں میں نہیں
یہ تو دن کا ہے کھٹکا نہ گجر کا دھڑکا — یہ شبِ وصل کے جھگڑے شبِ ہجراں میں نہیں
وصل میں دستِ اجازت کا سہارا دیجے — خود نکل جائے یہ طاقت مرے ارماں میں نہیں
چاک نے دونوں کو ہمراز کیا ہے بڑھ کر — کوئی پردہ مرے داماں و گریباں میں نہیں
دل کو تھاموں کہ سنبھالوں جگرِ خستہ کو — مجھ کو مرنے کی بھی فرصت شبِ ہجراں میں نہیں
بیٹھا ہے یہ دلِ مضطر ہوا ہے غائب — وہ جو اک پیچ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں
حق ہے ہندو و مسلماں میں ہے دن رات کا فرق — رخ میں جو بات ہے وہ زلفِ پریشاں میں نہیں

نیند اُن کی مرے نالے جو اُڑا دیتے ہیں — وہ شبِ وصل عدو مجھ کو دعا دیتے ہیں
اس سلیقہ کی جفا چرخ بھلا کیا جانے — ظلم سہہ سہہ کے تجھے لوگ دعا دیتے ہیں
اپنے گھر کو سدا رہیں غیر سو جا کہہ نہیں بولیں — میری تربت پہ کیوں جیتی کا نیم بنکے ہیں
کیوں شوخی میں تو فلک کیوں بیٹ نہیں چڑھتا — وہ چپکے ہاتھ جوڑے سامنے دشمن کو بٹھا دیتے ہیں
کیا کہوں صبح مری جان پہ کیا کیا گذری — اس نے جب ناز سے شرما کے کہا جاتے ہیں

بے تاب ہیں کسی کی نگاہیں نقاب میں — ہیں بجلیاں کہ کوندرہی ہیں سحاب میں
ایسا چھپا کے شانہ کو سنکر سوالِ وصل — آئینہ رکھ دیا مرے آگے جواب میں
میری نگاہِ شوق کے شاکی وہ کیوں نہ ہوں — سو رخ پڑ گئے ہیں ہزاروں نقاب میں

حسرت نہ ہو امید نہ ہو آرزو نہ ہو — کچھ بھی نہ ہو جو دلِ بیتاب تو نہ ہو
پہلے تھیں سب یہ وہ ہزاروں ہی حسرتیں — اب ہے یہ آرزو کہ کوئی آرزو نہ ہو

سید حسن عابد جعفری (آگرہ)

رخسار صبح درخشاں، موئے لیل نہار عالم امکان۔
عفت و عصمت اُس کی سرکار پر پہرہ دینے والی، رُعب و وقار اس کی عظمت کے
گیت گانیوالی اور طریق ادب سکھانیوالی، دلبری و رعنائی اُس کی مشاطہ، تبسم ناز
آور اس کرشمہ ساز، وجدانی طرز تکلم۔ عرفانی احساس حکمت العین اس کا اندازِ بیان
عقیدہ اخفا، اس کا عشوہ ؎

دل دادہ پیامے کہ زباں محرم آن نیست　　خواہد بتو گفتن لب خاموش نگاہم

حسن کی تاثیر (دلفریبی۔ دلفروزی) سوز جگر پیدا کرنا، اور پھر اس میں بقول مرزا غالب

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا

جواد علیخاں عالی

غزل

گھر سے نکلے ہیں جنازہ وہ اُٹھانیکے لئے　　جان سے جاتے ہیں پھر قالب میں آنیکے لئے
اب تو جی بھر کے مزے میرے فنا نیکے لئے　　منتظر اب تو ہے نیند آنکھوں میں آنیکے لئے
تم رہو یا دلِ بیتاب میرے پہلو میں　　کوئی تو چاہئے دکھ درد اُٹھانیکے لئے
ہوں یہ غم دوست کہ غم کوئی نہ چھوڑا باقی　　عیش ہر چیز ہے زمانے میں بتانیکے لئے
آسماں کوچہ قاتل کی زمیں سے دن رات　　جھکا کرتا ہے مری خاک اُڑانیکے لئے
دن کہانی ہیں شبِ غم کی اب ہوتا ہے　　رات ہر روز مصیبت کے فسانیکے لئے
سخت کافر ہیں یہ بت سچ تو کہا بار غلط نہ　　حوصلہ چاہئے دل ان سے لگانیکے لئے
جان و دل کھو کے محبت نہ بلا سے چھوٹے　　اب نہ جانے کیلئے کوئی نہ آنے کے لئے
سات پردوں میں نہاں ہے حرم دل اب تک　　او بتِ پردہ نشیں تیرے چھپانیکے لئے
ایک ٹکڑا میرے افسانۂ غم کا لے لو　　واقعات قیامت کی بڑھانیکے لئے
حسن کی بزم میں روشن ہے محبت کا چراغ　　شمع جلنے کو پتنگے ہیں جلانیکے لئے
دل لگانے کی گھڑی یاد کریں کیا ثاقب　　وقت جاتا ہے تو پھر آتا نہیں آنیکے لئے

مقدس برادری

چھوٹے اخوت رفاقت ہماری
کہ وابستہ تجھ سے امیدیں ہیں ساری

کیا ہی سچا مقولہ ہے سے مردانِ خدا خدا نباشند۔ لیکن ز خدا جدا نباشند۔ الحق خدا کی زمین مردانِ خدا سے کبھی خالی نہیں رہتی۔

اس خاکسار کو جہاں جہاں پنجاب و دیگر مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جس جس ملک۔ شہر اور قصبہ یا موضع کی سیر کی۔ جہاں تک بنی نوع انسان سے تعارف ہوا کوئی نہ کوئی رکن مندرجہ عنوان برادری کا دیکھنے میں آتا ہی رہا۔

یہ مبارک مجلس مثل دیگر مجالس کے کچھ آجکل کی پیدائش نہیں ہے۔ جو حشرات الارض کی طرح دفعتہً وجود میں آتی اور موسمی کیڑوں کی مانند ہماری آنکھوں سے ناپید ہو جاتی ہیں۔ بلکہ جہاں تک بھی دنیا کی تواریخ پر نظر دوڑائی جاتی ہے۔ بلا مبالغہ جرات سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جب سے حضرت انسان حجلۂ غیب سے صفحۂ ہستی پر جلوہ افروز ہوا۔ اس وقت سے یہ برادری قائم ہے۔

یہ سوسائٹی بلحاظ اصول۔ قواعد اور ضوابط کے رُو سے ایک ہی ہمراز ایک ہی دل و دماغ کے افرادِ بشر کی چلی آئی ہے اور بقول حافظ شیرازی پیوستہ شد ایں سلسلہ تا روزِ قیامت لیکن حسب موقع اور بلحاظ ضرورتِ وقت مختلف اسماء سے موسوم ہوتی رہتی ہے۔

اس سوسائٹی کے ارکان بمصداق اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ نیچرل طور پر ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور گو کہ جسمانی

سلہ ارواحیں پہلے اکٹھی جمع تھیں۔ جن میں وہاں کی جان پہچان ہے۔ ان میں یہاں بھی محبت

حیثیت سے اکثر احباب کے فرشتہ خان کو بھی خبر نہیں ہوتی کہ ہم بھی اس برگزیدہ آفاق کمپنی میں شامل ہیں لیکن ان کی مزاجوں اور خصلتوں میں ٹھیک ٹھیک وہی کیفیت نظر آتی ہے۔ جو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بے نظیر اور دلکش مثنوی میں اس طرح پر رقم فرماتے ہیں۔

مشورت آنگہ با اخواں بود چوں فتد در شیرہ واحد بود

دیکھو۔ ہر ایک مجلس کا ایک سردار ہوتا ہے لیکن اس سوسائٹی کے سرتاج باوصف رفعت جاہ کے یہانتک خاکساری اور کسر نفسی سے کام لیتے ہیں۔ کہ لوگوں کو تو کیا پتہ و نشان ملیگا۔ اُن نفوس قدسیہ کو بذات خود بھی علم نہیں ہوتا کہ ہمارے ہی سر پر سہرا باندھا گیا ہے۔ اسی واسطے کسی اہل اللہ کا یہ شعر قابل عمل قرار دیا گیا ہے ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

اس سوسائٹی کے سکرٹریاں کو جو وقتاً فوقتاً کام کرتے چلے آئے ہیں نائبان قضا و قدر سے تشبیہ دی جاوے تو عین بجا ہے اور منتظمان کو اگر خلفائے کراماً کاتبین سے تمثیل دیجاوے تو سراسر زیبا ہے۔

اس سے مقدس اور فرشتہ خصال ارکان کی روحانی تہذیب۔ اولیا و اقطاب کے لگ بھگ گنی جاتی ہے اور جسمانی تربیت فقراء و علما سے بڑھ چڑھ کر مانی جاتی ہے۔ اس لئے کہ مولانا حالی کا جو ایک شعر ہے۔ یعنی

حیثیت انسانی تپیدن از تپ پیدا بیگانگی

وہ انہیں حضرات کے حال پر صادق آتا ہے۔ اس لئے کہ اولیا و اقطاب اور فقرا و علما تو وہی کام کرتے ہیں جس کے لئے وہ مخصوص ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خدا کے نیک بندے بیکسوں کے کس اور نراسوں کی آس ہوتے

ہیں اور قوم کے درد کو بہت کم تقسیم کرتے ہیں۔ یہ واجب التعظیم بزرگان یہی دھن کے
ایسے پکے ہوتے ہیں۔ کہ جس کام کو حسن سمجھ کر اپنے ذمہ لیا۔ اس میں ایسے محو
ہو جاتے ہیں۔ کہ یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

اگر زمانہ میں ان حضرات کا وجود باجود دنیا میں نہ ہوتا تو بنی نوع انسان
کا قوام پختہ نہ ہوتا اور شیرازہ بگڑ جاتا۔ بلکہ خدا کی زمین میں فسادِ عظیم مچا رہتا۔
یہی نازک اوقات ہیں یہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ننگ و ناموس کو خیرباد
کہکر وہ قوم اسلام سے نذر ہو کر حبِ قومی میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ مگر نہ کسی
ذاتی غرض کے لئے بلکہ نفع خلائق کے لئے اپنی جان اور مال اولاد رفقاء
وغیرہ ذاتی مفادات الگ کر کے محض اپنی درماندہ قوم کی بہتری و بہبودی میں
صرف کرنا اپنا نصب العین اور فرض ذاتی سمجھتے ہیں۔

ان کے اوصاف ذاتی میں سے ایک یہ وصف بھی ہے۔ کہ دنیا کی تعمیر
گر چالاک عقل سے زیادہ حصہ نہیں رکھتے۔ مثل مشہور ہے "اهل الجنۃ بُلْهٌ"
(بہشت کے مالک وہی ہیں جو دنیا کی عقل سے بیزار ہیں)

مولانا سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابدال در آب و آتش روند۔
چونکہ یہ لوگ بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ اس لئے گرمی۔ سردی۔ بھوک
پیاس بلکہ کسی ارضی یا سماوی دشمن کی پروا نہیں کرتے۔ میں نے غلط کہا۔
یہ لوگ کسی کو اپنا دشمن سمجھتے ہی نہیں۔ اس لئے کہ اپنے نفس امارہ پر ان کا پورا
پورا تسلط ہوتا ہے۔ مولانا روم کیا خوب فرماتے ہیں۔

نفس کشتی از رستی ز اعتذار
کس ترا دشمن نماند در دیار

کل رات میں ان خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ خواب نے مجھ پر غلبہ کیا۔

اور رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر کے عالمِ خیال کے ایسے عالیشان مکان میں جا پہنچی
جو میری حدِ نگاہ سے بھی پرے تھا۔ اور جس کی وسعت عقل و فکر اور ادراک
سے باہر تھی۔ میں نے اِدھر دیکھا اُدھر تاکا۔ کہ کوئی آدمی ملے۔ تو اس سے دریافت
کروں کہ یہ کیا مکان ہے مگر کسی کو نہ پایا۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ جو کچھ ہو سو ہو
اندر تو چلو۔ جب میں مکان کے اندر داخل ہوا تو خیال نے ایک وسیع ہال کی
طرف راہ نمائی کی جس کے در و دیوار وغیرہ سنہری رنگ سے رنگین تھے۔
قدرت نے انکو ایسا رنگ دیا تھا۔ کہ جب آفتاب کی شعاعیں اُن پر پڑتی
تھیں تو ایسی چمکتی تھیں جن سے آنکھوں کو چکاچوند ہو جاتا تھا۔ منقش سقف
کے ساتھ جھاڑ اور فانوس اور نفیس قندیلوں کا جو عالم تھا۔ بیان میں نہیں
آ سکتا۔ اس دلاویز کمرہ میں زرّین و سیمین جا بجا الماریوں میں مجلّد مُطلّا کتابوں کی
قطاریں۔ جو ایک ہی وضع قطع اور حجم کی معلوم ہوتی تھیں۔ اس افراط سے قرینہ
رکھی ہوئی تھیں۔ کہ عقل و فکر اُن کے شمار سے عاجز تھے۔ کمرہ کے عین وسط
میں ایک نہایت خوبصورت گول میز بچھی ہوئی تھی جو سبز مخمل سے منڈھی
ہوئی تھی۔ اور جس پر ایک مُطلّا سرخ رنگ کی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ میز والی کتاب
کے سرورق پر بحروفِ جلی عربی میں کچھ لکھا تھا اور سنہ [illegible] مرقوم تھا۔ شاید اسی سنہ
سے یہ کتاب شروع ہوئی ہوگی۔ مغربی (یورپی) تہذیب و مذاق کے رو سے میرا کوئی حق
نہ تھا کہ اس کتاب کو پڑھتا تو بجائے خود میں ہاتھ بھی لگا سکتا۔ مگر چونکہ اس قسم کی تہذیب
اوائل عمر میں مجھکو کسی نے نہیں سکھائی۔ اس لئے فرطِ شوق سے میں نے اسکو کھولا اور
ورق گردانی شروع کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسمیں بڑے بڑے لوگوں کے نام درج ہیں جو قومی محسن
ہو گذرے۔ کئی ایسے نام بھی دیکھنے میں آئے جن کے کیرکٹر شیٹ (خلاصہ کیفیت) میں اس قسم کے ریمارک تحریر تھے مثلاً
اول۔ ملاء الاعلیٰ کی سیر کر رہا ہے۔

دوم۔ خدا کے جوار رحمت میں جگہ پائی۔
سوم۔ خدا اس پر راضی اور یہ خدا پر راضی۔
چہارم۔ اس کے حق میں ملائکہ دعائے مغفرت کر رہے ہیں۔
پنجم۔ خدا کی برکات جب تک زندہ رہے اور جب وفات پائے۔
لیکن چند اشخاص کے نامۂ کیفیت میں اس قسم کے فقرات پڑھنے میں آئے۔
ششم۔ زمانہ نے اس کو قومی کاموں میں تھکا دیا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ تا ابد اس پر اپنی رحمت کا مینہ برسانے سے نہیں تھکے گا۔
ہفتم۔ مخلوقات خدا کے لیے اس کا وجود رحمت اور برکت تھا۔ وغیرہ وغیرہ
اول۔ بیہودہ چالوں سے ملک و قوم کو دھوکا دینے کے پاداش میں رجسٹر سے خارج کیا گیا۔
دوم۔ وعدہ خلافی کے باعث پابدست دگرے دست بدست دگرے۔ ہاویہ میں گرایا گیا۔
سوم۔ قومی اور ملکی کاموں میں تساہل اور غفلت ورزی کے باعث ابھی تک عالم برزخ میں ہے۔ خدا جانے اس کا کیا حشر ہو۔
چہارم۔ بے درجہ کا بخیل اور خسیس ہو گیا تھا۔ اس لئے نہایت ذلت کے ساتھ مقدس برادری سے نکالا گیا۔
پنجم۔ اوائل میں نیک دل تھا۔ مگر سرکاری عہدہ ملنے کی بدولت قوم کا خون چوسنا اور یتیموں کا حق تلف کرنا شروع کیا۔ اس لئے سقر میں جلایا گیا۔
ششم۔ دولت خداداد اسراف اور تبذیر میں اڑائی۔ بنی نوع انسان کا اس پر کچھ حق نہ جانا۔ اس لئے کالے سانپوں والے کنوئیں میں گرایا گیا۔ جو

اُس کو ہر وقت ڈس رہے ہیں۔

ہفتم۔ خدا کے دیئے ہوئے مال و دولت سے قومی درسگاہوں اور مسجدوں وغیرہ میں روپیہ عطا کرنے کا وعدہ کیا مگر بوقت تقاضا منکر ہو گیا۔ اس لئے کھولتے ہوئے پانی میں ڈالا گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

غرضکہ بڑے بڑے مشہور و معروف نام پڑھے گئے اور ان کی اس قسم کی کیفیت پڑھنے سے جو میرے دل کی حالت تھی کچھ نہ پوچھو۔ فی الواقع بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس کتاب کے آخری حصہ پر جو میری نگاہ پڑی تو عجیب و غریب نئے نئے اندراج دیکھنے میں آئے۔ ان ناموں میں سے بعض تو صرف جلی حروف میں خوشخط لکھے ہوئے تھے لیکن بعض اسی انداز قلم سے سنہری حروف میں جن کی کیفیت میں لکھا ہوا تھا۔ قومی کاموں کی تکمیل میں راتوں کو دن بنا رہے ہیں۔ ان ناموں کو جنہیں میں جانتا ہوں، پڑھ کر مجھے جو فرحت و انبساط حاصل ہوئی بیان سے باہر ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ واقعی یہ لوگ مبارک ہیں اور اس کتاب میں کیسے عزت کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔

مگر اس خوشی کا نشہ آناً فاناً ہرن ہو گیا۔ اور مجھ کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے جب کہ چند مہیب اور خوفناک شکل سپاہیوں میں میں نے اپنے تئیں گھرا ہوا دیکھا جن کی آنکھوں سے خون اتر رہا تھا۔ ان میں سے دو شخصوں نے میرے دونوں بازو نہایت زور سے پکڑ لئے۔ اور کشاں کشاں ایک عالیشان چبوترہ کی طرف لے چلے۔ جب وہاں پہنچے تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ ایک بھاری بھرکم گورا چٹا سفید ریش شخص مسند پر تکیہ لگائے بیٹھا ہے۔ غالباً یہی شخص اس سرزمین کا گورنر ہو گا۔ جب ان ہولناک آفتوں (سپاہیوں) نے مجھ کو اس حاکم کے حضور میں پیش کیا۔ تو ہیبت کے مارے میری جان خشک ہو گئی۔ میں

رحم حاکم نے جس کے نورانی چہرہ پر انوار برس رہے تھے۔ جلال کے عالم میں میرا نام و نشان پوچھا۔ تو میں نے دبی زبان سے نہایت ادب کے ساتھ اپنا نام بتایا پہلے تو وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے اور بہت دیر کے بعد نرمی سے یوں میری طرف خطاب کیا۔

حاکم بلا اجازت ہماری انجمن کی کتاب تم نے کس لئے کھول کر پڑھی ؟

راقم۔ مجھ سے خطا ہوگئی۔ قصور معاف ہو۔ الانسانُ مُرکبٌ مِنَ الخطاءِ والنسیان

حاکم۔ چونکہ یہ تمہارا پہلا قصور ہے۔ اور کسی قدر تمہاری خدمات کا بھی لحاظ ہے۔ اور ابھی ایک بڑے رتبہ کے شخص نے تمہارے حالات بھی ہمارے سامنے بیان کر دیئے ہیں۔ اس لئے اس شرط پر تمہیں معاف کیا جاتا ہے کہ تم حلف کے ساتھ آئندہ کے لئے عہد کرو کہ جس قدر اندراج تم نے ہماری کتاب میں دیکھے ہیں کسی کے سامنے انکا اظہار نہ کرو۔ گو کہ وہ تمہارا کیسا ہی عزیز سے عزیز ہو۔ یا دوست سے دوست۔ ورنہ ابھی سے تمہاری زبان کاٹنے کا حکم دیا جاویگا

راقم۔ صدق دل سے اقرار کرتا ہوں۔ کہ ہرگز ہرگز ایسا نہ کرونگا۔ مگر جو بزرگان انتقال فرما گئے ہیں کیا ان کے ناموں کے اظہار کی بھی ممانعت ہے ؟

حاکم۔ ہاں۔ بے ضرورت چنیں خطا باشد۔ گر ضرورت بود روا باشد۔ تاہم حتی المقدور یہی کوشش کرو۔ کہ کسی کا نام زبان پر نہ آوے۔ بہت سی نیکیاں ایسی ہوتی ہیں کہ آخر کار اکارت ہو جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے ممکن ہے کہ کسی کو خدا تعالیٰ اخیر عمر میں نیک ہدایت کر دے۔ اور اس کا خاتمہ بالخیر ہو۔ کیا عجب ہے کہ وہ لوگ اب بھی صدق دل سے توبہ کریں۔ اور قومی کاموں میں امداد دینے لگیں۔ اور خدا کے ہاں توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ رباعی

بازآ بازآ ہر آنچہ ہستی بازآ گر کافر و گبر و بت پرستی بازآ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی بازآ

راقم! حضور کے خلقِ کریم اور شفقتِ عظیم کو دیکھ کر مجھے جرأت ہوئی ہے کہ اس عالیشان مکان کا نام جناب سے دریافت کروں۔

حاکم۔ اپنی خوش نصیبی اسی میں سمجھو۔ کہ تمہیں بری کر دیا گیا ہے۔ جاؤ جس کام میں لگے ہو اس کو کئے جاؤ۔

ابھی سلسلہ کلام یہیں تک پہنچا تھا۔ کہ ایک دوست نے مجھ کو جگا دیا کہ صبح ہو گئی اور کب تک سوتے رہو گے۔ اور میری نیند کھل گئی۔

ضروریات سے فراغت پا کر ایک بزرگ دوست کے سامنے میں نے یہ خواب بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تم بڑے خوش نصیب آدمی ہو جو مقدس برادران کی سوسائٹی کی سیر کر آئے۔ اور باوجود ان کا مجرم اس عادل حاکم نے تمہیں معاف بھی کر دیا۔ اس خواب کو لوگوں کے سامنے پیش کرو کہ انکو عبرت ہو اور خدا سے ڈر کر قومی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔

نا انصاف ہیں وہ بعضے لوگ جو مقدس برادران کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور ان لوگوں پر تو صد افسوس ہے۔ جو اوّل میں ہیچ سے ہیچ تھے۔ لیکن قوم کا سچا درد رکھنے اور علمی طور پر امداد دینے سے انکو مقدس برادری میں جگہ ملی۔ خدا نے اپنے فضل و کرم سے انکو جاہ و ثروت سے خوش حال اور دولت و مال سے مالا مال کیا تو اب انکی طبائع میں کسی قدر رعونت، تکبر اور غرور سمایا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان حضرات کو اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ غرور، تکبر، شیخی اور تعلی شیوہ انسانیت سے بہت بعید ہے۔

اگر کسی شخص میں تمام اوصاف حسنہ پائے جاویں۔ اور صرف غرور و تکبر کا شائبہ بھی اسکی مزاج میں ہو۔ تو اس کی خیر نہیں ہے۔ چہ جائے کہ مقدس برادری سے متنفر ہو۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ برادرہڈ کے اصولوں سے ایک اصل یہ بھی رکھی گئی ہے کہ خاکساری سے ہر وقت کام لیا جاوے۔ عمر خیام نے اس اصول کو ایک رباعی کی شکل میں یوں لکھا ہے۔ رباعی

در راہ چناں رو کہ سلامت نکنند ۔۔۔ باخلق چناں زی کہ قیامت نکنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا ۔۔۔ در پیش نخوانند و امامت نکنند

یہی تو وجہ معلوم ہوتی ہے کہ مقدس برادران کو نہ کسی سرکاری خطاب کی ضرورت رہی۔ نہ خلق خدا سے داد کی ہوس۔ نہ وہ کسی عہدہ کے خواہشمند ہیں۔ نہ مال و دولت کے دیوانے۔ گو کہ یہ سب کچھ خود بخود انکو ملتا رہتا ہے۔ اور منظور ہی کرنا پڑتا ہے وہ عالم گمنامی کو ہزار نام پر ترجیح دیتے ہیں لیکن قدرتی قاعدہ ہے کہ نیکوئی کو جہاں تک چھپایا جاتے۔ اتنی ہی زیادہ مشہور ہوتی ہے۔ جس حقارت سے عوام کالانعام انکو دیکھتے ہیں وہ اسکو دنیا کی ہزار عزت پر فوقیت دیتے ہیں۔

الغرض مقدس برادری کی مجلس کے قواعد و ضوابط۔ دنیا بھر کی انجمنوں سوسائٹیوں کانفرنسوں وغیرہ سے نرالے اور الگ تھلگ ہیں۔ اور کوئی شخص بتکلف تصنع یا کسی کی سفارش سے اس مقدس سلسلہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ خواہ نام و نمود کے لئے ہزار کوشش کرے۔ ہاں صرف ایک ہی عمل ہے۔ کہ نہایت اخلاص سے قومی خدمت اختیار کرے۔ اور یہ اسی شخص سے ہو سکتا ہے۔ جس کے مزاج میں اس واہب العطایا نے رحم۔ ہمدردی۔ فیض۔ ایثار۔ اور ہر ایک قسم کی نیکی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔

افسوس ہے کہ راقم کو زبان کاٹے جانے کا ڈر ہے ورنہ مقدس برادران کے

اسمائے گرامی جو میرے لوحِ دل پر نقش ہو چکے ہیں۔ نام بنام اِس مقام پر ظاہر کرتا۔ یار لوگوں نے اِن مقدس بزرگوں کو کن کن ناموں سے نامزد کیا اور کن کن خطابوں سے مخاطب کیا۔ شاید ہجو و مذمت۔ بلکہ سب و شتم کا بھی کوئی ایسا لفظ باقی نہ رہ گیا ہوگا۔ جو اِن بزرگان کی شان میں کہا نہ گیا ہو مگر کیا ان احباب نے ایسے الفاظ کی کچھ بھی پرواہ کی۔ اور توفیق کا دل میں جو ان کو توغل تھا۔ اس میں کمی کی؟ کیا کبھی عالمِ خواب میں بھی وہ ملامت گر سے ڈرے؟ بلکہ جاں بحق تسلیم کرتے وقت بھی اُن کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ یَا لَیْتَ قَوْمِی یَعْلَمُونَ ؎

راز دار

غزل

(از سید کاظم حسین صاحب آرف لکھنوی)

شبِ فراق میں صبر و قرار مشکل ہے — دل و جگر پہ ذرا اختیار مشکل ہے
میں عرض کروں بار بار مشکل ہے — وہ دردِ دل کا کریں اعتبار مشکل ہے
وفائے زندگیِ مستعار مشکل ہے — ہم آنکھ حسن کی دیکھیں بہار مشکل ہے
چڑھا ہے نشہ مجھے چشمِ مستِ ساقی کا — تمام عمر اب اس کا اتار مشکل ہے
تمہارے ظلم و ستم کا حساب کیونکر ہو — کہ داغہائے جگر کا شمار مشکل ہے
کسی کی چشمِ فسوں ساز کی ہو عاشقِ زار — گھٹے یہ گردشِ لیل و نہار مشکل ہے
ادا پسند نہیں انکو پاس پہلو کی — کریں وہ سیرِ دلِ داغدار مشکل ہے
بڑھی ہوئی ہیں تلوّن مزاجیاں اسکی — وہ میرے غم میں رہے سوگوار مشکل ہے
اندھیرا راستہ روکے ہے آنیوالے کا — اجل بھی آ سکے شبِ انتظار مشکل ہے
ابھی سے چال ہے کچھ نامہ بر کی بگڑی ہوئی — کہے یہ اُن سے مرا حالِ زار مشکل ہے
وہ میری قبر سے دامن بچا کے لاکھ چلیں — گرے نہ اُڑ کے قدم پر غبار مشکل ہے
یہ کہہ کے پھیر دیا اس ستم شعار نے ہاتھ — پرائے دل پہ ہمیں اختیار مشکل ہے
نہ تازگی ہے نہ جدت نہ کوئی بات آرف — ترا کلام رہے یادگار مشکل ہے

وُہ

بہ رہا ہے اُٹھنے والی موج بن کے ندی میں جو
ہو رہا ہے جنگلوں کے ہر گوشے میں رواں

گود میں تاروں کی جو لیٹا ہوا ہے رات کو
چاندنی ٹھنڈی زمیں پر سو رہا ہے بے خبر

کھیلتا پھرتا ہے ریگستان میں ذروں کے ساتھ
اُڑتا پھرتا ہے بگولے ساتھ اٹھلاتا ہوا

جو مسامات بدن کی چھیڑا کرتا ہے کبھی
دوڑتا پھرتا ہے خوں کے ساتھ ہر ہر رگ میں جو

جو نمو بن کے آیا ہے نخلِ نو کے ہر کا
جسمِ انساں کیلئے ہے باعثِ بالیدگی

تھیجتے پھرتے ہیں لب جسکے ہلکے ہونٹوں پہ
پتیوں میں پھولوں کی لیٹا ہے جو محشر خرام

جسکی دونوں آنکھیں صبح کی طرح پرنور ہیں
منطقات حارہ اور باردہ ہے جسکا گھر

جلوہ زار کہکشاں جس کی تفریح گاہ بن
ذوق محویت نظر آتا ہے جس پر محو ذوق

کر رہا ہے جو سنہری بادلوں میں شور و غل
پانی کی بوندوں میں چھپ کر جو زمیں پہ آ رہا

رہنما ہے جو ہمارے حسیاتِ شوق کا
جو ہمارے التیامِ فکر و آرا کا ہے خضر

جو کہ اک عکسِ تخیل ہے خیالِ نور کا
جو کہ ہے نازک تریں آوازوں کی بھر پور گونج

جسکو کہہ سکتے ہیں ہم اک پرتوِ موجِ لطیف
جسکو کہہ سکتے ہیں ہم اک رہبرِ عقلِ سلیم

یہ ہے وہ قوت کہ جو معمورۂ ادراک تھا
نقطۂ موہوم سے ہٹ کر کبھی چلتی نہیں

ہو نہیں سکتی کبھی اندازۂ مقیاس میں
ہو نہیں سکتی فضائے حسیہ میں جلوہ گر

قیصر (اڈیٹر رسالہ الحاج)

پیغامِ درد

کوئی ہو پیش سرفروش، نقدِ جاں لٹائے جا
جذبۂ کمالِ شوق دہر کو دکھائے جا

محفلِ جہاں کو ہی غرض نشاطِ دل سے کیا!
رنگ تو یہاں گداز و سوز کا جمائے جا

ہے سرودِ غم ربابِ دل کے تار تار میں
ساز یہ بجائے جا، راگ یہ سنائے جا

بے قیام زندگی جو برقِ اضطراب ہے
بے خبر کو کر خبر کہ خود جاں جلائے جا

خواب ہے دلیلِ مرگ وادیٔ حیات میں
کارواں کو ٹک ذرا تو یہ سخن سنائے جا

کشمکش گہِ جہاں کے ہیں مزے چشیدنی
تو بھی جاندار ہے، جاں نثار اٹھائے جا

خیمہ ہو وہیں جو فتح پر تری نظر ہے گر
ناکسوں کو راہ سے ہٹائے جا، گرائے جا

کچھ ہوئی جو پنجہ سے ہار اس دل میں لا نہیں
تازہ تگ سے رخش کو بڑھائے جا بڑھائے جا

وسوسوں کے دیو ہوں ہزار تیری راہ میں
نعرۂ صفورِ لا الٰہ سے انہیں بھگائے جا

سختیٔ حرارتِ مصافِ زندگی ہے کیا؟
تو بھی سخت جان بن سختیاں اٹھائے جا

میکشانِ بزمِ راز رات تھے یہ کہہ رہے
میکشی تو کر نہ گریہ ہاؤ ہو مچائے جا

اے کہ گنجِ عافیت میں تیری بود و باش ہے
عرصۂ بلا میں آ، زور آزمائے جا

مرصرِ جہاں کو یہ باغباں کا حکم ہے
ناتواں درخت کو بچائے جا بچائے جا

دل ہے منزلِ محبت، نہ کاوشوں کا گھر
اٹھ اور عمرو زید و بکر کو گلے ملائے جا

ور نہیں رزم نہیں خطر کسی کا گر نہیں
جب تلک کہ بچ سکے اکڑ کے حق جتائے جا

دردِ عاشقِ جگر، جگر فدائے درد ہو
نغمہ ہائے درد اہلِ بزم کو سنائے جا

گوش نیستاں ہیں نہ بغداد و قرطبہ
سرزمینِ ہند میں بنائے جا بنائے جا

رنگِ نہالِ آرزو میں باغباں کا خون ہے
خوں نہیں تو اس خنجر کو آب ہی پلائے جا

سعد [illegible] مرحوم

نامہ اہلِ ہنود کے ہیں لوحِ روزگار پر — ہو سکے تو نام ان کا آپ ہند لکھاتے جا

نکتہ حاصلِ حیات ہے مطلعِ سوختن

آہِ نالہ پاش سے دل و جگر جلاتے جا

غلام محمد طور بی-اے اسسٹنٹ ایڈیٹر آبزرور لاہور

مطلعِ فجر

رات ہے اور نیند راحت لے رہی ہے کائنات — غافلوں کی پاسبانی کر رہی ہے حق کی ذات

چاند نے دنیا کو دھو ڈالا ہے موجِ نور سے — اپنے جلوے کا تماشا کر رہا ہے دور سے

سچ بتا اے چاندنی کس شوخ سے سیکھی ادا — آپ ہی حسن آپ ہی اپنا تماشائی ہوا

گوشہ ہائے برگ سے شبنم ملا کر اشک میں — تارے ٹپکاتے ہیں پھولوں کے دہانِ خشک میں

رات نے کچھ ایسی مے پلوائی افیوں ڈالکر — تازہ غم بھی زخمِ دل سے ہوگیا ہے بیخبر

نیند سرہانے کھڑی ہے شاد کے ناشاد کے — پیش کرتی ہے نظارے ملکِ خواب آباد کے

چاند نے بھی آج پی لی ہے کہ آئی منہ پہ کف — ہلکا ہلکا پھر رہا ہے آسماں پر اک طرف

رات کی گاڑی کے پہیوں کی صدا اٹھ کر — شور کرتا ہے سگِ کو صوتِ نامانوس پر

آبشاروں کے گلے پر ہاں قعدا نو قیا — سُن رہی ہے حور شوق سے گلبانگ وہ دیتا

گھاس پر جنگل کی پریاں ناچتی ہیں ایک ساتھ — ہاتھ میں ہر ایک لیکر اپنے ہمراہی کا ہاتھ

اب جو کچھ سوجھا انہیں وہ اڑ کے سوئے آسماں — ہو مقابل چاند کے پھیلا دیئے پر ناگہاں

ان کی اس شوخی سے دھندلا ہوگیا نورِ قمر — اس کو ناداں آدمی بادل سمجھتا ہے مگر

عالمِ سفلی سے اب شاعر کے اس شہپرِ خیال — اڑ کے پہنچے ہیں سرِ ہنگامۂ حسن و جمال

دکھائی تیرہ روزی نے سحر میں شام کی صورت

تحیر ہے کہ ہم کیونکر رکیں آنسو بہانے سے / کہاں تک بند کر لیں کان ہم اپنے فسانے سے

زمانے کے ورق پر کیوں اک حرفِ غلط ہیں ہم / نہ کیا کہ کلکِ دوراں کرے اسکے مٹانے سے

نکل کر دل سے نالے ہیں رستے دِل کو جاتے ہیں / نہ یوں ہوں بجلیاں پیدا کسی کے آشیانے سے

نصیبا آہ سویا بھی تو کیا دل کھول کر سویا / فغاں بھی حیف عاجز ہو گئی اسکے جگانے سے

ہمیں سوزِ مصیبت پھونک دیگا خاک کر دیگا / یہ آتش باز رہ سکتی نہیں ہرگز بجھانے سے

بنا لیں کاش کے بگڑی ہوئی تقدیر کو ہم بھی / کہ سنبھلتے ہیں کتنے روٹھنے والے منانے سے

جہالت ہو ہمارے واسطے سرمایۂ آفت / کہ ہم معذور ہیں اب حالِ دل اپنا سنانے سے

صلاحیت بجز تعلیم پیدا ہو نہیں سکتی / کبھی غلبہ نہیں ہوتا کسی کو غل مچانے سے

شکایت ہو اگر ہم کو تو ناجائز شکایت ہے / توقع کام کی رکھتے ہیں ہم باتیں بنانے سے

عبث مشکل نظر آتا ہے ہم کو سیکھنا پڑھنا / زباں انساں کی طوطے سیکھ جاتے ہیں پڑھانے سے

اگر اس وقت سے تعلیم ہم میں عام ہو جائے
تو ممکن ہے کہ پھر آغاز سا انجام ہو جائے

اگر اسلاف کے بھولے فسانے یاد کرتے ہیں / فغاں پر ہم فغاں فریاد پر فریاد کرتے ہیں

نظر پڑتی ہے اپنی جب پرانے کارناموں پر / نئی اک طرزِ غم اس وقت ہم ایجاد کرتے ہیں

نہ کیوں راحت سے یوں ہاتھوں پہ رکھ کر ہاتھ ہم بیٹھیں / ہمیں صبر و قناعت بس یہی ارشاد کرتے ہیں

الٰہی جوش پیدا ہو کہیں خونِ حمیت میں / ہمیشہ ہم تری رحمت سے استمداد کرتے ہیں

جہالت کی اسیری سے رہا کر دے کریم ان سے / غلاموں کو سدا اہلِ کرم آزاد کرتے ہیں

حریفوں کو حصولِ علم ہے اور ہم کہ محروم / وہ خود آباد ہو ہو کر ہمیں برباد کرتے ہیں

سمجھنا چاہیے اتنا تو ہم کو آہ اے عاصی / کہ عبرت کے سبق کو ہم کہاں تک یاد کرتے ہیں

فغاں فریاد کر لے دل کہ بختِ خفتگاں جاگے

اسی بانگِ درا سے کاش اپنا کارواں جاگے

غلام جیلانی عاصی مینائی
از امرتسر

خطِ منظوم

سادہ کاغذ ہے تصور کا مرا — اور قلم ہے شاخِ نخلِ درد کا
روشنائی دُودِ آہِ نارسا — حرف چھالا زخمِ دل کا بن گیا
ہے عوض پانی کے اشکِ چشمِ تر — اور دوات اپنی ہے ناسورِ جگر
نامہ بر اپنا ہے جذبِ دل مرا — اشتیاقِ دیدِ رُخ ہے رہنما
خط میں لکھوں شکوۂ تقدیر میں — یا غمِ دوری کروں تحریر میں
یا گلہ نامہربانی کا کروں — بیکسی ہائے تمنا یا لکھوں
یا کروں بیتابیٔ اُلفت بیاں — یا رقم ہو دردِ دل کی داستاں
بے قراری یا لکھوں فرقت کی — یا دلِ مایوس کی بیچارگی
لکھتے لکھتے ہوک اک دل میں اٹھی — یاد آئی صحبتِ دیرینہ کی
پھر گیا آنکھوں میں اک پیارا سماں — ہائے وہ راتیں کہاں وہ دن کہاں
بھولتے اب تک نہیں ہیں وہ مجھے — بے تکلف عیش و عشرت کے مزے
بخت تھا میرا رسا صبح و مسا — آسماں سے شکوۂ قسمت نہ تھا
ناز تھا اپنے مقدر پر مجھے — بے خبر تھا انقلابِ دہر سے
دل کو حاصل تھا ترا لطفِ وصال — اور آنکھیں تھیں مری محوِ جمال
شب براتیں رات تھیں دن عید تھے — عمر کٹتی تھی نہایت چین سے
محفلِ رنگیں کی وہ نیرنگیاں — اور اس کی نت نئی دلچسپیاں

یاد ہیں وہ ساری باتیں پُر فریب — کس طرح دل ہو نہ میرا ناشکیب
ہائے کیا میرے مقدر سو گئے — وہ مزے خواب پریشاں ہو گئے
رنج فرقت کی کڑی سہتا ہوں اب — وقفِ غم صبح و مسا رہتا ہوں اب
بس الٰہی کہ تم رہتے نہیں — زار و لاچار ہے جانِ حزیں
بے وفائی کی ادائی قہر ہے — اور یہ بے اعتنائی قہر ہے
لے کے دل ہائے یہ مجھ سے جفی — دلبری کی۔ تم نے دلداری نہ کی
آرزوئیں حسرتیں ہونے لگیں — کوئی امیدِ سکوں دل میں نہیں
دید کو آنکھیں ترستی ہیں مری — دل میں باقی حسرتیں ہیں وصل کی
گاہے از راہِ کرم آؤ یہاں — یا کبھی مجھ کو بلا بھیجو وہاں

بہرِ تسکیں لکھ کے بھیجو مجھ کو خط
التجا عنبر کی ہے یہ اور فقط

نورالدین عنبر

اُصولِ ثلاثہ

لوگ وحشی ہیں جو دنیا میں ہے اُن کا آئین — اسکو کہتے ہیں عقلمند اصولِ سنگیں
جو بدی ساتھ تمہارے کرے اس دنیا میں — تم بدی اُس سے کرو اس کے عوض کچھ نہیں

ہے اصول اُن کا جو کہلاتے ہیں بنانی جہاں — لوگ کہتے ہیں اسے ہے یہ اصولِ سیمیں
گر کوئی ساتھ تمہارے کرے نیکی تو ضرور — تم بھی نیکی کرو ساتھ اس کے ہے یہ تحسیں

ہے اصولِ اُن کا جو کہلاتے ہیں مردانِ خدا — ہے بجا گر کہیں ہم اسکو اصولِ زریں

گر بدی ساتھ تمہارے کوئی دنیا میں کرے — تم عوض میں کرو نیکی بوقار و تمکین

مرد حق نیک کہے جانیکا حق رکھتا ہے — خود غرض ابنِ جہاں ہو تو ہو وحشی و کمینہ
وحشی و ابنِ جہاں سے بھی مگر بد تر ہے — جو بدی کرتا ہے نیکی کے عوض مرد کمینہ

(ماخوذ از انگریزی) (صدر الدین صدر از قصور)

ترانۂ حمد

بجز ترے مرے دل میں کوئی سما نہ سکا — بہ قرب پھر بھی ترا کوئی بھید پا نہ سکا
میں کس زبان میں سکت ہے کہ حمد لکھوں — کہ ایک نقطہ ترے مرتبہ کا پا نہ سکا
جو تیری مدح سرائی کی فکر کی میں نے — زباں گنگ ہوئی خامہ لب ہلا نہ سکا
کوئی جہان میں تیرا نہیں شبیہ و نظیر — تری مثال کسی کو کوئی بتا نہ سکا
کچھ ایسے تیرے کرم نے مرے بھرے ہیں کان — کہ شورِ آتشِ دوزخ کا بھی ڈرا نہ سکا
تو ہے وہ قادر قیوم جس نے سمجھا ہے — بجز ترے وہ کسی کو خدا بتا نہ سکا
ہر ایک وصف ترا اے خدا ہے وحدانی — کہ ایک کو بھی میں الفاظ میں لکھا نہ سکا
ہر اک ہے محو تماشائے قدرتِ قادر — پر آج تک وہ کسی کی سمجھ میں آ نہ سکا

اثیم نے جو ترا نام سن لیا ہے کریم
خوشی سے پھول گیا جامہ میں سما نہ سکا

سید شریف الحسن

رُباعیات

دیکھا نہیں آنکھوں سے پہ مانا تجھ کو سب کہتے ہیں معبودِ زمانہ تجھ کو
سمجھا بھی تو یہ کہ کچھ نہ سمجھا تجھ کو جانا بھی تو یہ کہ کچھ نہ جانا تجھ کو

وہ ذات مُنزّہ جو ہے آب و گِل سے خلوت سے جُدا ہے نہ الگ محفل سے
نام آتا ہے پردے سے۔ ہاں پرستا کر رہتا ہے کہاں؟ پُوچھ یہ میرے دل سے

گھر کر گئی سینے میں محبت تیری ممکن نہیں دیکھوں جو نہ صورت تیری
پتھر کی لکیر مٹ سکے گی نہ کبھی کچھ کھیل خدایا نہیں اُلفت تیری

آنکھوں سے نہاں نہیں ہے تنویر تری خود آئینۂ دل میں ہے تصویر تری
ہے لیل و نہار سے عیاں جلوہ ترا عارض ہے وُہ۔ یہ زلفِ گرہ گیر تری

پردے میں تو اک نمود کی ہے تصویر اور غیب میں اک شہود کی ہے تصویر
ہوتا نہ اگر تو۔ تو نہ ہوتی ہستی یہ دہر ترے وجود کی ہے تصویر

ہر شے میں ہے نُور جلوہ گستر تیرا ادراک میں آتا نہیں جوہر تیرا
ڈالا ہے تحیّر میں کرشموں نے ترے دیدار ہو آہ! کیا میسّر تیرا

جھکتا ہوا سر فرو سرفراز ہوا — گم کر کے خودی کو ترا ہمراز ہوا
پردے میں تو بے نیاز یوں ہی نہ رہا — دل میرا ترا جلوہ گہِ ناز ہوا

خورشید درخشاں میں جھلک تیری ہے — اور گوہرِ لامع میں دمک تیری ہے
ہیں کون و مکاں نور سے تیرے پُرنور — ہر ذرّۂ تاباں میں چمک تیری ہے

پیارے لال شاکر میرٹھی

کلام

(حضرت تمنا عمادی پھلواروی عظیم آبادی)

حمد

خدا کا شکر بسم اللہ سرنامہ ہے دیواں کا — سرِ دیوان نے رکھا ہے سر پر تاج قرآں کا
نمایاں نقطے نقطے سے ہے جلوہ نورِ یزداں کا — بنا ہے مطلعِ انوار مطلع اپنے دیواں کا
تری توحید کے اسرار پھیلیں کیوں نہ بو ہو کر — زباں بن بن کے کہتا ہے ہر اک پتا گلستاں کا
اناالحق صورتِ منصور ہر ذرے کے لب پر ہے — کوئی دیکھے عیاں ہونا ترے اسرارِ پنہاں کا
ہو المعشوق للعشاق لا معشوق الا ہو — دمِ وحشت یہ نعرہ ہے مری چاکِ گریباں کا
ترے میخانۂ الفت کے در پر میں بھی آیا ہوں — ادھر بھی دستِ قدرت سے بڑھا اک جام عرفاں کا
یہ ممکن ہے کہ رہ کر حشر میں بھی جائے دوزخ میں؟ — جو کوئی آسرا رکھتا ہوں تیرے عفو و غفراں کا
خدا غفار ہے تم تھرتھراتے کیوں ہو محشر میں — تمنا اے معاذ اللہ! ایسا خوف عصیاں کا

نعت

بڑھا سودا اگر اس شاہ کی زلفِ معنبر کا
گریباں اپنے ہاتھوں چاک ہوگا صبحِ محشر کا

میری جو بیت ہے تصویر ہے ابروئے حضرت کی
میرا ہر شعر ہے گویا مرقع ہے پیمبر کا

وہ جب چاہیں ہے میری قسمت میں اگر ہو بد
ہے تیرے دستِ قدرت میں بدل دینا مقدر کا

مدد کے فضل سے نانِ جویں روزانہ کھاتا ہوں
بنایا مفلسی نے متبع مجھکو پیمبر کا

خدا بخشی گئی جنت ملی یہ تھے کرم تیرے
ملے اب داورِ محشر صلا نعتِ پیمبر کا

نسیمِ صبح آتی ہے چلی حضرت کے کوچے سے
بتا دینا کوئی جا کر پتا اسکو مرے گھر کا

نبی کی مدح لکھینگے جو اپنے صفحۂ دل پر
رگِ جاں سے ہم اپنی کام لینگے تارِ مسطر کا

مرا ہو نعت کی پاسِ ادب ہے ورنہ محفل پر
دکھاتے آج ہم کچھ زورِ طبعِ نظم پرور کا

طبیعت بجھ گئی ناقدریِ احباب سے اپنی
جو تنہا بھی لکھا وہ شوق تھا نعتِ پیمبر کا

تمنا ہے تخلص نام ہے میرا محی الدین
فدائی ہوں ابوبکر و عمر عثمان و حیدر کا

پیچ کھا کھا کر جو تیری زلفِ معنبر ہو گیا
قسمتوں سے کیا سے کیا میرا مقدر ہو گیا

حسبِ عالم ہوا مشہور بگڑا کیا مرا
کیونکہ ٹوٹا بھی اگر کنگرا تو ساغر ہو گیا

رات بھر اس دلِ صد چاک کے ہر پہلو میں
یا نیاز حرم ہوا یا کوئی ٹانکا ٹوٹا

بات یہ ہے کہ جسے تم نے بنایا وہ بنا
اور اللہ بچاتے جسے توڑا ، ٹوٹا

چھٹکے افشاں جو گری زلفِ سیہ سے انکی
ہم یہ سمجھے شبِ تاریک میں تارا ٹوٹا

موسمِ گل ہے گھٹا چھائی فلک پر جس دن
رند تو رند ہیں زاہد کا بھی تقوی ٹوٹا

کفر و اسلام کے جھگڑوں سے کیا عشق نے پاک
مجھ سے اب سبحہ و زنار کا رشتہ ٹوٹا

منتشر ہوتے احباب تمنا افسوس
گردشِ چرخ سے یہ عقدِ ثریا ٹوٹا

گیا جب تو، تو پانی میں وہ سب لطفِ مے نوشی ۔۔۔ لب جو صرف تیرے جام سے ساقی نہ کم سن تھا

بت پرستوں پر تو جو گزری وہ گزری حشر میں ۔۔۔ اُن بتوں کے ساتھ کیا جانیں خدا نے کیا کیا

دھیان آیا جب اُنکے قامت کا ۔۔۔ سامنا ہو گیا قیامت کا

اُف رے سیلِ بہاری تُربت کا ۔۔۔ جمگھٹا ہے اُمید و حسرت کا

داورِ حشر! ہر خطا میری ۔۔۔ دیکھ تکتی ہے مُنہ شفاعت کا

چرخ صحرا نورد کے آگے ۔۔۔ اِک بگولا ہے دشتِ وحشت کا

بلبلِ زار، کیا عجب، مرکر ۔۔۔ پھول بنجائے باغِ جنت کا

وہ خفا ہیں کہ ذکرِ قامت پر ۔۔۔ کیوں کیا تذکرہ قیامت کا

مجھ کو صورت پرست کر دینا ۔۔۔ کام تھا آپ ہی کی صورت کا

اب عیادت کو وہ نہیں آتے ۔۔۔ یا الٰہی بُرا ہو صحت کا

تم تمنا سے کیوں نہیں ملتے ۔۔۔ آدمی ہے بڑی مروت کا

دیکھا بدمستی ہوئی، مجھ کو سنبھال اے محتسب ۔۔۔ ہاتھ کانپا اور میرے ہاتھ سے ساغر گرا!

ڈر ہے گرنے کا کہاں افتادگانِ خاک کو ۔۔۔ موجۂ آبِ رواں کب ٹھوکریں کھا کر گرا

امید و یاس کی اک بھیڑ سی لگی ہوگی ۔۔۔ اسی پتے سے مری قبر پر چلے آنا

ضعف پر میں ترے پاس چلا آؤں گا ۔۔۔ ہمسرِ تارِ نظر یہ تنِ لاغر ہوگا

جتنی دیگا تو پیے جاؤنگا میں اے ساقی ۔۔۔ کوئی میکش ترے کہنے سے نہ باہر ہوگا

تری رفتار نے آنکھوں سے دکھایا مجھ کو   سُنتے آتے تھے جو لوگوں سے کہ محشر ہوگا
نکلے ہونگے نہ خطِ سبز لبِ رنگیں پر   علقہ پر کوئی سادات کا لشکر ہوگا
خانقاہوں میں تمنّا کو نہ ڈھونڈھو واعظ   دیکھ جا کر کسی میخانے کے اندر ہوگا

تمنا نہ وار کیجئے تیغِ نگاہ کا   صاحب ذرا خیال رہے رسم و راہ کا
رحمت ہی آج وقت گنہگار کے لئے   روزِ جزا میں کام کیا بے گناہ کا

مغفرت حشر سے جاتی ہے قدم لینے کو   واہ کس شان سے آتا ہے گنہگار اُنکا
واہ کیا طالب و مطلوب ہیں، اللہ ری طلب   اُن کے آگے میں اُنہیں سے ہوں طلبگار اُنکا
جب نکلتے ہیں وہ گلگشتِ چمن کو گھر سے   چوم لیتی ہے قدم شوخیٔ رفتار ان کا
کھل کے کہتے نہیں تو کچھ عذر بھی ہم کرتے تھے   اب تو اقرار کے پردے میں ہے انکار اُنکا

موت کیسی! جب آگیا دل میں   جامۂ زندگی اُتار لیا

مرے دل سے ترے تیرِ نظر سے کچھ نہ کچھ ہوگا   ادھر سے ہو نہ ہو لیکن اُدھر سے کچھ نہ کچھ ہوگا
الٰہی ہو رکے پردہ، اسے ضد ہے کہ جا بیٹھے   ترے دربان سے میرے نامہ بر سے کچھ نہ کچھ ہوگا
غبارِ در تو صندل کی جگہ سر میں لگا بیٹھے   تمنّا فائدہ اس دردِ سر سے کچھ نہ کچھ ہوگا

نہ اُٹھے دل میں جو، وہ اُن کا گوارا ہو نہیں سکتا   ہم اچھے ہوں یہ ہم سے اے مسیحا ہو نہیں سکتا
چھپیں گے کب تلک آخر اک نہ اک دن دیکھ ہی لینگے   کہ ہم جیسے نظر بازوں سے پردا ہو نہیں سکتا
ملوں کیونکر رقیبوں سے جو تم ملنے کو کہتے ہو   وہ میرے ہو نہیں سکتے میں اُنکا ہو نہیں سکتا

پیدا کیوں نہ ہو کوئی، قمر وش کیوں نہ ہو کوئی — تمنا اب بجز اُن کے کسی کا ہو نہیں سکتا

کر گیا نام بہت نوح کا طوفاں اپنا — کچھ اثر تو بھی دکھا دیدۂ گریاں اپنا
اپنی ہی مرگ میں خود ہاتھ بٹائے اُنکے — بچ گیا یہ ملک الموت پہ احساں اپنا

ہر وقت یہ تلوار ہی دکھلاتی ہے مجھ کو — انداز یہ اچھا ہے تری چین جبیں کا
اے ضبط، خبردار! خبردار! خبردار! — پوشیدہ رہے عشق ہوا اک پردہ نشیں کا
دیکھو نہ مری جان قیامت پہ اُٹھا کر — پا جائے یہیں طے کہ یہ جھگڑا ہے زمیں کا
اے ہمنفسو! دیر ہے آنے میں کسی کے — رکنا ابھی اچھا ہے دم بازپسیں کا
فردوس میں حوروں کو بھی شوریدہ سری ہے — اللہ رے شہرہ ترے حسن نمکیں کا

عاقلی میرے لئے نام ہے سرشاری کا — بیہوشی کا مجھے دیتی ہے ہشیاری کا
چل دیئے آج کہاں چھوڑ کے غمگیں مجھ کو — دم جو بھرتے تھے ہمیشہ مری غمخواری کا
آتے ہی جام میرے پاس اُلٹ جاتا ہے — یہ اثر ہے مری قسمت کی نگونساری کا
دام گیسو سے مرا دل جو نکل جائیگا اب — حکم دو اپنی نگاہوں کو گرفتاری کا
نہ وہ آسکتے یہاں اور نہ ہم جا سکتے — بیخودی ہم کو نہیں پاس ہے خودداری کا
پوچھتا اُن سے یہ کوئی کہ کبھی میرے بعد — اب کبھی نام بھی سنتے ہو وفاداری کا
ماری پھرتی ہے تری ہجر کی شب میرے بعد — اب کوئی پوچھنے والا نہیں بیماری کا
تھے کسی وقت یہاں فرد و بہار و فائز — اب تمنا ہے فقط نام ہی پھلواری کا

پیئے دو چار دن تو دور جام ارغوانی کا — کہ اب مہمان ہے ساقی زمانہ نوجوانی کا

یہ رونا ہے کہ کیوں آیا زمانہ نوجوانی کا
اگر ممنوع تھا پینا شراب ارغوانی کا

لکھوں گر رات کی آہ و فغاں کا حال شعروں میں
مرے اشعار پر دھوکا ہوا اشک فغانی کا

نہیں محشر میں پیش حق بھی ہم جانے نہیں دیتے
معاذ اللہ! یہ عالم ہے اپنی بدگمانی کا

ہمیں یہاں بلبل مسکیں! ترا اللہ حافظ ہے
کہ اب صیاد کو عہدہ ملا ہے باغبانی کا

وہ اٹھیں کس طرح، میں جاؤں کیونکر سوئے گلشن
نزاکت کا ہے انکو عذر، مجھ کو ناتوانی کا

زمیں پر بھی نظر آتے ہیں کیسے کیسے سیارے
غرور اللہ نے توڑا نجوم آسمانی کا

بڑھے کیونکر طبیعت اب کسی کی شعرگوئی میں
زمانہ اے تمنا آ گیا ناقدردانی کا

بہار کے جانیکا غم نہیں ہے مجھے جو غم ہے تو اسکا غم ہے
کہ خم تو خم ہے لحد کے اندر کوئی سبو بھی نہیں رہیگا

کوئی یہ شیخ حرم کو کہدے کہ میکدے کا بڑا ادب ہے
وہ بے ادب کیا کرے گا جا کر جو باوضو بھی نہیں رہیگا

کوئی گلہ ہی تو ہیچ اس پر نہیں ہے یہ بھی یہ حد فاصل
کسی کی قربت میں پھر حجاب رگ گلو بھی نہیں رہیگا

غفلت سے بھی کسو کو ترقی ہوئی کبھی
یوسف کا بخت خواب سے بیدار ہو گیا

ساقی نے ایک جام میں بدمست کر دیا
بیکار حوصلے کو مرے پست کر دیا

باد خزاں نے زر کی ذرا قدر نکہت کی
پتوں کی طرح گل کو تہی دست کر دیا

تکلیف بسملوں کو نہیں ہوتی ذبح میں
مشق ستم نے تم کو سبکدست کر دیا

اس چشم نیم باز سے جانے رہے حواس
ایک آدھے جام نے مجھے بدمست کر دیا

ساقی کو جام و بادہ کی حاجت نہیں رہی
جب آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا مست کر دیا

حسرت ہے کہ سکندر کو پلانا نہ ہوا
خضر خطا نے ترے آب حیواں سبکو دیا

ساتھ پھرتے تھے غم و رنج و الم دنیا میں
تیرے عاشق نے ترک کر کے اماں سب کو دیا

مر کر مریضِ عشق کو آرام ہو گیا
کہہ دو مسیح جائیں کہ اب کام ہو گیا

ہر گز نہیں قفس سے یہ دورِ روزہ زندگی
تارِ نفس ہمارے لئے دام ہو گیا

پارینہ ہو گیا ہے مرا جامۂ حیات
تارِ نفس بھی ٹوٹ چلا خام ہو گیا

ساقی نے ہاتھ میں جو لیا ساغرِ شراب
گیسو کا عکس پڑ کے خطِ جام ہو گیا

اس گلبدن کو دیکھ کے مصروفِ میکشی
جو پھول گلستاں میں کھلا جام ہو گیا

نالۂ سوزاں نہ کر بلبل چمن جل جائیگا
گل ترا محبوب ہے اس کا وطن جل جائیگا

طورِ سینا جل بجھا نارِ تجلی سے اگر
تیرے عاشق کو بھی جب ہوگی لگن جل جائیگا

دستِ وحشت کی نہ پوری ہو سکیگی آرزو
سوزِ غم سے تار تارِ پیرہن جل جائیگا

صبرِ بلبل کا اگر لے باغباں پڑ جائیگا
دیکھ لینا آتشِ گل سے چمن جل جائیگا

سوزِ غم آ کر بجھا جا، صورتِ ابرِ بہار
گلشنِ دل ورنہ اے رشکِ چمن جل جائیگا

آنکھ میری آہ کا ہے امتحاں مدِّ نظر
مجھ کو اس کا خوف ہے چرخِ کہن جل جائیگا

بعد مرنے کے بھی سوزِ عشق سے زیرِ مزار
لاش بھنجائیگی عاشق کی کفن جل جائیگا

عاشقِ رخ کو ہو کیا تاریکیِ تربت کا غم
داغِ دل مانندِ شمعِ انجمن جل جائیگا

پیچکِ سنبل سے دھواں اٹھا شجر بجھ جائینگے
آگ اٹھی تختۂ گل سے چمن جل جائیگا

اے تمنا بزم میں حاسد نگاہِ رشک سے
دیکھ لیگا گرمیِ طرزِ سخن جل جائیگا

کوئی چٹکی سے کلیجے کو اگر مل جائیگا
گلستانِ دل میں نخلِ آرزو پھل جائیگا

جانِ من آخر کب آئے گا مرے خط کا جواب
مدتیں گذریں یہی کہتے ہوئے "کل جائیگا"

جس تن پہ بجلی ہو نو جوانوں کو غرور | گنج تربت میں وُہی اک دفنہ سرِ اقبال جائیگا
یا الٰہی جانے کے کاندھوں پہ کیونکر جائیں ہم | وہ مرے شامل جنازے کے جو پیدل جائیگا
آچکا ہو وقت مرنے کا سحر آجائیے | آپ کا وعدہ نہیں ہر کچھ کہ یہ ٹل جائیگا
سر اٹھایا کیا تمہارے سامنے خورشید نے | دوپہر کے بعد تو کمبخت خود ڈھل جائیگا
آج وہ گل صورت ابر بہار آنے کو ہے | اے تمنا اب نہال آرزو پھل جائیگا

تازہ غزلیں

(از نواب محمد عمر خاں بہادر وفا تخلص رئیس اعظم)

ہے دل کا کر ان کا گلہ ان سے پوچھو | سبب رُوٹھنے کا ذرا ان سے پوچھو
بتاؤں میں کیا؟ مجھ سے کیا پوچھتے ہو | مرے دل کا تم مدعا ان سے پوچھو
جو غیروں نے چھوڑا ہے محفل میں آنا | ہوئے مجھ سے یہ کیوں خفا ان سے پوچھو
طبیبوں سے کیا پوچھتے پھرتے ہو تم | مرے درد دل کی دوا ان سے پوچھو
کہا میں نے گو حال کہنے سے ان کے | مگر کچھ انہوں نے سنا؟ ان سے پوچھو
وفا انکی باتوں میں ہرگز نہ آنا | کہا تھا مگر پہلے کیا؟ ان سے پوچھو

(از سید محمد عبد الصمد درد صفوی تلمیذ حضرت مولانا تمنا عمادی پھلواروی)

دردِ دل نے ہائے یہ کیا کر دیا
اشک کے بہنے نے افشا کر دیا
اب سمجھتا ہے وہ محمل دشت کو
تم نے عالم کو اندھیرا کر دیا
سیلِ اشک آنکھوں سے جاری ہو گئے
داغ دل غیروں کو دکھلا کر دیا

مجھکو مجنوں میں رسوا کر دیا
آپ کی رفتار کا کیا پوچھنا
عشق نے مجنوں کو لیلا کر دیا
موت نے اگر تیرے بیمار کو
ہم نے ان چشموں کو دریا کر دیا
درد نے فیضِ تمنا سے یہاں

ہم چھپائے پھرتے تھے جو رازِ عشق
جب چلے اک حشر برپا کر دیا
زلف بکھرا کر رخِ پرنور پر
دی دوا ایسی کہ اچھا کر دیا
یہ جلایا اور مجھکو آپ نے
شاعری میں نام پیدا کر دیا

آبحیات خضری

فوائد مستند

پتہ: مینیجر شفاخانہ حاجی الحرمین حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء - لاہور

شائقین کتب ملاحظہ فرمائیں

(مشکل کتابوں کا حل)

مندرجہ ذیل کتابیں کوئی حل نہ کرسکا اور نہ کوئی انشاء اللہ حل کرسکتا ہے۔ یعنی پتھروں کو پانی کرکے بہا دیا۔ دیکھنا شرط ہے

حل قصائد خاقانی ۔ ... سے حصہ اول ... ۱۲؍

حصہ دوم زیر طبع ہے

یہ وہ قصائد ہیں ... ہم کو ان سے ... نہیں جو ... میں لگے رہتے ہیں

اگر کوئی مرد میدان ہو تو ... مشکل قصیدہ ... حل کر دے

انعام فی شعر ۔

حل کلیات اردو مرزا غالب مرحوم . . . ۱۰؍

حل قصائد خاقانی ۔ کورس ... . . . ۹؍

حل نکات ۔ مولانا مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ در تصوف ۔ ۱۲؍

شوکت التجدید ۔ میرے کلیات جو قصائد و غزلیات و رباعیات و سلام اور اردو اور بھاشا وغیرہ کی نظم سے مرصع ہے اور شاعری کی دنیا جس کی منتظر ہے بہت جلد آرہی ہے۔ زیر طبع ہے۔ پیشگی ... اور بعد طبع .. . . ۴؍

اعلانِ عام جو صاحب کامل شاعر بننا چاہیں۔ میری جانب رجوع لائیں۔ جیسا کلام ہوگا اسی درجے کی اصلاح ہوگی۔ کلام بھیج کر آزمائیں۔

جو صاحب کسی کتاب اردو۔ فارسی۔ عربی میں اصلاح لینا چاہیں فیس کے بارہ میں مراسلت کریں۔ اکثر کتابوں کا لٹریچر بلکہ املا تک صحیح نہیں ہوتا۔ غلطیوں کو مجدد ہی خوب جانتا ہے۔

مجدد السنۂ مشرقیہ۔ احمد حسن شوکت شہر میرٹھ

چھپکر تیار ہے

خیالستان

یعنی

سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے کے مصنفہ قصوں اور مضامین کا مجموعہ

یہ کتاب پورے چار سو صفحوں سے زیادہ حجم کی چھوٹی خوبصورت تقطیع پر نہایت خوشخط قلم چھپی ہے۔ کاغذ عمدہ ولایتی۔ سرورق کا کاغذ سفید ولایتی جس پر سرخ و سبز رنگ کے بیل بوٹے ہیں۔

ایک مختصر سی تمہید جناب میر نیرنگ صاحب بی۔ اے نے لکھکر اس دلچسپ مجموعہ کی کتاب کی صورت میں پیش ہونے کی ضرورت ظاہر کی ہے

سید سجاد حیدر صاحب کے اچھوتے مضامین جس قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں محتاج بیان نہیں۔ صرف مثال کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض اوقات ایسی نوبتیں آئی ہیں کہ مخزن کا ایک پرانا پرچہ جس میں صاحب موصوف کا فلاں مضمون تھا تلاش کر کے ایک روپیہ کا وی پی کر دیجئے۔ اب ان کے وہ سب مضامین جو مخزن میں نکلے ہیں اور دیگر مضامین جو اردو رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں بہ نہایت اہتمام اور خوبصورتی سے چھپے ہوئے ہدیہ ناظرین ہیں۔ شائقین جلد منگوائیں۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک .. .. عمار

منیجر رسالہ مخزن مکلگن روڈ لاہور

۱۲ار
۱۲ار
مشہور عالم
اصلی راسکوپ سسٹم واچ

مخزن

جنسِ لطیف کی موجودہ حالت

گو ہندوستان علمی ترقی اور تعلیم کی عام اشاعت کے اُس درجہ پر پہنچ چکا ہے جسکو بامِ ترقی کا زینہ کہا جاسکے۔ تاہم اُس میں مردوں کی تعلیم کے علاوہ زنانہ تعلیم کا بھی معقول انتظام ہوتا جاتا ہے۔ مختلف ادبی اور علمی رسائل اور اخبارات جنسِ لطیف کی حالت سدھارنے اور اس کے ذہنی اور دماغی قویٰ کو نشوونما دینے کی خدمت ادا کرتے ہیں۔ اہلِ قلم بناتِ حوا کی تہذیب و تربیت پر مفید کتابیں لکھتے جاتے ہیں۔ اور نوعِ انسانی کا بہترین نصف اس علمی و عملی ذخیرے سے مستفید بھی ہوتا ہے تاہم افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستانی مستورات میں صحیح نسوانی تعلیم و تربیت کا جزو بہت ہی کم ہے۔ اور ایسی لڑکیاں اور بیبیاں بہت تھوڑی ملینگی کہ وہ متوسط درجے کے کنبوں یا اُن گھرانوں کی ملکہ یا بالعالیہ بن سکیں۔

یہ کیوں ؟ کیا اُنکو تعلیم پسند نہیں آئی ؟ کیا اُنکو پڑھنے لکھنے اور دماغی اور ذہنی ترقی حاصل کرنے سے اتنا بھی نفع نہیں پہنچا کہ وہ اپنے گھر (اُلو) پر عمدہ طور سے حکمرانی کر سکیں ؟ اور سیاستِ منزل کے نازک فرض اور تربیتِ اولاد

اہم واجب کو بخوبی بجا لائیں؟ یا یہ محض ایک قدامت پسند فرقہ کے توہمات ہیں؟ کہ نئی تعلیم یافتہ لڑکیاں ۔ اچھی بیبیاں اور قابلِ تعریف مائیں نہیں بن سکتیں اور لڑکیوں کی تعلیم معاشرت کا حال روز بروز ابتر ہونے میں انہیں مستورات کا بہت کچھ دخل ہے؟ یہ کہنا گو ایک حد تک صحیح ہو ۔ پھر بھی اس کو تعلیم کا قصور نہیں کہا جا سکتا ۔ بلکہ یہ ہماری معاشرت کے بگاڑ کا نتیجہ اور اس انقلاب کا اثر ہے ۔ جو ایک قوم کے کسی دوسری قومیت یا معاشرت کے رنگ میں رنگنا شروع ہونے کی حالت میں واقع ہوتا ہے ۔ اور اسی کی ہم کو آج شکایت ہے ۔ اس تغیر کا احساس پچھلے بیس سال سے ہونے لگا ہے اور یہ احساس روز بروز ترقی پذیر بھی ہے چنانچہ بعض روشن خیال نوجوانوں نے چند ادبی رسائل میں اسی خیال اور احساس کی بنا پر اپنی طبع مضمون آفرین کے جوہر دکھلائے ہیں اور ان طبعی جولانیوں کو عام دلچسپی اور مقبولیت سے دیکھا گیا ہے ۔ لیکن ہماری رائے میں یہ خطرات اور افکار اپنی ظاہری دلفریبی کے تحت میں ایک نہایت برا سمّی اثر بھی مخفی رکھتے ہیں ۔ اور وہ اثر یہ ہے کہ قومی معاشرت کے برہم زن تعلیم یافتہ نجام اور مغربی معاشرت کے دلدادگان خام ۔ جن کی آئندہ حالت کا چربہ ان مضامین کے اندر اتارا گیا ہے ۔ ایسے خیالات سے عبرت پذیر ہونے کی جگہ الٹے "سمندِ شوق پہ ایک اور تازیانہ ہوا" کا حساب کر لینگے ۔

ہمیں ماننا پڑیگا کہ ہماری مستورات کے اخلاق و عادات میں جو کچھ خرابی پیدا ہوئی ہے وہ صرف اسی انقلاب معاشرت کا نتیجہ ہے تعلیم یافتہ اصحاب بی بی اپنے مذاق کی چاہتے ہیں ۔ اور لڑکیوں کی تعلیم ان کے آئندہ شوہروں کے حسب ضرورت نہیں ہوتی ۔ اس کا نتیجہ جو ہے وہ نیک کیونکر نکل سکتا ہے؟ بس ہمیں اس وقت

لڑکیوں کو ایسی تعلیم و تربیت دینے کی ضرورت ہی جو رفتارِ زمانہ کے مطابق ہو اور حدودِ شرع سے باہر نہ ہو۔ اور اس کے متعلق ہمیں اپنے فاضل مصری برادران کی تقلید کرنا افضل معلوم ہوتا ہی۔ جہاں اس قسم کی مفید کتابیں بہت عمدہ پیرایہ میں تالیف اور شائع ہو رہی ہیں۔ اور ان میں سے ایک کتاب کا کچھ اقتباس ذیل میں کیا جاتا ہی جو تربیتِ بنات اور تہذیبِ طبقۂ نسوان کے متعلق دلچسپ ناول کے پیرایہ میں لکھی گئی ہی اور ناظرینِ مخزن نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا تو ممکن ہی کہ پوری کتاب کا ترجمہ رسالہ کی صورت میں علیحدہ شائع کیا جا سکے۔ اس کتاب میں فاضل مولف نے تربیتِ نسوان پر ایک مشرقی ذی علم شہزادی کے چند لکچر درج کئے ہیں اور چونکہ ایسے مضامین خشک ہوا کرتے ہیں لہٰذا اس میں افسانہ کی چاشنی شریک کر کے انہیں دلچسپ اور قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ ان لکچروں میں سے پہلے لکچر کا ترجمہ حسبِ ذیل ہی:-

"لائق اور معزز بیبیو!

ہماری بہنوں۔ یعنی عورتوں کی زندگی کا مطالعہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس سے انسانی وجود کا مقصد اور جنسِ بشری کی خوشحالی کا مکمل علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اس بات کو ثابت کرنے کے واسطے میں آپ کو تاریخ کے پیچ در پیچ راستہ میں کیوں لیجاؤں۔ اور صرف ہی جنسِ لطیف کی موجودہ حالت ہی کو پیش کر کے راستہ آپ پر کیوں نہ واضح کر دوں۔ سنئیے! آج وہ زمانہ ہے کہ ہمیں عورت کو کس قدر ناواجب قیدوں سے چھٹکارا ملا ہے۔ اور اس نے اپنے تھوڑے سے حقوقِ شرعی آزادی سے برخوردار ہونے کی شکل میں پا لئے ہیں۔ ہاں یہ ماننے کی بات ہی کہ دنیاوی نظام اور قانون کے بموجب عورتوں کو سیاسی

کاروبار میں مصروف ہونے کا حق نہیں دیا گیا ہے اور دنیا اس بارہ میں اُن کے
دباؤ سے آزاد ہے۔ نیز وہ خود سیاسی زندگی کی کشمکش اور منافقت کے عیب
سے بری ہیں۔ پس عورتوں کی موجودہ حالت اُن کے لئے نہایت ہی موزوں
اور مناسب ہے کیونکہ اگر ان کو سیاست میں بھی دخل ملتا تو میری رائے میں یہ امر
نوع بشر کی حق تلفی تھی۔ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اور اسکو اس لئے ذاتی رائے
کہتی ہوں کہ۔ انگلستان کی سفریجیٹ (حقوق سیاسیہ کی طالب) خواتین مجھ سے
ناخوش۔ ہو جائیں (قہقہہ) میرے نزدیک انسانی مجمع اور سوسائٹی میں سیاسی
کاروبار کے سوا ایک اور عظیم الشان کام عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ جس کا
اثر حکومت کے اثر سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ اور سوسائٹی کو آج اس بات کی
سخت ضرورت ہے کہ ہم اُسی کام کو اچھی طرح اور مکمل طور سے انجام دینا اپنا فرض
سمجھیں۔ اور غیروں کا حق دبا کر۔ یا فضول اور بے نتیجہ کاموں میں مصروف ہو کر
اپنا وقت اور وقار نہ کھوئیں۔ لیکن اس بات کا پورا ہونا اور بخوبی پورا ہونا
اُسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم دین اور اخلاق و ادب سے بہت بڑا حصہ لیں۔ اور
آپ کو خوب معلوم رہے کہ قابل تعریف بی بی وہی ہو سکتی ہے۔ جو دیندار اور
پرہیزگار ہو۔ کیونکہ دین ہی انسان کو بداطواری، لغزش، اور ادائے فرائض و
اعمال میں سستی کرنے سے بچاتا۔ اور تاکید اُسی کی رغبت دلاتا ہے۔

"مگر ہماری موجودہ سوسائٹی میں جھوٹی تہذیب اور ملمع شدہ تمدن کے
اثرات کا بڑھنا۔ آج اس کی عام تباہی اور خرابی کا موجب ہو رہا ہے۔ اور
خصوصاً طبقہ نسواں میں اس سے بڑی ابتری پڑ گئی ہے۔ آپ سب بیبیاں
اس بات سے واقف ہونگی کہ اس ابتری سے میرا کیا مطلب ہے۔ یہی کہ نازیبا

بناؤ سنگار، فضول آرائش اور مردوں کی پُر فریب جھوٹی مدح سرائی کے سننے سے خوش ہو کر پھول جانا۔ نئے تمدّن نے ہم میں یہ سخت عیوب پیدا کر دیئے ہیں۔ اور افسوس ہے کہ ہم انکو عیب شمار نہیں کرتے۔ لیکن ایک دیندار اور بااخلاق پاک صفت بی بی کبھی اس دھوکے کی ٹٹی۔ یعنی تمدّنِ جدید کے فریب میں نہ آئے گی۔ یہ ماننا چاہئیے کہ عورت قدرتاً نہایت نازک مزاج، بڑی پُر اُمید، محبت کی پتلی، اور خود پسندی اور نزاکت پسند بنا کر پیدا کی گئی ہے۔ اور یہ حکمتِ الٰہی ہے۔ تاکہ مرد کا دل اپنی طرف مائل اور اُسے قابو میں کر سکے۔ مگر ان میں سے ہر ایک امر کی ایک حد مقرر ہے۔ اور دینی احکام اور دنیاوی قوانین نے ان کی ایسی حد بندی کر دی ہے کہ اس سے آگے بڑھنے میں خرابی۔ اور اس کے اندر رہنے میں جنسِ بشری کی باہمی اُلفت و محبت کی خوبی پائی جاتی ہے۔ پس جہاں معاملہ اس حد سے بڑھا یقیناً ابتری پھیلیگی اور نظام میں خللِ عظیم واقع ہو کر سوسائٹی کے اندر بُرائی پیدا کر دیگا۔ بلکہ اس کو ذلّت اور ادبار کے تاریک غار میں گرا کر رہیگا۔ بدیں وجوہ تربیت کی نہایت سخت ضرورت ہے۔ اور اس کی طرف سب سے پہلے توجہ ہونی چاہئیے۔ اس تربیت سے یہ معمولی اور مدرسہ کی تعلیم مراد نہیں ہے بلکہ تربیت اس کو کہتے ہیں کہ اعلیٰ درجہ کے پاک خیالات اور مقدس مذہبی جذبات اور زنانہ کمالات۔ فرقہ نسواں کے دل و دماغ اور جسم و جان پر حاوی بنا دیئے جائیں۔

میری ہم جنس بہنو! مجھے معاف کرنا کہ میں عورتوں کی موجودہ حالت پر افسوس ظاہر کرتی اور اس کو خود انہیں کا عیب بتاتی ہوں۔ اور زنانہ مدارس پر کوئی اعتراض یا نکتہ چینی تک نہیں کرتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدارس کا پروگرام محدود ہے۔ وہاں صرف ایک خاص حد تک پڑھنے لکھنے یا کچھ دستکاریوں وغیرہ کی تعلیم دیجاتی

ہو۔ بعض بعض اسکولوں میں امورِ خانہ داری کا سلیقہ بھی بتایا جاتا ہو۔ اور بس۔ لہٰذا مدارس کی تعلیم پر عورتوں کی موجودہ حالت کی خرابی کا الزام رکھنا صحیح نہیں۔ لائقِ الزام وُہ گھرانے ہیں جو اپنی حالت اور مصلحت کے موافق اپنے یہاں کی لڑکیوں کو تعلیم و تربیت نہیں دیتے۔ قابلِ مذمت اور سزاوارِ ملامت یہ جز سوسائٹی ہو جس نے آج عورت کے درجہ کو گرانے یا اُسے پامال رہنے میں مدد کی ہے۔ اور جنسِ لطیف کی عزت و منزلت گھٹا کر اُسے دنیا کی نظر میں انگشت نما بنا رکھا ہے۔

"عورت، پاک فرشتہ ہے۔ یا ملعون شیطان۔ لیکن اگر ہم اپنی جگر پارہ لڑکیوں کے حال پر توجہ کریں۔ پوری کوشش اور مستعدی کے ساتھ ان کی تربیت اور تہذیبِ نفس کا خیال رکھیں۔ چاہے اُن کو پڑھنا لکھنا معمولی آتا ہو۔ اور وہ بڑی عالمہ و فاضلہ نہ ہوں۔ تو بے شبہ اُن کے اندر بزرگ اور پاک جذبات کی ترقی ہوگی۔ ان کی اخلاقی زندگی عظمت حاصل کرے گی۔ اور وُہ سوسائٹی کی نظر میں مقبول و ممتاز ہونے کے علاوہ خود سوسائٹی کی اصلاح بھی کر سکینگی اور اس کو درست بنا کر شیطان سیرت مردوں اور عورتوں کی تعداد گھٹانے میں کامیاب ہونگی۔

"بہنو! آپ حیران نہ ہوں! میں اس وقت وُہ باتیں کہہ رہی ہوں جن کا ثبوت بہت سے تجربوں اور مشاہدوں سے ملتا ہے۔ اور ثابت ہو رہا ہے کہ تمدن ظاہری بناؤ سنگار اور کثرتِ آرائش و زیبائش کا نام نہیں۔ بلکہ تمدن یہ ہو کہ نفوسِ انسانی کمالات کے مخزن ہوں۔ اور لوگوں کے دل اعلیٰ درجہ کے دینی اور دنیوی خوبیوں کے گنجینے بنجائیں۔ آپ وہ ہم عمر جوان کنواریوں کو لے لیجئے

مل چکی ہے لیکن اس قدر زیادہ تعلیم یافتہ ہے کہ کتابوں کا مطالعہ، ناولوں کی سیر۔ اور اخبار بینی۔ بآسانی کرے۔ اور عمدہ دلچسپ عبارت کے خطوط لکھ کے اب یہ لڑکی عشق و محبت کے افسانے پڑھنے اور سمجھ لیں اور اتفاق ہو تو نامہ و پیام کرنے میں اپنا وقت ضائع کرتی اور حقیقی کمالاتِ نفس کی برکات سے محروم ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ بجز لباس زیور کی آرائش اور بناؤ سنگار کرکے بازاروں اور سیر گاہوں میں جانے کی نمائش کے اُسے کوئی دوسرا فکر نہیں ہوتا تاکہ بُوں زیب و زینت سے مردوں کی نظر فریبی کرکے اُن بداخلاق مردوں کی زبان سے نفاق (جھوٹی تعریف) کے کلمات سُنے جو ایسی بے باک اور ناعاقبت اندیش چھوکریوں کے لئے شیطان سے کم نہیں۔ اور دوسری لڑکی اگرچہ قطعاً پڑھی لکھی نہیں۔ لیکن وہ اپنی ماں کے ساتھ خانہ داری کے کاموں میں مصروف اور نفس کے کمال حاصل کرنے میں منہمک ہو۔ اگر چلتی ہے تو اپنے سایہ تک سے لجاتی ہے شرم و لحاظ، اور ادب و تہذیب کے دائرہ سے باہر نہیں جاتی باز رہیں جائے تو کسی لغویات کی طرف دھیان نہ کرے۔ اور نازیبا باتوں سے بزرگانہ چشم پوشی کرتی ہوئی گذر جائے تو کیا آپ کے نزدیک یہ جاہل لڑکی اُس خواندہ لڑکی سے اچھی نہیں جس نے اپنی اخلاقی حالت خراب کرلی ہو۔ اور خود پسندی کے پیچھے حشمت و وقار کو ہاتھ سے دے دیا ہے۔

میری اس تقریر سے آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ میں جہل کو پسند اور علم کو ناپسند کرتی ہوں ہا نہیں! ہرگز نہیں۔ علم میں کوئی نقص نہیں۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ مدرسہ میں پڑھانے کا علم اور چیز ہے اور وہ تربیت دوسری شے ہے جس کے ذریعہ سے لڑکیوں اور لڑکوں کے اخلاق سُدھارے جاتے اور انہیں قابلِ تعریف

بیان بتلایا جاسکتا ہے۔ غرضکہ یہ چند پیدا اور تجربہ میں آنے والے حالات ایسے ہیں کہ انکو دور کرنے میں سخت کوشش کی ضرورت۔ اور اس کی کوشش کرنا واجب ہے۔ تاکہ ہماری سوسائٹی عیوب قبائح سے پاک ہو جائے۔ ہم یورپ کی عورتوں پر نکتہ چینی کیا کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یورپ میں حد سے بڑھی ہوئی بے باکی اور فسادِ اخلاق کا طوفان ہے۔ مگر جب ہم اپنے ملک کی تعلیم یافتہ مستورات کا بناؤ سنگار اور زیور و پیرایہ دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زنانِ مغربیہ سے بھی بدرجہا بڑھ کر نمائش پسند اور بیباک ہیں ان سے یوں بھی ایک درجہ بلند ہیں کہ انہوں نے مشرق و مغرب دونوں براعظموں کی برائیوں کو اکٹھا کر لیا ہے"۔

فاضل بہنو! آج مجھے اسی قدر کہنا تھا اور آپ معاف کریں۔ اگر میرے کلمات سے آپ کا کچھ دل دکھا ہے۔ کیونکہ میں نے نکتہ چینی کی ہے وہ اپنی جنس کی اور جس طرح آپ کو اس جنس سے تعلق ہے ویسا ہی مجھے بھی ہے۔ پس گویا میں نے جو کچھ کہا وہ خود اپنے تئیں کہا۔ اور بغرض اصلاح کہا۔ کیا آپ اصلاح نہیں چاہتیں؟

محمد حلیم انصاری

مسلم یونیورسٹی فنڈ

ہز ہائینس سر آغا خان بہادر بالقابہ نے اپنے پیام تاربرقی مرقومہ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۱ء موسومہ آنریبل راجہ صاحب بہادر محمود آباد میں اپنا چندہ ادا کر دیا ہے اور وہ اصرار کے ساتھ قوم سے اپیل کرتے ہیں کہ چندے جلد ادا کئے جائیں۔ امید ہے کہ اب تمام بزرگانِ قوم بیش از بیش توجہ فرمائینگے اور اپنے موعودہ چندوں کو بلا تاخیر ادا کر دینگے۔ اور جن بزرگوں سے لوکل طور پر موعودہ چندوں کے وصول کا اہتمام متعلق ہے امید ہے کہ وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو اب خاص طور پر محسوس کرینگے۔

مشتاق حسین آنریری سکرٹری

شیخ علی حزیں

ذیل کا مضمون اگرچہ تنقیدی رنگ میں لکھا گیا ہے لیکن اس کے فوائد زبان اس بات کی سفارش کرتے ہیں کہ اسے ناظرینِ مخزن کی نذر کیا جائے اور اُمید ہے کہ وحشت صاحب اس پر کامل توجہ فرمائیں گے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیرِ سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم ندمیدہ درِ دل کشا بچمن درآ

مضمون کی سُرخی اور عنوان کے شعر کا تضاد شاید ناظرینِ مخزن کو کسی قدر حیرت میں ڈالے مگر چونکہ ہمارے کرم حضرت وحشت نے شیخ کی سوانح نویسی کے بعد اُن کے کلام کی محاسن نمائی سے ناظرینِ مخزن کو محظوظ فرمادیا ہے اور مجھے باوب جناب موصوف سے اسی کے متعلق کچھ گذارش کرنا ہے۔ لہٰذا یہی سُرخی رہنے دی ؎

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

شیخ یا دوسرے اربابِ کمال مثل عُرفی وغیرہ کو جنہوں نے ایران سے ہندوستان میں آکر اپنی تیغِ زبان کے جوہر دکھائے۔ امام فن نہ ماننا اور اُن سے ارادت نہ رکھنا ملتِ سخن سنجی میں سخت کفر ہوگا۔ ہمارے حضرت وحشت نے جو شیخ کے چیدہ کلام کی خوبیاں دکھائی ہیں۔ ایسا کون قدرشناس ہوگا جو اُن سے مستفیض و لذت یاب ہو کر آپ کا شکریہ نہ ادا کرے۔ اس علم و فن کی کساد بازاری اور کم قدری کے زمانے میں آپ کے ایسے عالی دماغ کا اپنا وقتِ عزیز دوسروں کے افادۂ علم کے لئے صَرف کرنا جس قدر ادائے شکر کا استحقاق رکھنے بجا ہے۔

بات یہ مجھے اس وقت اپنا ایک شعر یاد آگیا ؎

جوہر ہی نوا منشی گویا اندیشہ تنگ الکلام ہست بجا مثل کہ درویش نا ہو اہم کردہ اند

سب سے پہلے جناب کا شکریہ میں ادا کرتا ہوں۔ میں نے آپ کے مضمون سے
بہت لطف اُٹھایا سچے دل سے آپ کو دعا دیتا ہوں ؎

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

آپ اس مضمون کو خوب ہی مکمل کر پوری توجہ سے ادا فرمائیے لیکن اپنی وسعت
اخلاق کے واسطے میری ایک التجا کو بھی توجہ سے سنئے۔ مجھے عزت بخشنے
کے لیے یاد رہے کہ جب جو کچھ عرض کرونگا وہ محض صدق و خلوص پر مبنی ہوگا۔ اس لئے
اگر خدانخواستہ آپ میری اس سمع خراشی کو نکتہ چینی پر محمول فرما کر کسی ناگوار
خامہ فرسائی کا قصد کرینگے تو میں کچھ جواب نہ دونگا۔ بلکہ اُسے فخر سمجھونگا اور
کہونگا ؎

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

ممکن تھا کہ میں اپنا مخاطب کسی اور تذکرہ نویس کو بنا لیتا۔ مگر چونکہ آپ ایک
امر کے محرک ہوئے ہیں۔ اور میں اپنے ذہن نارسا کے موافق جہانتک آپکے
حسن نیت کا اندازہ کرسکا، امید کرتا ہوں کہ اگر آپ نے میری آرزو پوری
کردی تو زیادہ خوشی کی بات ہوگی۔ اس لئے آپ ہی سے التماس ہے۔
ایران سے تشریف لانیوالے حضرات کی عجائب پرست اہل ہند نے جو پرستش یا قدر
کی وہ اظہر من الشمس ہے۔ حتیٰ کہ آجتک شہد کا ہر مسکر سے بھی زیادہ کا مزہ
پانے کے لئے انکے کلام کی خوبیاں ظاہر کی جاتی ہیں۔ ان بزرگوں کے
مقابلے میں کسی ہندوستانی فن دان کا نام لینا گویا گناہ سمجھا جاتا ہے لیکن
کیا یہ بات قابل افسوس نہیں کہ ان حضرات نے اہل ہند کو مدت العمر چشم حقارت

سے ہی دیکھا۔ کسی ہندی باکمال کی تعریف نہیں کی۔ انہیں شیخ صاحب کو
دیکھتے۔ یہاں کے اہل کمال نے اُن کی خدمت کو سعادت جانا۔ ان کے
اشعار کی تضمینیں کر کے اظہارِ خلوص کیا۔ یہ تو اُن کے زمانے میں تھا۔
بعد کو ہندوستان کے رشکِ عرفی و طالب مرزا نوشہ غالب ان کے اتباع
پر نازاں رہے ؎

غالب مذاق ما نتوان یافتن ز ما
رو شیوۂ ظہوری و طرزِ حزیں طلب

مگر انہوں نے اپنے ان ارادتمندوں کو کیسا سمجھا؟ مرزا سودا کا لطیفہ مشہور
ہے کہ شیخ کے اس مطلع پر ؎

تا چشم تو زد گرد کمانے بکمینے
یک صید نیاسود زمانے بزمینے

مطلع کہا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ نے سُنکر تڑپے ہے کے معنے پوچھے۔ بتلانے لگے (دیکھو اسکے معنی بتانے
معلوم ہو گئے!) خوش ہوئے۔ داد دی۔ مگر خوب گفتی اور نیکو گفتی کے بعد
سر بکلیٹ کیا حماقت کیا؟ "پوچ ایں ہند ... لغت ہست۔ نئے سبحان اللہ!
کیا عزت افزائی ہے! اب ذرا ہندوستانیوں کی سادہ دلی دیکھئے۔ وہ انہیں
الفاظ کو امتیازی نشان سمجھے۔ خوب اُچھالا۔ آج تک فخر سے بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ
میرے نزدیک شیخ صاحب کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل بھی نہ تھا۔ کیونکہ وہ زبان
اُردو سے ناآشنا تھے اور ظاہر ہے کہ کسی ایک زبان کے شعر میں اُس زبان کے
لحاظ سے جو خاص لطف ہوتا ہے وہ مزہ دوسری زبان میں اُسکا ترجمہ کرنے سے
نہیں آتا۔ سودا کے شعر کا فارسی ترجمہ سُنکر شیخ کا خوش ہونا ایسا ہے جیسے امیر
مینائی مرحوم کسی انگریزی نظم کا ترجمہ سُنکر حسن کلام کی داد دیتے اور کہتے کہ

کچھ بڑھا ہو کر اس پوائنٹ کو بوچگو ٹھہراتے۔ میر و سودا کو شیخ کا اُن کے کلام ریختہ کی داد دینا کب قابلِ اعتبار ہے۔ ورنہ میں وہی کہونگا جو شیخ نے خانِ آرزو کے جواب میں فرمایا تھا کہ بوچگو لہہ دینا تو سہل ہے لیکن اگر شیخ زبانِ اُردو جانتا اور ریختہ میں شعر کہتا تو پتہ چلتا کہ سودا کیا کام کر رہا ہے؟ یہ بوچگوئی کیسی بڑھی کھیری کی۔ سید نیا سودا اور شیخ پر ہے مُرغِ قبلہ نما میں کیا فرق ہے؟ ان فارسی اور اردو کے دو متقابل مطلعوں پر مجھے دو شعر اور یاد آ گئے۔ گو خارج از بحث ہیں۔ مگر دونوں زبانوں کی طرزِ ادا کا لطف آتا ہے۔ فارسی شعر خدا جانے کس کا ہے ؎

نہ ہوا نہ شنیع از پئے طلب جیبِ قمیص را　　دل از من و بردہ از من آستین نہ می کنار از من

دوسرا شعر استاد قدیم فغاں کا ہے جسکی مرزا سودا نے ایک قطعہ میں تضمین بھی کی ہے ؎

شکوہ تو کیوں کرے ہے میرے اشکِ سُرخ کا　　تیری کب آستیں مرے لہو سے بھر گئی

شیخ صاحب نے مرزا سودا کو تو یہ امتیاز بخشا۔ مُلا غنیمت کا فارسی کلام سُنکر فرمایا ؎ "از خاکیانِ ہند غنیمت غنیمت است"۔ گو اتنی تعریف بھی غنیمت ہے۔ مگر اس مصرع سے جو بیدلی ٹپکتی ہے مخفی نہیں۔ بلکہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غنیمت تخلص سُنکر بلا ارادہ ایک مصرع موزوں ہو گیا۔ حاضرین کے سامنے پڑھ دیا۔ نوریانِ ایران کا خاکیانِ ہند میں سے کسی کو غنیمت سمجھنا کیا تھوڑی بات ہے۔ یار لوگ اسی کو لے اُڑے۔ آفاق میں مشہور کر دیا۔ مُلا غنیمت نے لئے اس مصرع کو مایۂ افتخار سمجھے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ بیچارے اہلِ ہند میں سے کوئی اپنی زبان میں کامل ہے تو بوچگو۔ اور اگر فارسی میں پختہ مشق ہے تو زیادہ سے زیادہ ؎ گندم اگر بہم نرسد بھس غنیمت است کا مصداق۔ تو پھر اب "اُدھر نہ اِدھر یہ بلا کدھر" ان غریبوں کو کیا کرنا چاہئے؟ پنبہ بدہن رہیں! سرمہ در گلو ہو جائیں؟

مرزا غالب نے فارسی میں جیسی کچھ عرق فشانی کی ہے اُن کے کلام سے عیاں ہے اُن کے متعلق سُنئے ۔ نواب کلب علی خاں صاحب بہادر والی رامپور کا دربار جس زمانے میں مجمع اہلِ کمال تھا ۔ میرے اُستاد حضرت جلال لکھنوی اور امیر و داغ جیسے مسلّم الثبوت اساتذہ نے اردو شاعری کو ترقی کی انتہائی معراج بخش رکھی تھی ۔ وہاں ایک صاحب محمد علی شیرازی بھی موجود تھے جن کا قیام بیس برس سے رامپور میں تھا ۔ مجھ سے اُستاد مدظلہ بیان فرماتے تھے کہ اس مدت قیام میں اردو زبان حضرت نے اس قدر سیکھی تھی کہ جب مشاعرے کے لئے "تکلم مجھ کو تبسم مجھ کو" طرح ہوئی' آپ ہم لوگوں سے پوچھتے ہیں ۔ "مجھ کو چہ معنی دارد" ؟ ہم نے کہا "مجھ کو" بمعنی مرا ہے ۔ مگر تم مارا ۔ ردیف قرار دیکر غزل لکھو ۔ اسی طرح یہ شیرازی صاحب اپنے فارسی کلام سے اہلِ مشاعرہ کو مستفیض فرمایا کرتے تھے ۔ آپ سے مرزا نوشہ کی نسبت پُوچھا گیا اُن کا فارسی کلام کیسا ہوا ہے ؟ جواب ملا "او پارسی نمیداند کلامش را نمی فہمیم کہ چہ می گوید" اب بتائیے ۔ عمر بھر جگرکاوی کی اور اہلِ زبان نے یہ دل بڑھایا ۔ گو یہ امر تو مسلّم ہے کہ بقول مرزا غالب ؎

کایں زبان خاص اہلِ ایرانست　　مشکلِ ما و سہلِ ایران است

مگر یہ کوئی وجہ نہیں کہ اہلِ ہند چاہے کتنی ہی اس زبان کی خدمت کریں لیکن ان کا کلام اہلِ زبان کے آگے ہذیان سے زیادہ وقعت نہ رکھے ۔ آپ نے شیخ کے حالات میں ایک جگہ افسوس ظاہر فرمایا ہے کہ ہندوستان میں نہ بیدل ہے نہ ناصر علی ۔ شیخ کی صحبت کس سے گرم ہو ۔ میں عرض کرونگا کہ ملّا غنیمت[2] کو

---

[1] اسی کا سبب زبانِ اردو سے بے توجہی ہے ۔ جیسے میں یہاں چینی زبان سیکھنے سے اجتناب کرتا ہوں ۔ ورنہ بیس برس میں "مجھ کو" کے معنی نہ آئیں ؟ شاید ان لوگوں کے خیال میں اردو زبان میں علمی زبان بننے کی قابلیت ہی نہیں ۱۲ [2] یہ بھی ناصر علی کے ہمعصر تھے اور شیخ سے متقدم ۱۲ ز ۔ ع

جیسا شیخ نے غنیمت کہدیا ہے اسی طرح ان دونوں کو بھی زیادہ سے زیادہ سمجھتے
ہونگے۔ اگر شیخ کے زمانے میں ہوتے تو مرزا سودا کا ایسا خطاب شیخ کے دربار سے
ملتا۔ یا کچھ دم مارتے تو خان آرزو کی طرح کوئی قطعہ اپنی شان میں بھی سنتے۔ میرے
خیال میں شیخ نے کسی ہندی کا کلام بگوش قبول نہیں سنا۔ بلکہ یہی کہتے رہے ؎

چو مرغ مطرب شو و بنشین و عرعر را تماشا کن

غنیمت سے پہلے وہ اہل زبان بھی گزر گئے ہیں جنہوں نے راستی پسندی کے سبب سے
اپنے عصر میں سرزمین ہندوستان کے خاکیان کا اہل الفن کا لوہا مان لیا۔ اُن کے
لطیفے مشہور مدنامہ ہیں۔ سعدی علیہ الرحمہ پیغمبر غزل۔ نظامی گنجوی امام مثنوی۔ ان
دونوں کا جواب تن تنہا حضرت طوطی ہند امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے دیا۔ حتی کہ کلام
سعدی کی حلاوت کے مقابلے میں ان کی غزل کی شورافگن ملاحت تسلیم کی گئی۔
اور مثنوی میں ملا جامی ایسا قادر الکلام خدا سے مناجات کرتا ہے ؎

سعد چو نظامی و چو خسرو ہزار بایدم از خوان سخن زلہ خوار

نظامی کے ساتھ خسرو کا نام لینے کے علاوہ دیکھنا چاہیئے کہ اس بیت سے
کس قدر رشک ٹپکتا ہے۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے حضرت امیر خسرو کو دو بار اپنے
ہاتھ سے اپنا کلام لکھکر بھیجا اور اُن کے حسن کلام کی داد دی اور شوق دیدار کے
ساتھ عذر پیرانہ سالی لکھا۔ اس زمانے میں خسرو نوجوان تھے اور سعدی کا سن
منتہائے پیری تک۔ بڑھے ایرانی کا نوجوان ہندی کی یکتائی تسلیم کر لینا
قابل غور ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں مثنوی قران السعدین خسرو کے دو شعر
ہیں۔ موسم خزاں کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

لالہ فرو ریخت و بہ پیش باد خون خود آنجا کہ خوے گل فتاد
فرش بہ پیچید گل از روئے گل خواند غلیواز کلی التجمل

قابلِ ذکر یہ بات ہے کہ "پسینے کی جگہ خون گرانا" خاص ہمارا محاورہ ہے۔ شاید اہلِ فارس کے کلام میں اس کا پتہ نہ چلے۔ علیٰ ہٰذا القیاس غلیواز کی "کَطِی اِسمٰعِیل" خوانی۔ بچپن میں عورتوں سے سُنا کرتے تھے کہ پرندے سب کے سب ملا۔ دن بھر میں کئی کلام اللہ ختم کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ چڑیا کی زبان پر "جیم جیم" ہے۔ میاں کوّے "حساب کاف قاف" رٹتے ہیں۔ کالا تیتر "اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" پڑھتا ہے۔ اور چیل "کَطِی اِسمٰعِیل" کہتی ہے۔ جس دن اس کے ساتھ "لِلکُتُب" کا ٹکڑا ملا دے گی قیامت آجائے گی۔" یہ اپنے محاوروں کا فارسی میں خوبصورتی سے باندھنا میرا خیال ہے کہ اگر شیخ حزیں کے زمانے میں کوئی ایسا کرتا یا آج ہمارے زمانے میں کوئی ایسی جرأت کرے تو دیوانہ سمجھا جائے۔ اور اہلِ زبان تو اُسے قابلِ خطاب بھی نہ سمجھیں۔ کجا یہ کہ ملا جامی بہارستان میں سعدی نظامی وغیرہ کے ساتھ خسرو دہلوی اور حسن[1] دہلوی کا نام لیں۔ اور ان کا کلام جگر کاوِ رشک دیکھیں۔ اللہ رے انقلاب۔ ملا جامی کے ہمعصر ملا جمالی دہلوی کا لطیفہ بھی مشہور ہے۔ دونوں صاحبِ کمال ایک دوسرے کی ملاقات کے کمال مشتاق تھے۔ ملا جامی ایک خوددار باوقار آدمی تھے اور ہمارے حضرت جمالی ایک شوریدہ مزاج آزاد منش۔ وہ تو ہندوستان کا بیکو آتے یہ خود ہی خاک چھانتے مصیبت جھیلتے اُن کے پاس پہنچے۔ اور اسی صورت سے غبار آلودہ چہرہ۔ پھٹے پرانے کپڑے میلی کچیلی حالت اُن کے قریب جا بیٹھے۔ ملا جامی ایک تو نازک مزاج دوسرے خدا جانے اُس وقت طلبا کو درس دے رہے تھے، یا فکرِ شعر میں محو تھے، ایک اجنبی شخص کی اس گستاخی پر چیں بجبیں ہو کر بولے "در میانِ تو و سگ چہ تفاوت است؟"

---

[1] حسن دہلوی کی تصنیفات خدا جانے کیا کیا ہیں اور مطبوع ہیں یا غیر مطبوع۔ میں نے تو صرف انکی ایک غزل سُنی ہے جسکا مقطع ہے۔ بندہ حسن بصد زبان گفت کہ بندۂ تو ام۔ تو بزبانِ خود بگو بندہ نواز کیستی۔ افسوس اتنا بڑا شہرۂ آفاق کامل شاعر اور کلام شہرۂ عالم نہ ہو۔ ہندوستان کی تقدیر ہے

اُنہوں نے اپنے اور اُن کے درمیان کا فاصلہ ناپ کر سادگی سے جواب دیا۔
"مقدار یک وجب"۔ اس حاضر جوابی پر ملا صاحب چونکے اور نام پوچھا۔ چونکہ ملا
جامی فنِ معما گوئی میں بھی کامل تھے اس لئے ملا جمالی نے اپنا نام معمے[1] میں بتایا
جَمعَ مَالاً وہ سمجھ گئے اور کہا کہ حضرت! ابھی پورا نام نہیں ہوا ایک حرف
دی،ں کی کمی ہے۔ یہ فوراً بولے وَعَدَّدَہٗ ملا جامی اُٹھ کر بغلگیر ہوئے۔ اپنے
مہمان کو بہ تعظیم و تکریم بٹھایا۔ آپس میں کلام بازی ہوئی۔ ملا جمالی کے جن شعروں
پر ملا جامی پھڑک پھڑک اُٹھے اُن میں سے یہ شعر زبان زد ہے ؎

ملا ز خاک کوئے تو بر سر بود ہنوز
وال ہم زآب دیدہ صد چاک تا بدامن

حسّان الہند مولانا غلام علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں کہ یہ خاک کے تناسب سے
برتن اور چاک کا لفظ شعر میں لانا ہندی طبیعت کا اثر ہے۔ مرزا عبد القادر
بیدل کو سُنا ہے اہل ایران خلاق المعانی کہا کرتے تھے۔ غنی کشمیری اور صائب
کا ایک زمانہ تھا۔ مَیں نے کہیں لکھا دیکھا ہے کہ صائب نے فقط غنی کا کلام
سُنکر اُن سے ملنے کو کشمیر آنے کی زحمت گوارا کی۔ اکثر غنی کا یہ شعر پڑھ
پڑھ کر وجد میں آجاتے تھے اور کہا کرتے تھے کاش یہ کشمیری میری عمر بھر کی کمائی لیتا
اور اپنا یہ ایک شعر مجھے دیدیتا ؎

سبزہ رنگے بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

اللہ اللہ۔ کیا بے تعصب لوگ تھے۔ کیا منصف طبیعتیں تھیں۔ کاش شیخ علی حزیں

---

[1] کسی صاحب کو حل معما میں تردد ہو تو حل بھی عرض کئے دیتا ہوں۔ جَمعَ مَالاً میں جمع
کو مع مال کے لو۔ جمال حاصل ہوا۔ وَعَدَّدَہٗ میں عَدَّدَ گویا عَدَّ سے
صیغہ ماضی ہے بمعنی شمار کرد۔ اور دَہٗ گویا فارسی لفظ ہے دس کے معنی میں جو حرف ی کے
بحساب ابجد عدد ہوتے ہیں۔ ۱۲ رعب [2] ایسا ہی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی رحمہ کے متعلق مشہور
[illegible]

بھی ایران سے ہند میں ایسی ہی طبیعت لیکر آتے - شیخ کی شکایت تو اس بارے میں
خیر بجا سمجھتے یا بیجا - زیادہ تر افسوس انپر اہلِ ملک پر آتا ہے کہ یہ بھی اہل ایران کی
تعریفوں کے توپل باندھینگے اور اپنے ہموطنوں سے کنارہ کش رہینگے - غریبوں کا
ذکر بھی آئیگا تو وہ باتیں بیان کیجائینگی جن سے مدح بھی ہجو ملیح ہو جائے - مثلاً
امیر خسرو کی تعریف کے ساتھ ان کی پہیلیاں کہ مکرنیاں وغیرہ سنائی جائینگی -
علامہ فیضی کے علم و فن کی داد دینگے تو عرفی کا لطیفہ "ماکیا نیم" کے جواب میں
"مرغِ روح در پرواز ماکیاں را چکنم" بیان ہوگیا - انہیں اطلاع بتایا جائیگا کہ دھوکے
بازی اہانت سے تو وہ شعرا کے قصائد کا صلہ بادشاہ سے خود وصول کر لیا کرتے
تھے - جبکا انتقام عرفی نے نیچا دکھا کر لیا - انہوں نے رشک سے عرفی
کو زہر دیکر مار ڈالا - یہ سب سر و پا بازاری گپیں ہیں تعجب ہے کہ بعض اہل علم سے بھی
سنی گئیں - بھلا انصاف سے دیکھا جائے تو علامہ فیضی سے عرفی کو کیا نسبت
اور کس فن میں عرفی کو انکا مد مقابل ٹھہرایا جا سکتا ہے - یہ جو قصائد کے صلہ و انعام
کا رشک و حسد مشہور ہے اس شخص کو کیونکر یقین آئیگا جو جانتا ہے کہ جب علامہ فیضی
اپنی تفسیر بے نقط سواطع الالہام کی تصنیف سے فارغ ہوئے تو اکثر علما و شعرائے
دربار اکبری نے اس کی تقریظیں اور تاریخیں لکھیں - ملا نور الدین ظہوری نے مادۂ تاریخ
سورۂ اخلاص سے نکالا جسکو علامہ موصوف نے بہت پسند کیا اور صلے میں ملا ظہوری
کو دس ہزار روپے عطا فرمائے - ایسا فراخ دست عالی حوصلہ ملک الشعرا مذہباً
ایک حقیر غریب الوطن شاعر کے انعام پانے پر کیا رشک کریگا ؟ ناصر علی سرہندی
کے کمال سے بحث ہوگی تو زیب النسا بیگم کے لطیفے بیان کئے جائینگے کہ بیگم نے
مصرع پر مصرع لگایا ؎ گویا رسید بر لب زیب النسا بگم - بیگم کو کوٹھے پر سرخ لباس
زیب تن کئے دیکھکر کہا ؎ سرخ پوشے بلب بام نظر مے آید - بیگم کو برقع اوڑھے

باغ کی طرف جاتے دیکھ کر پڑھا ؎

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش　　تا نکہتِ گُل بیختہ آید بدماغش

اس مطلع کی نسبت (باوجود برجستگی کے ساتھ) کس کی مجال ہے کہ کلام کرے مگر ناصر علی کے لئے قابلِ تعریف بات نہیں۔ میرے نزدیک یہ مضمون دراصل سید عبدالجلیل بلگرامی حافظ قاموس نے پیشتر ہندی میں باندھا ہے ؎

پھلواری گھونگھٹ کئے پائیں جات　　سُمَن باس بِن پہچانے نا ہیں سُہات

باغ میں گھونگھٹ نکالے ہوئے جاتی ہے کہ　　پھول کی خوشبو بغیر چھنے نہیں پہنچتی

شاید کوئی کہے برعکس بھی ممکن ہے۔ یعنی سید صاحب نے یہ مضمون ناصر علی کے مطلع سے لیا ہو۔ مگر میرے خیال میں سید صاحب نے کمال نکتے سے یہ ہندی شعر فرمایا ہے۔ اور ناصر علی نے برجستہ حسب حال موزوں کیا۔ جس سے پایا جاتا ہے کہ یہ ہندی شعر اُن کے ذہن میں ہوگا۔ اسی مضمون کو فارسی میں ادا کر دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ناصر علی نے تو ایک حالت دیکھی۔ سید صاحب کو ایسا موقع کب ہاتھ لگا؟ میں جواب دونگا۔ یہ شاعر کے ذہن کی رسائی کا کرشمہ ہے۔ جس سے خلیفہ ہارون رشید سخت متعجب ہُوا تھا جب اُس نے اپنی سُسرال میں ایک زردوز مغرق فرش پر قدم رکھا تو اُس پر موتی نچھاور کئے گئے۔ سُنہری فرش پر موتی بکھرے ہوئے دیکھکر خلیفہ نے کہا "خدا ابونواس کو غارت کرے۔ کیا اُس نے کبھی یہ سماں دیکھا تھا کہ شراب کی تعریف میں کہتا ہے ؎

كَاَنَّ صُغْرىٰ وَكُبْرىٰ مِنْ فَوَاقِعِهَا　　حَصْبَاءُ دُرٍّ عَلٰى اَرْضٍ مِنَ الذَّهَبِ

شراب کی سطح پر اس کے چھوٹے بڑے بلبلے　　گویا سونے کی زمین پر موتیوں کے سنگریزے ہیں

بالفرض یہ مضمون بھی ناصر علی کا سہی۔ مگر ان لطیفوں کے بیان سے ناصر علی کی تعریف کونسی نکلی؟ یہ تمسخر کی باتیں ہیں۔ شکایت تو یہ ہے کہ ہندی اہل کمال کے کلام کی

خوبیاں اس طرح نہیں دکھائی جاتیں جس طرح شعرائے ایران کی۔ بلکہ بیدل اور ناصر علی کے ذکر آنے پر تو انہیں مشکل پسند کہکر خاموش ہو جاتے ہیں۔

کچھ تعصب بری امراد ہندوستانی خمیر کا بھی اثر سمجھنا چاہئیے کہ یہاں گو کلام کی بڑی مشکل سے جوگی سمجھا جاتا ہے۔ شمس العلماء آزاد دہلوی کے تذکرہ آبحیات (مطبوعہ بار دوم) میں سے مجھے مومن دہلوی کے حال کی تمہید نہیں بھولتی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے نزدیک مومن کو شعرائے اردو کے کسی زمرہ میں شمار ہونے کا حق ہی نہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں میاں مومن ایک معمولی شوقین طبع شعرا سے جاتے تھے۔ نہ کہ مسلم الثبوت اُستاد۔ لوگوں کے کہنے سننے سے مجبوراً با دل ناخواستہ حضرت آزاد نے مومن کو بھی دوسرے ضمیمہ میں داخل کر لیا۔ وہ بھی اپنے الفاظ میں نہیں۔ جو کچھ اُلٹا سیدھا مومن کے کسی ارادتمند نے لکھ دیا۔ آپ نے مطابق اصل اسی کو بلا تصرف نقل کر دیا۔ حالانکہ مومن وہی شخص ہے جس کے مرنے پر مرزا غالب نے یوں اظہار غم فرمایا ؎

کہ — باشم اگر بمرگ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

یہ بات یاد آجاتی ہے۔ اسی آبحیات میں مرزا غالب کے حالات میں ایک لطیفہ ہے کسی نے اُن سے سوال کیا۔ مرزا! آپ نے ائمہ علیہ السلام اور ائمہ کرام کی تو خوب مدح سرائی کی کسی اور خلیفہ کو کیوں یاد نہیں کیا؟ مرزا صاحب نے ایک برجستہ جواب دیا۔ حاشیے پر لکھا ہے کہ یہ لطیفہ کئی شاعروں کی طرف منسوب ہے۔ ایک دوسرا لطیفہ ہے کسی نے اُن کی محفل میں کہا شراب پینے سے دُعا قبول نہیں ہوتی۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق ظریفانہ مسکت جواب دیا۔ میرا مقصد بیان کرنے سے یہ ہے کہ موخر الذکر لطیفہ مرزا بیدل نے کسی واعظ (؟) رند کا لکھا ہے۔ رند کا جواب ہے ؎

دے کار زو شد نشتے کامیاب   دُعائے دگر گونہ شُد مستجاب

نہیں یہ بھی اگر بتا دیا جاتا کہ مرزا کا یہ جواب مرزا بیدل سے خود ہی تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرزا نوشہ اپنے ہم ملک کا بھی سیفہ اپنے غور کرتے ہیں۔ گو یہ ثابت ہو کہ ابتدا میں بیشک مرزا بیدل کی تتبع ہو کر مرزا بیدل کو

گرچہ بیدل ز اہلِ ایران نیست   لیک ہمچوں قتیل نادان نیست

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف آبحیات کو بیدل کے کلام سے کوئی دلچسپی نہیں ہی۔ اس لئے انکا کلام دیکھنے کی تکلیف ہی نہیں اُٹھائی۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ یہ لطیفہ قلم سے نکلتا اور حاشیہ نہ چڑھتا۔

خیر۔ یہ باتیں تو زلف دراز کا افسانہ سمجھئے۔ اب ذرا آپ ہم برسرِ مطلب کو ملاحظہ فرمائیے
شیخ علی حزیں کے اقتباس کلام میں آپکو میں وہ اشعار یاد دلانا چاہتا ہوں جو "خاص رنگ حزیں" کے تحت میں کسی مخصوص رائے زنی کے ساتھ مذکور ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں ہر اُستاد کا ایک رنگِ خاص ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اُستاد مانا جاتا ہے۔ مگر اس صفت ممیزہ یعنی رنگ کو الفاظ کا جامہ پہنانا میرے نزدیک محالات سے ہے۔ بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہر اُستاد کی ایک خاص طرز ادا ہوتی ہے۔ جس کا ادراک فقط ذوق پر موقوف ہے۔ مثلاً ؎

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا   کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

اور ؎

یہ لاشِ بیکفن اسدِ خستہ جاں کی ہے   حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

دونوں ہم مضمون مقطعوں کو طرزِ ادا نے کتنا الگ الگ کر رکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ کہنا سراسر ظلم ہوگا کہ "لاش بے کفن" خاص غالب کی روش ہے۔ کیا ذوق کے یہاں ایسے الفاظ نہ ملینگے؟ یا جیسے دبیر و انیس کے مشہور مصرعے ؎

بھائی ہمارا نام مبارک حسین ہے

اور سے ؎ مولانا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں۔

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ آپ نے جو اشعار شیخ کے خاص رنگ میں لکھے ہیں وہ بیشک اُن کا خاص رنگ ہے۔ لیکن بعض اشعار ہیں جو بعض خاص الفاظ کو خصوصیت سے ذکر فرمایا ہے۔ اُنکو کلام شیخ کے لئے مابہ الامتیاز نہیں تسلیم کرتا۔ گو جانتا ہوں میں کیا اور میری تسلیم کیا۔ تاہم انسان ہوں۔ خدا نے دل کے ساتھ زبان بھی دی ہے۔ جو جی میں تھا صاف کہدیا۔ گستاخ النماسی کی معافی مانگ چکا ہوں۔ شیخ کے اس مطلع پر سے ؎

نگاہ ناز او فہمید راز سینہ جوشی را | رساند آخر بجائے عشق فریاد خموشی را

آپ فرماتے ہیں" فریاد خموشی قابلِ توجہ ہے۔ بیشک قابلِ توجہ ہے۔ مگر اس میں خاص رنگ کی کونسی بات ہے؟ میں اپنے ذہن ناقص کے موافق خاکیانِ ہند میں سے مرزا بیدل کو شیخ کے مقابلے میں لاتا ہوں۔ مگر خوب یاد رکھئے کہ یہ مقابلہ دکھانا بخدائے لایزال اس غرض سے ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ میں آپ سے مجادلہ طلب ہوں۔ بلکہ مدعائے اصلی یہ ہے کہ جس طرح آپ نے کلام شیخ کا انتخاب ناظرین مخزن کے سامنے پیش کیا ہے اسی طریق سے مستقل طور پر اپنے ملک ہندوستان کے کاملین کا کلام بھی منتخب فرمایئے۔ کہیں کہیں جو آپ نے امیر خسرو یا مرزا غالب کے اشعار بھی مقابلے میں لکھے ہیں تو معلوم ہوتا ہے آپ بھی جبر کستہ ہمصفیر ہیں۔ اور اگر میں نے غلطی کی۔ مرزا کو شیخ کا جواب قرار دینے میں دھوکا کھایا تو تنبیہ فرمایئے۔ مجھے گردنِ تسلیم خم کرنے میں کچھ پس و پیش نہ ہوگا۔ "فریادِ خموشی" میں شاید یہی بات ہے کہ ضد کو ضد کی طرف مضاف کیا۔ مرزا بیدل ؎

نالہ ہا در شکن دامِ خموشی داریم | خفتہ پرواز در آغوشِ شکست پرِ ما

"نالہ در شکن دام خموشی" اور "پرواز در آغوشِ شکستِ پر" ملاحظہ ہو سے

چو رنگ بسکہ سرتا پا طلسمِ سازِ خاموشی شکستن ہم نبرد از پیکرِ من صیدا تنہا

سازِ خاموشی ۔ فریادِ خموشی ہا ۔ اور مصرعِ ثانی کا لطف تو ظاہر ہے ۔ اسی قسم کے دو شعر ناصر علی کے یاد آ گئے ؎

بحشر حرف بے صوت است فریادِ شہیدانش نمیدانم کہ داد اہلِ سرِ چشمِ خموشانش

دوسرا تو قیامت کا مطلع ہے ؎

مدتے از کم حرفے لعلِ لبِ نوشِ تو ام من کبابِ آتشِ بسیار خاموشِ تو ام

اس کبابِ آتشِ بسیار خاموش کو ذرا فریادِ خموشی سے ملائیے ۔ بیدل کا بھی ایک ایسا ہی شعر ہے گو مضمون اور ہے ؎

شمعِ تصویرِ من از داغ ہم افسردہ است اینقدر سوختۂ آتشِ خاموشِ خودم

آپ نے شیخ کے اس شعر پر ارشاد فرمایا ہے ؎

خوب آمدی اے شورِ نمکدانِ قیامت بے جست ترا داغِ پریشاں نظرہا

کہ داغِ پریشاں نظر حزیں کے سوا کون کہہ سکتا ہے؟ یہ مبالغہ آمیز ادعا شاید آپ ہی کو پسند ہو ۔ ورنہ ایسی ترکیبیں شیخ سے مقدم ہندی نژادوں کے کلام میں بکثرت ملینگی ۔ مجھے آپ کا ایسا فرمانا محض جوشِ ارادت کی بنا پر معلوم ہوتا ہے اور سوانح نویسوں کا کچھ قاعدہ بھی ہے کہ صاحبِ سوانح کی مدح میں ایسا مبالغہ روا رکھتے ہیں ۔ گو حقیقتِ حال یہ ہے کہ وہ مدعیِ سخن سنجی بہت جھوٹا کیا ہی قابلِ نفرین ہے ۔ جو ایسے معنی آفرین کے ساتھ حسنِ عقیدت نہ رکھے ۔ مگر گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر ۔ حُبُّکَ الشَّیَٔ یُعْمِی وَیُصِمُّ کی حد تک پہونچنا ٹھیک نہیں ۔ جو لوگ ہمارے سرمایۂ فخر و ناز گذرے ہیں ان کا لحاظ بالتخصیص ضروری ہے ۔ ایک بیدل ہی کے کلام میں ایسی سیکڑوں ترکیبیں دیکھ لیجئے مثلاً

بحیرتم کہ چہ مضمون در آستیں دارد نگاہِ عجز سرشک است مہرِ طومارش

نگاہِ عجز بسر شکست۔ اور ؎

چو عمرے یکقلم موج ست شوق بیخودی جوشم تمنائے کنارے دارم طوفاں در آغوشم

شوق بیخودی جوش۔ داغ پریشاں نظر۔ شیخ کے اس شعر پر آپ لکھتے ہیں ؎

نہ مہ کنعاں نہ در بازار حسرت عنواں دیدن بیاباں گرد حیرت کرد شوق کارواں ما را

بیاباں گرد حیرت" خاص شیخ کی روش ہے۔ میں کہتا ہوں یہ روش بیدل کے یہاں

بہت ہے۔ جیسے ؎

غبار انگیز شہرت نیست وضعِ خاکسار من فرو شستہ داشتم گم کردہ ام در ستر پیدا

اور ؎

دو ابرو تو شکن پرور تغافل چند مقام فتنہ مکن گوشۂ فراغ مرا

"غبار انگیز شہرت" اور "شکن پرور تغافل" دیکھئے۔ اسی طرح یہ شعر بھی قابل ملاحظہ ہے

ترشح مانہ نازی دلے را محو احساں کن تبسم میکنی آئینہ برگیر و نمکداں کن

"ترشح مانہ ناز" کچھ اس سے بھی بڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ شیخ کا شعر ہے ؎

زسرتا پا نیازم چوں ہلال از دولت نازت جبینے کردہ ام دریوزہ از ماہ تمام تو

ارشاد ہوتا ہے کہ "جبینے کردہ ام دریوزہ" شیخ کا انداز خاص ہے۔ کیا بیدل کا یہ شعر

اس کے مقابل نہیں ہو سکتا ؎

لبریزیم از نقش رو تمنائے جلوہ کز شرم چوں عرق کنم آئینہ خانہ ام

دوسرا مصرع توجہ طلب ہے۔ "آئینہ خانہ ام" دیکھئے۔ علیٰ ہذا القیاس ؎

عمرے ست کز امید دلے نقش بستہ ام گر حسن کم نگاہ فتد وائے آئنہ

"دلے نقش بستہ ام" اور "جبینے کردہ ام دریوزہ" میں کیا فرق ہے؟ حزیں کا شعر ہے ؎

گرہ از بسکہ در دل گریۂ طوفاں نسب دارم نفس در سینہ ام سیلِ شتاب آلودہ را ماند

آپ کا قول ہے "گریۂ طوفاں نسب" شیخ کی ترکیب خاص ہے۔ کیا یہ معلوم فرما کر آپ متعجب نہ ہوں گے

کرشنج سے پہلے بیدل کہ گیا ہے ؎

آسے حد و نسب توکل چند　　چند سرمۂ تا کی چند

تردد نسب طوفاں نسب۔ بہ ترکیب اضافی پورا جواب سنئے۔ کیا خوب کہا ہے۔

کمی ابروان جبین نسبش　　بر تبسم گرفتہ راو لبش

ابروان جبیں نسب ملاحظہ فرمائیے۔ بعینہٖ گریۂ طوفاں نسب ہو۔

اب زیادہ نگاہ آناری نہیں چاہتا۔ آپ کی طبیعت مجھے تذکرہ نویسی کے نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان ہندی حضرات کی طرف بھی توجہ فرمائیے تو کیا برا ہے۔ ورنہ آپ بھی تماشا دیکھ رہے ہیں۔ فارسی کے قدم ہندوستان سے اکھڑ تو چلے ہی ہیں۔ آجکل جو چند صورتیں فارسی دانوں کی نظر آتی ہیں۔ یہی لیل و نہار ہیں تو چند سال میں بغیر اپنے جانشین چھوڑے نظروں سے مخفی ہو جائینگی۔ یہ اہلِ علم کی کم توجہی کا نتیجہ ہے کہ ان بزرگوں کی قلمی کتابیں معدوم ہو گئیں۔ مطبوعۂ نول کشور۔ امیر خسرو۔ بیدل۔ ناصر علی وغیرہ کے کلام دیکھ کر رونا آتا ہے۔ کاتبوں اور مصححوں کی دستبرد سے ہر مرتبہ طبع ہونے میں ماشاء اللہ اس قدر اصلاحوں سے آراستہ یا مسخ ہوتے جاتے ہیں کہ مجھ ایسا ناقابل تو روپے میں دو آنے بھی پورے طور پر سمجھنے سے عاجز ہے۔ یہاں میرے پاس دیوان بیدل ہے۔ اسی سے یہ اشعار لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حسن اتفاق ہی ہوگا۔ جو کوئی شعر صحیح کاتب کے قلم سے نکلیگا۔ تبسم کو تیمم۔ جبیں کو جبین۔ نمک کو نبک لکھا ہوا دیکھتا ہوں اور سر پیٹتا ہوں۔ ہر غزل میں دو چار مصرعے ناموزوں۔ اور رباعیات میں تو کاتب نے وہ اپنی موزونی طبع کے جوہر دکھائے ہیں کہ جل و جلّ۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ الٰہی یہ کونسا رباعی کا وزن ہے۔ یہی حالت دیوان خسرو و ناصر علی کی

بھی دیکھ چکا ہوں۔ با ایں ہمہ یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر یہ مطبع ان حضرات کے
کلام بہم پہنچا کر شائع کرتا تو کبیرداس کے بھجنوں کی طرح صرف زبانوں پر چند اشعار
ہوتے۔ وہ بھی شاید چند نسلوں تک یاد رہتے۔ مگر موجودہ حالت میں کہا جا سکتا
ہے کہ اگر یہ کلام یونہیں بگڑتے رہے تو تھوڑے عرصے میں اس قابل ہونگے کہ چھپنے
سے نہ چھپنا ہی اچھا تھا۔ بہرحال آپ کے ایسے اہل قلم سے جس قدر تازگی ان کے
کلام کو حاصل ہو سکے کیوں کمی کیجئے؟ خدا رسالہ مخزن کی عمر میں برکت دے
اُس نے اپنے ملک کے لئے علمی خدمات کا بیڑا اٹھا ہی رکھا ہے۔ یقیناً آپ کے
پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت کچھ موجود ہوگا۔ نگاہ آپ نے نہایت غور رس پائی ہے۔
بہر حال تو پیشتر مرزا بیدل ہی کو لے لیجئے۔ ان کے کلام پر رائے زنی فرمائیے
بیدل کا کلام ان بحروں میں بالخصوص قابل تذکرہ و تحسین ہے جن میں فارسی شعرا
نے شاذ و نادر فکر کی اور انہوں نے بڑی سلاست سے اکثر غزلیں لکھیں مثلاً

سر غنچش بپای عندلیب کشته از شکوه خرام او　　که ملال خط زمین کشد به تبسم لب بام او
نفست بسینه شکسته به دیر جستجوش شکسته　　نشود که رم کند از نظر خوشگاه وحشی رام او

بجهت جوهر طرف شتابم همان جنون دماغ عمرم　　بزیر پایست گرسیایم وطنی که گم کرده ام بگویید

نیز

چو نفس ختم انکار به فغانی وحشت　　که بگرد دو جهان آب زدی گر نشستی

اور

ز سرے تکلّے بجنون ستمے　　شکسته را قوام ده تمکے سا گداز کن

کہ شیخ سے پہلے بیدل کہہ گیا ہے ؎

اے حمد و نسب تو گل چند　　　جہد سرمہ تا گل چند

تمرّد و نسب طوفان نسب۔ بہ ترکیب اضافی پورا جواب سنئے۔ کیا خوب کہا ہے ؎

گہی ابروان جبین نسبتش　　　بہ تبسم گرفتہ راو لبش

ابروان جبین نسبت ملاحظہ فرمائیے۔ بعینہٖ گریۂ طوفان نسب ہے۔

اب زیادہ نگاہ آزاری نہیں چاہتا۔ آپ کی طبیعت مجھے تذکرہ نویسی کے نہایت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اگر ان ہندی حضرات کی طرف بھی توجہ فرمائیے تو کیا برا ہے۔ ورنہ آپ بھی تماشا دیکھ رہے ہیں۔ فارسی کے قدم ہندوستان سے اکھڑ تو چلے ہی ہیں۔ آجکل جو چند معدودے فارسی داں کی نظر آتی ہیں۔ یہی لیل و نہار ہیں تو چند سال میں بغیر اپنے جانشین چھوڑے نظروں سے مخفی ہو جائینگی۔ یہ اہلِ علم کی کم توجہی کا نتیجہ ہے کہ ان بزرگوں کی قلمی کتابیں معدوم ہو گئیں۔ مطبوعہ نول کشور۔ امیر خسرو۔ بیدل۔ ناصر علی وغیرہ کے کلام دیکھ کر رونا آتا ہے۔ کاتبوں اور مصححوں کی دستبرد سے ہر مرتبہ طبع ہونے میں ماشاء اللہ اس قدر اصلاحوں سے آراستہ یا مسخ ہوتے جاتے ہیں کہ مجھ ایسا ناقابل تو روپے میں دو آنے بھی پورے طور پر سمجھنے سے عاجز ہے۔ یہاں میرے پاس دیوان بیدل ہے۔ اسی سے یہ اشعار لکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ حسن اتفاق ہی ہوگا۔ جو کوئی شعر صحیح کاتب کے قلم سے نکلیگا۔ تبسّم کو تیمم۔ جبین کو جبین۔ نمک کو نبک لکھا ہوا دیکھتا ہوں اور سر پیٹتا ہوں۔ ہر غزل میں دو چار مصرعے ناموزوں۔ اور رباعیات میں تو کاتب نے وہ اپنی موزونی طبع کے جوہر دکھائے ہیں کہ حل و جل۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ ابھی یہ کونسا رباعی کا وزن ہے۔ یہی حالت دیوان خسرو و ناصر علی کی

بھی دیکھ چکا ہوں۔ بایں ہمہ یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر یہ مطبع ان حضرات کے
کلام بہم پہنچا کر شائع کرتا تو کبیر داس کے بھجنوں کی طرح صرف زبانوں پر چند اشعار
ہوتے۔ وہ بھی شاید چند نسلوں تک یاد رہتے۔ مگر موجودہ حالت میں کہا جا سکتا
ہے کہ اگر یہ کلام یونہیں بگڑتے رہے تو تھوڑے عرصے میں اس قابل ہونگے کہ چھپنے
سے نہ چھپتے تو اچھا تھا۔ بہرحال آپ کے ایسے اہل قلم سے جس قدر تازگی ان کے
کلام کو حاصل ہو سکے کیوں کمی کیجئے؟ خدا رسالہ "مخزن" کی عمر میں برکت دے
اس نے اپنے ملک کے لئے علمی خدمات کا بیڑا اٹھا ہی رکھا ہے۔ یقیناً آپ کے
پاس کتابوں کا ذخیرہ بہت کچھ موجود ہوگا۔ نگاہ آپ نے نہایت عمدہ پائی ہے
بہر نسخے تو بیشتر مرزا بیدل ہی کو لے لیجئے۔ ان کے کلام پر رائے زنی فرمایئے
بیدل کا کلام ان بحروں میں بالخصوص قابل تذکرہ و تحسین ہے جن میں فارسی شعرا
نے شاذ و نادر فکر کی اور انہوں نے بڑی سلاست سے اکثر غزلیں لکھیں مثلاً

سر نقش پا بہ عجز ے کشد از شکوہ خرام او   کہ بہ تال خط زمیں کشد بہ تبسم لب بام او
نفست بسینہ شکستہ بہ درِ جنبشِ مژہ بستہ   نشود کہ رم کند از نظر چو نگاہِ وحشی رام او

بجہت جو ہر طرف شتابم ہماں جنوں ز دامن طرازم   بزیر پا بہت گر سیاہ دولے کہ گم کردہ ام بگویت

یا —

چو نفس مغتنم انکار پر افشانی وحشت   کہ بگردِ دو جہاں آب ندی گر تو نشستی

اور —

باساے تکلف بجنونِ سے تبسمے   شکرے را قوام دہ نمکے را گداز کن!

شاید آپ فرمائیں کہ ذرا انہیں قلم اٹھاؤ۔ میں بادب عرض کرونگا مجبور ہوں
نہ محنت شناسی کہاں سے لاؤں! اور اگر ارادہ بھی کروں تو ایسی کتابیں
کیونکر پاؤں۔ علاوہ کتب کا تو میری عادت کے نزدیک عدم وجود برابر ہے
پھر اظہار مافی الضمیر کا بھی ملکہ تو نہیں۔ اس مضمون کے لکھنے میں خدا جانے
کے جگر شو کریں کمائی ہونگی۔ اور بفرضِ محال سب کچھ ہو تو ارادہ تصنیف کی
تحریک یعنی فراغ خاطر کسے میسر۔ جس کی دلیل آجکل ایسے وحشت آباد میں
میرا قیام ہے۔ جہاں کسی قسم کی علمی صحبت نہیں۔ گویا ہشیاروں میں دیوانہ
ہوں۔ بالعکس پہلو میں دل ہے اور ہندوستاں کی یاد سے

نفس بعد یاس شکستہ ام ز گداز عالم پیری بیدل
چہ تسلی رحم است بر اسیرے۔ کہ گمش از سوختن آرد

ابوالصواب عبد قریشی انصاری شاہ آبادی
از پیکن (چین)

ادیب الاطفال } یہ چھوٹا سا ماہوار رسالہ ۱۸×۲۲ ۱/۸ کی خوشنما تقطیع پر مطبع اختر دکن حیدرآباد فرخندہ بنیاد (دکن) سے نکلتا ہے۔ پہلا نمبر بابت ۱۰ اگست سنہ ۱۹۱۱ء اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مضامین اور ترتیب کی بابت ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ چندہ سالانہ ۱۲ ہے۔ رسالہ کے مقاصد یہ ہیں۔ ہونہار بچوں میں شوقِ علم و تحریر و تقریر پیدا کرنا اور انہیں اخلاقِ حسنہ کا پابند بنانا۔ ہم اس نئے معاصر کا خیر مقدم کرتے اور اسکی ترقی اور ازدیادِ عمر کے دعاگو ہیں +

تائیدِ غیبی

بعض عمارتیں ایسی مشہور ہیں کہ جن کا نام لے دینا ہی کافی ہے۔ دلی کی جامع مسجد بھی اُن ہی میں سے ہے۔ کسی نے دلی کو دیکھا ہو یا نہیں جامع مسجد کو ضرور دیکھا ہوگا اور کچھ نہیں تو فوٹو ہی کی بدولت سہی۔ پرانے زمانے میں اگرچہ بہت سے سربرآوردہ اور متمول اشخاص اسی محلہ کے قرب و جوار میں رہتے بستے تھے۔ لیکن اب بھی کئی ایک حضرات چند شریف اور معزز خاندانوں کی یادگار زندہ ہیں۔ ان ہی خاندانوں میں سے ایک کے رُکن ہمارے اس واقعہ کے ہیرو ہیں۔ ان کی موجودہ حالت اعلیٰ درجہ کی فارغ البالی اور تموّل کا نمونہ ہے لیکن وہ جوانی کی خستہ حالی کی تکالیف اُٹھا چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ پیدا کیا صرف اپنی ہی قوتِ بازو سے۔ ان کی جوانی کا ایک واقعہ ہے جس کو وہ اپنی زبانِ مبارک سے اکثر خود بیان کیا کرتے ہیں۔ اس واقعہ کا ذکر کرنے سے ہمیں یہ دکھانا ہے کہ کئی حضرات جو سرے سے کسی قوتِ باطنی کے قائل ہی نہیں۔ اس سچے واقعے کو (جس کا ہیرو اس وقت تک بفضلہ زندہ اور نامور ہونے کے ساتھ ہی اس واقعہ کا مقر بھی ہے) کیونکر عقل کے تنگ دائرے میں کھینچ کر لاتے ہیں اور اتفاق یا چانس کی وسیع تاویل کر کے کیا کیا نکتے پیدا کرتے ہیں۔

ہمارے ہیرو کے والد ماجد پرانے زمانے کے تعلیم یافتہ اور شریف آدمی تھے وہ تو بھلا کیوں گوارا کرنے لگے تھے کہ لڑکا دولتِ علم سے بے بہرہ رہے۔ چنانچہ

تھے، وہ مینج آسنی وہسنگ۔ یہ بھی اپنی ہٹ کے پورے تھے، نہ پڑھنا تھا نہ پڑھے۔ عمر کے مراتق انہوں نے بہت کچھ تنبیہ کی، دھمکایا، ڈرایا، سختی سے کام لیا۔ مگر آخر کار کیا کرتے، بیچارے تھک کر بیٹھ رہے۔ صاحبزادے بزار ہزار کوششوں کے بعد اگر کچھ ہوئے بھی تو یونہی شُد بُد، اُردو لکھ پڑھ لیتے تھے۔ بس کہاں کا علم اور کیسی تعلیم۔ اللہ اللہ و خیر صلاح۔

اب انہوں نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ بچپن سے عنفوانِ شباب کا زمانہ آیا۔ جوانی کا بھوت اور آزاد طبیعت، جو کچھ رنگ لائے تھوڑا ہے۔ تموّل اگر نہ تھا تو تنگی بھی نہ تھی۔ معقول آمدنی تھی۔ جس سے سارا گھر بسر اوقات کرتا تھا۔ تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے کو کمی نہ تھی۔ انکے والد فراخ حوصلہ اور اگر بُرا نہ مانا جائے تو فضول خرچ تھے۔ مگر خدا بھلا کرے اس نیک بھائی کا، جو بُرے بھلے میں اُن کے آڑے آ جاتا تھا۔ خیر جو کچھ بھی ہو وہ مرتے مر گئے مگر اُن کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ تنہے صاحبزادے۔ سو وہ آزاد طبع اور نوجوان، آنکھیں بند اور دل بے چین۔ جو چاہتے کرتے، اور جہاں چاہتے پھرتے۔ تضیعِ اوقات کے جس قدر مشاغل ایسے نوجوانوں کے ہوا کرتے ہیں، ان کے بھی تھے۔ چاوڑی کے چکر، بالاخانوں کی سیر، نشہ کی عادت، غرض کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے ان کی ذات مبرا ہوتی۔ ورزش کا بھی شوق تھا۔ اکھاڑوں میں جاتے، اور وہاں کے فیضان صحبت سے بھی مستفیض ہوتے۔ نماز تو کہاں، شاید نیت بھی نہ آتی ہو۔ کبھی بھولے بھٹکے عید اور الوداع میں چلے گئے تو خیر، ورنہ اُن کا مقولہ تھا کہ ع ہم کعبتیں چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے۔ عیاشی کا چسکا، فضول خرچی کا چسکا۔ آوارہ گردی، اس پر کوڑہ میں کھاج، طبیعت ایسی کا پایا، غرض انجاب، اور شباب خانہ خراب۔ نہ کوئی روکنے والا نہ ٹوکنے والا۔

خوب گھر سے اُڑائے، اور جو نہ کرنی تھی وہ بھی کی۔

آدمی جاتے، پیٹ جاتے۔ مگر معمول میں فرق نہ آئے۔ نگمبود کی چھڑیاں
شاہ بڑے کی گلگشت، سید حسن علی کا میلہ، قدم شریف کی باراں وفات، سعد ہا
آنند ونجیں اور آپ کی ذات۔ دن بھر جلے پاؤں کی بلی بنے رہتے۔ ان سب
میلے تماشوں کے علاوہ ان کا معمول تھا، کہ جمعہ کے جمعہ نہاتے دھوتے
بن سنور، کپڑے پہن، یہ جا وہ جا، سیدھے عیدگاہ کے پچھواڑے پہنچتے۔
یہاں اُس زمانہ میں جُتے بندھا کرتے تھے، کس کس آن دیکھے جانے تھے اور
مختلف تعلیموں کے پٹھے اپنے خلیفہ اور اُستاد کا نام روشن کیا کرتے تھے
میاں صاحب بھی گھر سے چلتے وقت ایک آنہ جیب میں ڈالجاتے۔ اور
وہاں پہنچکر یارانِ ہمرنگ کے ساتھ حقہ پان وغیرہ میں ختم کر دیتے کوئی
کمبخت جمعہ ایسا نہ آتا تھا کہ یہ نہ جاتے ہوں، اور چار پیسے نہ لیجاتے ہوں۔

آج جمعہ کا دن تھا اور ہمارے ہیرو جلدی جلدی نہا دھو رہے تھے۔
جب نہا دھو چکے تو گھر کی عورتیں کوئی میاں، کوئی بیٹا، کوئی بھائی کہتی
ہوئی اِن کے اردگرد جمع ہوئیں۔ لاکھ لاکھ طرح سے سمجھا رہی ہیں کہ "آج
نہ جاؤ۔ دھوپ تو دیکھو کیسی تڑاتے کی نکل رہی ہے، لُو ہے کہ توبہ توبہ جا
کا مزا آرہا ہے، ہرن کالے پڑے جاتے ہیں، چیل انڈا چھوڑتی ہے،
جانور زبانیں نکالے ہانپتے پھرتے ہیں۔ تیور جلے جاتے ہیں، آنکھوں کے
سامنے ترمرے آرہے ہیں، بھلا یہ بھی کوئی گھر سے باہر نکلنے کا وقت
ہے۔ کھانا کھاؤ، پانی پیو، اور ٹٹیوں میں آرام سے جا لیٹو۔ آبادی پنکھیا
جھلیگی، ذرا آنکھ لگجائے گی۔ ایسا ہی ہے تو پھر چلے جانا، ذرا دن ڈھل جائے

ہم تو ٹھنڈک ہو جانے دو؟

اُن کی والدہ ضعیفہ نے ہزار سر پٹکا۔ لاکھ منت سماجت کی، مگر وہ کس کی سُنتے تھے۔ جب تک کھانا کھاتے رہے، کچھ نہ بولے۔ سُنی ان سُنی کرتے رہے۔ جوں ہی فارغ ہوئے کھڑے کھڑے دو تین کلیاں کر، پان منہ میں لے۔ تن زیب کا انگرکھا زیبِ تن کئے، سر پہ ٹوپی رکھ۔ پیر پہ جوتی ڈال، لگے چلنے، اب بھی اگر کوئی انا دَدا، داری ہوتی سمجھانے آئی۔ تو اِس کان سُنی، اس کان اُڑائی۔ آناً فاناً چٹاپ ڈگیں بھرتے، جھٹ ڈیوڑھی کے باہر ہو ہی گئے۔ سڑک پر پہنچکر انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اور چار پیسے پڑے دیکھکر آپ کو اطمینان ہوا۔

گرمیوں کی دوپہر، العظمتُ للہ! دھوپ اور وہ بھی جیٹھ کی، ایک تو کریلا اوپر سے چڑھا نیم، توبہ! توبہ!! پھر گرم ہوا کے ناقابلِ برداشت جھونکے، اُس پر تھیلوں کے باہر کا جنگل، اُف! اُف!! کسکی ماں نے دھونسہ کھایا ہے جو اس وقت بلا وجہ اپنا بیجا پگھلانے کو نکل کھڑا ہو۔ ہوا کے جھکڑ سے رہے ہیں اوسان ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ دھوپ کی تیزی نے دماغ میں ہنڈیا پکا دی ہے۔ جنگل بیابان۔ دوپہر کی وجہ سے چاروں طرف سناٹا۔ میاں صاحبزادے سر او کانوں سے رومال لپیٹے، قدم بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔ مگر جوانی، ہائے جوانی، تو عجیب دیوانی چیز ہے جس کے سر چڑھتی ہے، جس کے سر چڑھتی ہے، جادو سے زیادہ کام کرتی ہے۔ جہاں اس کا قدم آیا، اور کسی نے ذرا بھی سر چڑھایا، تو بس کچھ نہ پوچھئے کہ کیا کیا کچھ گذرتی ہے۔ شرم کا لحاظ، ادب کا پاس سب بالائے طاق۔ پھر تو یہ منحوس قدم، سامنے کی دونوں سیم کر دیتی ہے۔ دُنیا کے

نشیب و فراز سوجھتے ہی نہیں، اونچ نیچ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ عقل انسانی بغیر کوئی پس و پیش کئے، گردن ڈالے، شباب خانہ خراب کے پیچھے پیچھے، جدھر منہ لیجائے آگے بڑھی جاتی ہے۔ جوانی میں انسان کی ہر قوت جوان ہوتی ہے، اچھی شکلوں کا تو کہنا ہی کیا۔ حُسن خدا کی رحمت ہی، مگر کالی کالی صورتیں بھی کچھ اس طرح دل کھینچ لیتی ہیں کہ، باید و شاید۔ لیکن ہائے! مُردے کے چہرے پر چار چلّو خون رکتا ہی نہیں۔ اور رُکے تو کیونکر؟ اول تو بہت کم ایسے ہونگے جو اپنے زمانے میں اسے دیکھیں اور قدر کریں شباب کا بندہ، آنکھوں کا اندھا، سب کچھ سنتا ہے، لیکن سمجھتا کچھ نہیں ایسی اُلٹی اور بڑھی ہوئی قوتوں کو بُرے رستے کی طرف لگا دیتا ہے۔

اسی دُھوپ اور جھکڑ میں، یہ نہایت اطمینان کے ساتھ قدم شریف کے جنگل کو طے کر گئے، اور اب عیدگاہ سامنے نظر آنے لگی۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے، کہ انکی آنکھ اُٹھی، اور انہوں نے دیکھا کہ درخت کے نیچے ایک شخص ننگا لوتھڑا پڑا ہے۔ کپڑوں کے نام، بدن پر سوائے لنگوٹی کے چیتھڑے کے، چار اُنگل کی دھجی بھی نہیں! رنگ زرد۔ بدن لاغر، بال پریشان، پڑا لوٹ رہا ہے۔ اور "خلق خدا ملک خدا۔ زمین سخت، آسمان دور" کے نعرے لگا رہا ہے۔ یہ ایسے ننھے انجان نہ تھے کہ کچھ نہ سمجھتے۔ اتنا تو تاڑ ہی گئے کہ لوگوں کی نظروں سے، دو کسی کی محبت میں چکنا چور، بستی سے جی چرانے والا ہے کچھ دال میں کالا۔ مگر خواہ مخواہ دخل درمعقولات بھی ٹھیک نہ تھا۔ یہ چُپ چاپ قدم اُٹھائے گئے۔ ان کا اس کے برابر پہنچنا تھا، کہ اُس نے نہایت غور سے گھُور کر، ایک گہری نظر ڈالی، اور جھٹ اُٹھ بیٹھا۔ اشارے سے کر

انکو اپنے پاس بلایا، اور سُرخ سُرخ آنکھیں نکال کر نہایت کرخت آواز سے بولا۔
بچہ! تو فقیر کا بھی کچھ کام کر سکتا ہے"؟

نوجوان صاحبزادے۔ جو کچھ خوف اور کچھ حیرت سے بُت بنے کھڑے تھے، حرف چبا چبا کر کہنے لگے" کہتے میں تیار ہوں۔ اگر مجھ سے ہو سکا، تو میں دریغ نہیں کرونگا"

فقیر۔ (نہایت غصہ کے تیوروں سے سر ہلا کر) اگر مجھ سے ہو سکا!! اگر مجھ سے ہو سکا!! اگر مجھ سے ہو سکا!!!"

جوان (تھوڑی دیر تک مرعوب ہونے کی وجہ سے چُپ رہکر) آپ کہیں تو سہی۔ فرمائیں تو سہی۔

فقیر" کہوں؟ اچھا سُن! اُسے قدموں واپس جا اور فقیر کے لئے تیسری دروازے سے چار پیسے کا دُودھ لا، ابھی۔ اِسی وقت، مسلمان کی دوکان سے وہ جو مسجد کے سامنے بیٹھتا ہے، وہیں سے، اُسی کے ہاں سے"۔

یہ سُنتے ہی وہ واپس چلے۔ دھوپ کی حدت، گرمی کی شدت۔ لو کا جھکڑ، جنگل کا رستہ۔ بمشکل تمام اپنے خیالات میں مستغرق، اجمیری دروازے پہنچے، اور یہ سوچنے لگے کہ کچھ نہ کچھ ہے تو ضرور۔ کبھی طبیعت کہتی تھی کہ نہیں ایسے ڈھکوسلے ہزاروں لاکھوں دیکھنے میں آتے ہیں، کبھی اعتقاد جتاتا تھا کہ نہیں نہیں اگر ایسا ہوتا تو کیا ضرور تھا کہ وہ چار ہی پیسے کا نام لیتے، انہیں کیا خبر کہ میرے پاس کیا ہے؟ مگر عقل پھر اتفاق کا شاخسانہ نکالتی ہے، اور امتحان کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ جانچ کا سب سے آسان طریقہ، اگر

سمجھ میں جو آیا تو یہ ہی کہ دُودھ کسی اور دوکان سے لیا جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی اُنہوں نے ایک اور دوکان سے دودھ لیا: جو تھی تو مسلمان ہی کی دوکان مگر مسجد کے سامنے والی نہ تھی۔ دُودھ کا کٹھرا ہاتھ میں لئے، پتہ دُھانکے، یہ پھر قدم شریف کی قدم بڑھانے لگے، دونوں ہاتھ تو گھرہی گئے تھے؛ ہوا کے جھکڑ سے کندھے کا رومال اڑنے لگا تو ٹھوڑی سے دبا لیا۔ درمیان اِدھر بٹا کر ٹھوکر کھائی، ایک اور مصیبت سامنے آئی۔ یُوں ہی گرتے پڑتے خدا خدا کر کے فقیر کے تکیے میں پہنچے، تو دیکھا کہ وہ پہلے سے ہی بیٹھا تھا۔ دودھ کا کٹھرا اُس کے ہاتھ میں دیا اور رومال بچھا کر بیٹھ گئے۔ دُودھ کو مُنہ لگاتے ہی اُس نے کٹھرا زمین پر رکھدیا۔ اور سرخ سُرخ آنکھیں نکال کر بولا۔ جھوٹے! مکار! فریبی! کس دوکان سے لایا ہے؟ تو نے ہماری نہ مانی، چل دُور ہو۔

نوجوان۔ (نہایت رُک رُک کر، ڈرتے ہوئے) مُسلمان۔ ہی۔ کی دوکان سے۔ لایا ہُوں۔

فقیر۔ مُسلمان ہی کی دوکان سے! پھر اُسی مسجد والی دکان سے جس کا پتہ دیا تھا۔ کیوں؟

نوجوان۔ (بھولے پن کی چشم و ابرو سے۔ بات بنانے کے طریقے پر) بیشک وہاں کا خیال مجھے نہیں رہا۔ گھبرایا ہوا تھا صرف یہ یاد رہا کہ مُسلمان کی دوکان

فقیر۔ جھُوٹ! جھُوٹ!! جھُوٹ!!! تو جان بوجھ کر نہیں لایا؟ تو نے فقیر کے امتحان کی دل میں نہیں ٹھانی، تو نے اب پھر جھوٹ نہیں بولا؟ بس چل دُور ہو۔ خیر اسی میں ہے کہ میرے سامنے سے ہٹ جا۔

نوجوان۔ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چلنا ہی چاہتے تھے کہ اُس نے

آواز دی اور کہا سن! اپنی لنگوٹی کی آنٹی میں سے چار پیسے نکال کر اُس نوجوان کی طرف پھینک کر بولے انہیں اُٹھا! اب تیرے پاس کیا رکھا ہے۔ جنگل میں جائیگا تو پان کیونکر کھائیگا"

یہ جاتے بغیر کچھ سوچ و پیش کئے پیسے اُٹھا جیب میں ڈال پیچھے ہولئے۔ وہاں پہنچ اپنے یاروں کی صحبت میں مارے مارے پھرے اور چراغوں جلے صحیح سلامت گھر میں بھی آگئے: مگر یہ واقعہ ان کے دل پر نقش کالحجر تھا۔ اب جب کبھی جمعہ کو وہ عیدگاہ جاتے، تو فقیر کے پاس بھی رستہ میں ٹھہر کر ضرور باتیں کرتے۔ اول اول تو اُس نے بہت کچھ روکھا پن دکھایا، اور بھوں چڑھاتا، مگر جب اُنہوں نے کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا، تو مجبور ہوگیا۔ قہرِ درویش برجانِ درویش، جب یہ جاتے تو دو چار باتیں کرلیتا

ایک مدت اسی طرح گذر گئی: اور زمانہ تیز رفتار، ابلقِ ایام پر سوار، کہیں کا کہیں نکل گیا۔ ہمارے دوست کے والد بیچارے، اس دارِ فانی کو الوداع کہہ کر، ڈیڑھ گز زمین دبا، کسی جنگل میں جا سوئے: اور کچھ عرصہ بعد ان کی والدہ ماجدہ بھی اپنی بہو اور بچے کو ہمیشہ کے لئے اکیلا چھوڑ گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سارے گھر بار کا بوجھ اب ان پر پڑا؛ شباب کا بھوت بھی کسی قدر اُتر چکا تھا، خاک اُڑاتے اُڑاتے اب بیکار بیٹھنے سے جی بھی گھبرانے لگا تھا۔ جوانی کی ہوا کے ناقابلِ برداشت مست جھونکے بھی آہستہ آہستہ چلنے لگے تھے، اور عمر کا وہ حصہ شروع ہوگیا تھا، جبکہ تمام قوتیں عروج کے زینے پر ایک حد تک چڑھ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ روپیہ کمانے اور بڑا بننے کا شوق بھی بے چین کرنے لگا تھا اور اپنے آن بچہ بھوسے

پرافسوس بھی آ تا تھا۔ لیکن پشیمانی بے وقت اور بے سود تھی سه

بقولِ حسن کوئی پاتا نہیں ۔۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

سچ کہا ہے "اب پچھتائے کا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

خیر پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری، اور اُردو کی کتابیں سے قصے کہانیاں وغیرہ دیکھا کرتے، اِس سے اِن کی استعداد کسی قدر بڑھنے لگی اور شوق اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی: مگر ساتھ کے ساتھ ہی میلے تماشوں کی سیر بھی اسی طرح جاری تھی، جمعے کے جمعے عیدگاہ بھی جاتے، اور رستہ میں فقیر سے بھی دو دو باتیں کر لیتے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ یہ اخراجات سے تنگ، فکر میں غرق، پریشان چپکے پڑے تھے۔ اور ان کا دماغ موجودہ تکالیف کے رفع کرنے کے لئے طرح طرح کے منصوبے گانٹھ رہا تھا۔ کہ یکایک انہیں اُس درویش کا خیال آیا! اور یہ نہ معلوم کیا کچھ سوچ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور یوں ہی گھر سے باہر نکل سیدھے قدم شریف کی طرف چلنے لگے: تھوڑی دیر میں یہ فقیر کے سامنے تھے۔ وہ اس وقت آنکھیں بند کئے سو رہا تھا، اور سرہانے آگ سلگ رہی تھی۔ یہ حواس باختہ پریشان گئے اور خاموش بیٹھ گئے۔ وہ اُٹھا بھی، اور اس نے انہیں دیکھا بھی! مگر یہ بیچارے مصیبت کے مارے اُسی طرح سر جھکائے۔ اپنے افکار کے ناپیدا کنار سمندر میں شناوری کرتے رہے۔ فقیر پہلے تو کچھ مسکرایا، پھر آواز سے بولا "بچہ! اچھا! ہشیار (ہشیار) بڑا آج تجھے کیا ہو گیا ہے؟ لے ذرا فقیر کی چلم تو بھر لے"۔

نوجوان (چلم لیکر آگ کے پاس اکڑوں بیٹھے ہوئے) کچھ نہیں۔ یوں ہی چپکا بیٹھا تھا،،

فقیر تو تو یونہی کبھی چپکا بیٹھا نہیں۔ سچ کوئی بات تو ضرور ہے۔ یہ کوئی برس برس دن سے تو بہت مرجھا جاتا ہے"۔

نوجوان۔ جی ان والدین کے انتقال نے مجھے مار رکھا ہے، ہر وقت اپنی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو روتا رہتا ہوں۔

فقیر۔ مگر بیٹا! صبر کر۔ صبر۔ ماں باپ سے سب کو جدائی ہوتی ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے (چلم اپنے ہاتھ میں لے کر) کہ وہ تمہیں اپنے سامنے کمانے کھانے کے قابل کر گئے۔

نوجوان۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ مگر کیا کروں! جب تک خدا بخشے اُن کا سایہ سر پر تھا، کسی اچھی بُری سے غرض ہی نہ تھی، پیٹ بھر کھانا اور نیند بھر سونا ایک پکائی ملتی تھی، کانوں کان بھی کسی جھگڑے ٹنٹے کی خبر نہ ہوتی تھی"

فقیر۔ ہاں یہ تو سچ کہتا ہے (ہنس کر) اب کیسی گذرتی ہے"؟

نوجوان۔ اس کی نسبت کچھ نہ پوچھئے (مغموم و پژمردہ ہو کر) دُنیا نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے: کیا بتاؤں؟ صورتم بہ بیں حالم مپرس"۔

فقیر۔ دُنیا! دُنیا! دُنیا!! ناپاک دُنیا!!! ذلیل دُنیا!!! مکار دُنیا!!! (نہایت زور سے سرخ سرخ آنکھیں نکال کر) ہیچ دُنیا"!!!

نوجوان (تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر) بے شک دُنیا ہیچ۔ لیکن ہم جیسے دُنیا کے کتوں کا بغیر اس کے کیونکر ٹھیک لگ سکتا ہے"۔

فقیر (اپنی حالت بدلتے ہوئے) "سچ کہتا ہے۔ سچ کہتا ہے۔ تو پھر تو کوئی روزگار کیوں نہیں ڈھونڈھتا"؟

نوجوان۔ شاہ صاحب! روزگار کیا تلاش کروں۔ حیدرآباد میں میرے۔

عزیز و اقارب ملازم ہیں، وہاں کئی ایک خط لکھ چکا ہوں، لیکن ملازمت کی کوئی صورت نہیں۔ بھلا مجھ جاہل (ٹھنڈی سانس لیکر) ان پڑھ کو کون ملازم رکھ سکتا ہے"۔

فقیر ۔ "کیا کہتا ہے! کیا تجھے معلوم نہیں کہ دینے والے نے ڈنکے کی چوٹ کہدیا ہے کہ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ"

نوجوان ۔ "بیشک کہ تو سب کچھ دیا ہے مگر ہم سے تو معاف فرمائیگا عجب بے پرواہی کر رہی ہے"

فقیر ۔ "خبردار! خاموش!! (جذبہ میں آکر) میرے مالک کو بے پرواہ کہتا ہے۔ بے وقوف! جب تک سانس، تب تک آس"

نوجوان ۔ "مگر جب بھوک تو لگے اب اور ملے دس برس بعد، یہ بے پرواہی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس میں آپ مجھے کچھ ہی کیوں نہ کہیں"

فقیر ۔ "تجھے اب بھوک لگی ہے؟ اب؟ اسی وقت؟"

نوجوان ۔ "جی ہاں، ابھی، اسیوقت"۔

فقیر ۔ "ابھی، (آنکھیں بند کرکے) جا اٹھ، اور آج ہی حیدرآباد جا، پھر دیکھ کیا ہوتا ہے؟"

یہ تھوڑی دیر اور بیٹھے باتیں کرتے رہے، پھر اُٹھے اور گھر کی راہ لی۔ جوں ہی اندر گھسے کہ ان کی بیوی نے ایک خط دیا۔ جلدی جلدی لفافہ کھولا، اور بیقراری کے ساتھ پڑھنے لگے۔ تیس روپیہ ماہوار کی نوکری پہ تقرر۔ اور اس کے لئے بلانے کا خط، خوشی اور وہ بھی خلاف قیاس! انگرکھے کے بند ٹوٹ گئے، سانس چڑھنے لگا اور یہ دھڑ سے پلنگ پر گر پڑے۔ جوں توں کرکے گھنٹہ بھر میں ہوش ہوتے تو بیوی کو

سنا یا اور سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔

القصہ یہ کہ حیدرآباد گئے اور وہ جگہ سنبھالی۔ اب پختہ ہو گئے دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ وہاں رہ کر انہوں نے اردو فارسی میں اچھی بہت استعداد حاصل کر لی۔ اور زینہ بزینہ ترقی کے مدارج طے کرتے رہے۔ سالہا سال بعد آئے تو عجب شان سے آئے۔ گئے تھے تو کچھ ہراساں کچھ خوف زدہ سے تھے۔ آئے تو ہنستے ہنساتے، خوش و خرم گئے تو تنہا۔ روپیہ کی کہ حقیقت نوکری پر۔ آئے تو بیش قرار پنشن لیکر آئے۔ اب وہیں ہیں کہ بفضلہٖ چھ سو۔ سات سو۔ روپیے ماہوار کی آمدنی رکھتے ہیں۔ نہ آئیں پیر جائیں، اینڈو، جوڑی۔ گھوڑا، ہوائی کسی بات کی کمی نہیں۔ لڑکا، بہو۔ پوتا، پوتی۔ روپیہ تو روپیہ اولاد کے بخشش بہا ہوتی۔ کیا ہے جو خدا نے نہیں دے رکھا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

یار مردانِ خدا باش کہ در کشتیِ نوح
ہست خاکے کہ بآبے نخرد طوفاں را

سلطان حیدر جوش

باغبان کاشتکاری اور باغبانی کے متعلق مفید پرچہ معلوم ہوتا ہے ابھی صرف دوسرا نمبر ہے۔ وقتِ اشاعت ہر ماہ انگریزی کے شروع کا ہفتہ ہے۔ ضخامت ۲۴ صفحات کی ہے جس میں سے ریویو پرچہ میں ۲۰ صفحے اصل مضامین کے ہیں اور ۴ صفحے اخبار کے باقی اشتہار وغیرہ۔ تقطیع ۲۰×۲۶ ۸/۱ ہے۔ سالانہ قیمت عا اور فی پرچہ ۱ر ہے۔ حکیم سید محمد عیسیٰ صاحب مالک و مہتمم رسالہ باغبان۔ سہارنپور سے نکلتا ہے۔ ہم اس مفید ملک پرچہ کی ترقی اور اس کی بقا کی دعا کرتے ہیں

ریڈیم

اس عجیب چیز کے خواص و عجائبات کا تجربہ اگرچہ ابھی مکمل نہیں ہوا ہے۔ لیکن علمائے فن طبیعات اس بات کے قائل ہو چلے ہیں کہ ایک زمانہ میں ریڈیم دنیا کی نہایت کارآمد چیز ہو جائیگی اور اس کی کافی مقدار پیدا ہو کر بنی نوع بشر کو بیشمار منافع پہنچائیگی - چونکہ اردو اخبارات و رسائل میں ریڈیم کے متعلق بہت کم کوئی ذکر آتا ہے۔ اور اس کی معلومات مفید و دلچسپ ہیں۔ اس لئے ذیل کا مضمون ناظرین مخزن کی نذر کیا جاتا ہے۔ اس سے ریڈیم کی نئی خاصیتیں معلوم ہونگی۔

مجھے ایک بار مسٹر کوری سے پیرس میں ملنے کا موقعہ ملا۔ وہ حسن اتفاق سے وہاں آ گئے تھے - میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کچھ وقت میرے لئے نکال سکتے ہیں - میں آپ سے ریڈیم کی نسبت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں - میری استدعا قبول کی گئی اور میں دوسرے دن وقت مقررہ پر مسٹر کوری کے ہاں پہنچا اور جو مختصر سی گفتگو ریڈیم کے متعلق ہم دونوں میں ہوئی وہ حسب ذیل ہے۔

جب میں وہاں پہنچا اسوقت مسٹر کوری ایک سفید رنگ سفوف شیشے کی نلی میں ڈال کر اسے آگ پر رکھے ہوئے تھے۔ اور اس کی طرف نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بیان کیا کہ دو ایک دن ہوئے وہ اسی طرح ایک شیشے کی نلی میں یہی سفوف ڈالے گرم کر رہے تھے کہ یکایک نلی ٹوٹ گئی اور ان کا قیمتی ریڈیم بکھر گیا جس سے اس کا بہت سا حصہ ضائع

ہو گیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس شی کی طرف نہایت ہی غور سے دیکھ رہے تھے۔ آزمایا اور پھر یہ ریڈیم شائع ہو جاتے۔ میں نے مسٹر کوری سے اس مقوف کو حرارت دینے کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے کہا کہ اس طریقہ پر وہ ریڈیم کو دوسری چیزوں سے علیحدہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ ریڈیم بہت ہی کم ہی اپنی اصلی حالت میں نہیں ملتا بلکہ اس میں کئی ایک اور چیزیں ملی ہوتی ہیں جن سے ریڈیم کو علیحدہ کرنے میں بہت وقت پیش آتی ہے۔ اور بہت سر کھپانا پڑتا ہے تب کہیں خالص ریڈیم حاصل ہوتا ہے۔

میں نے سنا ہے کہ ریڈیم میں سے ہر وقت حرارت اور روشنی نکلتی رہتی ہے جس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ اس کے حجم میں بالکل کمی نہیں ہوتی۔ کیا یہ واقعی ٹھیک ہے؟

مسٹر کوری یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ کہ خالص ریڈیم سے روشنی اور حرارت ہر وقت نکلتی رہتی ہے۔ مگر اس روشنی اور حرارت کے نکلنے سے کوئی کمی اس کے حجم میں نہیں ہوتی۔ روشنی اور حرارت کے علاوہ ریڈیم میں سے دوسری قسم کی شعاعیں بھی نکلتی ہیں۔ جو روشنی کی شعاعوں سے مختلف ہوتی ہیں اور انکی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ یہ شعاعیں مفید بھی ہیں اور ساتھ ہی ضرر رساں بھی۔ ریڈیم اُن امراض کو رفع کرتی ہے جو اب تک ناقابلِ علاج سمجھے جاتے تھے۔ اور انسان کے لئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی ہے۔ مگر ساتھ ہی ذرا سی کم توجہی میں یہ انسان کی زندگی بھی تلف کر سکتی ہے۔

میں۔ کیا یہ سب باتیں تنہا آپ ہی نے دریافت کی ہیں؟

مسٹر کوری۔ نہیں۔ میں نے تو صرف ریڈیم ہی دریافت کیا ہے۔ دیگر

خامیوں کے دوسروں کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور مجھے کامل امید ہے کہ اس چیز کی وجہ سے فنِ ڈاکٹری (طبابت) اور سرجری (جراحی) میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوگا۔

میں۔ کیا ریڈیم کی شکل ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے یا یہ رنگ بدلتی رہتی ہے۔

مسٹر کوری۔ ریڈیم کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ یہ بالکل شفاف ہے۔ اس کے نہایت چھوٹے چھوٹے ذرّے ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو انہیں پیس کر سفوف بنا سکتے ہیں۔

انہوں نے میز کے ایک خانہ میں سے ایک شیشے کی نلی نکالی جس کے بہت سے حصے پر سیسہ چڑھا ہوا تھا۔ میں ریڈیم کو اس میں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔

میں۔ اس نلی پر سیسہ کیوں چڑھا رکھا ہے؟

مسٹر کوری۔ یہ صرف اس حفاظت کے لئے ہے۔ کہ اُن لوگوں کو جو اسے دیکھیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہو۔ سیسہ میں سے ریڈیم کی شعاعیں نہیں چھن سکتیں جو دوسری حالت میں لوگوں کو بہت ضرر اور تکلیف دیتی ہیں۔ اگر اس نلی پر سیسہ نہ چڑھا ہوا ہو اور یہ نلی تمہارے جسم کے ساتھ کچھ دیر کے لئے لگی رہے تو آپ کو اس سے بڑی تکلیف ہوگی۔

یہ کہکر مسٹر کوری نے نلی کا وہ حصہ میرے جسم کے ساتھ لگا دیا جس پر سیسہ نہیں چڑھا تھا۔ لیکن مجھے کچھ بھی تکلیف معلوم نہ ہوئی اور میں نے ان سے کہا مگر مجھے تو بالکل تکلیف نہیں ہوئی۔

مسٹر کوری۔ بیشک جناب مجھے بھی آپ کی طرح ابتداءً بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے اپنے بازو پر سے کپڑا ہٹا کر مجھے ایک بڑا زخم دکھایا

جو کہ حال ہی میں اچھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور کہا مگر آپ یہ دیکھئے کہ اس نے کیا نتیجہ پیدا کیا۔

یہ سنتے ہی میرا رنگ فق ہو گیا۔ اور میں نے بڑے اضطراب کی حالت میں کہا۔

تو کیا میرے ساتھ بھی اب ایسا ہی معاملہ پیش آئیگا؟

مسٹر کوری (مسکرا کر) نہیں نہیں۔ البتہ اگر کچھ دیر اور یہ نلی آپ کے جسم سے لگی رہتی تو آپ کو بھی میری طرح تکلیف اٹھانی پڑتی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرا ایک دوست ریڈیم کو ایک نلی میں ڈال کر اور اسے جیب میں رکھکر کہیں لکچر دینے چلا گیا۔ اس وقت تو اسے کچھ معلوم نہیں ہوا مگر کچھ دنوں کے بعد جسم کا وہ حصہ جو اس کی جیب کے نیچے تھا سرخ ہونا شروع ہوا اور آہستہ آہستہ وہاں ایک تکلیف دہ زخم بن گیا اور انہیں اپنی غلطی کا یہ خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اب تم سمجھے ریڈیم کی شعاعوں کی خاصیت ہی یہ ہے کہ جب انکو جسم سے لگایا جائے۔ اسی وقت کوئی فوری اثر پیدا نہیں کرتیں ہاں! کچھ دنوں بعد ان کی حقیقت کھلتی ہے۔

میں۔ تب تو جناب! ریڈیم ایک بڑی خطرناک اور تباہ کن چیز ہے۔

مسٹر کوری۔ بیشک یہ ضرر رساں ہے۔ مگر ہم اس کے بد اثرات سے بچ سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ اس نلی کو ملاحظہ کر رہے ہیں۔ کہ اگر اس نلی پر جس میں ریڈیم ہو اس طرح سیسہ چڑھا دیا جائے تو پھر اس کا مطلق کوئی برا اثر نہیں ہوتا۔

میں۔ کیا ریڈیم سے اس وقت بھی حرارت اور روشنی دونوں نکل رہی ہیں؟ مجھے تو کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

مسٹر کوری۔ بیشک جناب اس وقت بھی اس میں سے حرارت اور روشنی دونوں
نکل رہی ہیں۔ اور نہ صرف اسی وقت بلکہ ہر وقت یونہی نکلتی رہتی ہیں جیسا آپکو ایک
اندھیرے کمرے میں لیجا کر دکھاؤنگا کہ واقعی اس میں سے روشنی نکلتی ہے۔
اور حرارت کی نسبت تو ہم تھرمامیٹر سے بہ آسانی دریافت کر سکتے ہیں۔ اگر
ریڈیم اور کوئلہ دونوں ایک ہی برابر مقدار میں لیکر کوئلوں کو جلا دیا جائے
تو جتنی حرارت کوئلوں کی آگ سے ایک گھنٹہ میں نکل جائیگی۔ اتنی حرارت
ریڈیم میں سے کہیں اسی گھنٹوں میں جا کر خارج ہوگی۔

میں۔ کیا ریڈیم یہ حرارت ہمیشہ دیتی رہتی ہے۔ یا کبھی وہ ختم بھی ہو سکتی
ہے اور کیا ریڈیم کے جسم میں اس حرارت کے نکلنے سے کوئی کمی واقع نہیں
ہوتی یا ہوتی ہے؟

مسٹر کوری۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اگر ریڈیم ایک سال تک برابر حرارت
اور روشنی دیتا رہے تو اس عرصے میں اس کے جسم کا صرف ایک کروڑواں حصہ
زائل ہوگا۔ جو کہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

پھر مسٹر کوری مجھے ایک اندھیرے کوٹھے میں لے گئے۔ وہاں میں نے دیکھا
کہ جس نلی میں ریڈیم تھی اس میں سے خوب تیز روشنی نکل رہی تھی۔ میں نے
جیب میں سے ایک کاغذ نکالا اور اُسے میں بخوبی پڑھ سکا حالانکہ ریڈیم
کی وہ مقدار جو نلی کے اندر تھی بہت ہی تھوڑی تھی۔ مسٹر کوری نے مجھے
بتایا کہ ایک گرام ریڈیم تینتیس فیٹ مربع کمرے کو روشن کر سکتی ہے اور اگر
ریڈیم کے پاس سلفائیڈ آف زنک رکھدیا جائے تو یہ روشنی بہت ہی
تیز ہو جاتی ہے۔ مسٹر کوری نے کہا لیکن ہمیں اس روشنی سے کچھ فائدہ نہیں
ہو سکتا۔ کیونکہ اگر آدمی ریڈیم کی روشنی میں زیادہ دیر بیٹھا رہے تو اس کے

اندھے ہو جانے کا خطرہ ہے۔

پھر مسٹر کوری نے ریڈیم کی نلی ایک کاغذ میں لپیٹ کر مجھے دی اور کہا کہ آنکھ بند کر کے اُسے آنکھ کے پردے پر رکھو۔ ایسا کرنے سے مجھے ایک روشنی دِکھائی دی جو مسٹر کوری کے حسبِ بیان آنکھ کے اندر تھی۔ بعد ازاں میں نے اس نلی کو آنکھ سے ہٹا کر اس کے ساتھ کی ہڈی پر رکھ لیا اور اب بھی مجھے پہلے ہی کی طرح آنکھ کے اندر روشنی دکھائی دی۔ معلوم ہوا کہ ریڈیم کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ وہ آنکھ کو بذاتِ خود روشن کر دیتی ہے۔ مسٹر کوری نے کہا کہ وہ زمانہ دُور نہیں۔ جب کہ ریڈیم کی یہ خاصیت آنکھ کی ان بیماریوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی جو اب لاعلاج سمجھی جاتی ہیں۔

اب ہم پھر پہلے کمرہ میں واپس آ گئے۔ اور میں نے مسٹر کوری سے سوال کیا

ریڈیم جو اس نلی میں ہے یہ تو بالکل ذرا سی ہے؟

مسٹر کوری نے یہ سُنکر ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ اور کہا :-

بیشک اس کی مقدار بہت تھوڑی ہے مگر دنیا میں ہی ریڈیم کی ایسی تھوڑی مقدار موجود ہے۔ ریڈیم سے میرا مطلب وہ ریڈیم ہے جو اُن اشیاء سے کہ اس میں ملی ہوتی ہیں۔ بالکل صاف کر لی گئی ہو۔

میں:- دنیا میں اصلی ریڈیم کل کس مقدار میں موجود ہے۔

مسٹر کوری:- اونس کا ایک تہائی فرانس میں۔ اتنا ہی جرمنی میں۔ اور امریکہ میں ایک تہائی سے بھی کم۔ ایک اونس کے قریب دُنیا کے باقی حصّوں میں سمجھ لو۔ مختصر یہ ہے کہ تمام دُنیا میں تقریباً کل دو اونس ریڈیم موجود ہے اور بس۔

ہیں۔ کیا ریڈیم سونے سے مہنگی ہے۔ جناب یہ تو بتائیں کہ اس کے ایک پونڈ کی کیا قیمت ہوگی؟

مسٹر گوری (زور سے قہقہہ لگا کر) کلوگرام کی قیمت پوچھو۔ شاید آپ ابھی اس بات کو نہیں سمجھے ہیں کہ ایک پونڈ ریڈیم کیا معنی رکھتا ہے؟

اور پھر انہوں نے ایک کاغذ پر ریڈیم کی قیمت کا اندازہ لگا کر کہا کہ ایک کلوگرام ریڈیم کی قیمت ساٹھ لاکھ روپے ہیں اور اس حالت میں ریڈیم سونے سے تین ہزار گنی قیمت رکھتی ہے۔

اس کے بعد مجھے مسٹر گوری وہ کارخانہ دکھانے کو لے گئے جہاں ریڈیم اصلی حالت پر لائی اور صاف کی جاتی ہے۔ مجھے ایک سرخ رنگ کی سفوف کی مانند چیز دکھائی گئی اور اس کی نسبت بتایا گیا کہ اسی میں سے یہ قیمتی چیز (ریڈیم) نکلتی ہے۔ پہلے زمانہ میں اس چیز کا کوئی خیال تک نہیں کرتا تھا اور کوڑے کرکٹ کی طرح اس کو پھینک دیا جاتا تھا۔ مگر جب سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ اس کے اندر دنیا کی سب سے قیمتی شے موجود ہے۔ اس وقت سے اس کی جو قدر ہونے لگی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ خود خیال کر سکتے ہیں کہ ریڈیم کو اصلی حالت پر لانے میں کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے اور یہ ہے بھی ضروری۔ کیونکہ ریڈیم کو دوسری چیزوں سے علیحدہ کرنا ویسا ہی مشکل اور تکلیف دہ عمل ہے۔ جس طرح کہ سونے کے کچھ چھوٹے چھوٹے ذروں کو ریت کے ایک بڑے ڈھیر سے علیحدہ کرنا۔

اس کے بعد مسٹر گوری نے اس امر کو کہ ریڈیم سے ہر وقت حرارت نکلتی رہتی ہے۔ ثابت کرنے کے لئے مجھے ایک تجربہ دکھایا وہ یہ کہ انہوں نے دو گلاس لئے ایک میں ریڈیم والی نلی اور تھرمامیٹر رکھدیا اور دوسرے

گلاس میں صرف تھرامیٹر رکھا۔ کچھ دیر کے بعد ریڈیم کی نلی والے گلاس کا تھرامیٹر
چڑھ گیا۔ مگر دوسرے تھرامیٹر میں پارہ اپنی پہلی ہی حالت پر قایم رہا۔
ریڈیم میں سے حرارت روشنی وغیرہ کے علاوہ ایک اور چیز بھی نکلتی ہے
جسے ریڈیم کے بخارات کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح پانی سے
بخارات اُٹھتے ہیں اسی طرح ریڈیم کا حال ہے۔ یہ بخارات جو ریڈیم سے
نکلتے ہیں۔ ارد گرد کی چیزوں پر جا لگتے ہیں۔ اور اُن میں یہ بخارات
ایک خاص وقت تک ریڈیم کے خواص پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ واقعی
ریڈیم کی ایک نہایت ہی مفید خاصیت ہے۔ کیونکہ ہر ایک شخص کے پاس
ریڈیم تو ہو نہیں سکتی۔ پس وہ محروم اشخاص اُن چیزوں ہی سے بہت کچھ
فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جو ریڈیم کے بخارات سے اثر پذیر ہو گئی ہوں۔

(۱) ریڈیم کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے کھرے کھوٹے جواہرات
کی شناخت ہو سکتی ہے۔ اگر ایک تاریک کمرہ میں ہیرے یا جواہرات
کے پاس ریڈیم لائی جائے اور وہ جواہرات جگمگا اُٹھیں اور بڑی تیزی
سے چمکنے لگیں تو سمجھئے وُہ سچے ہیں۔ ورنہ ان پر کوئی اثر نہ ہو تو
جھوٹے خیال کئے جائیں۔

(۲) ریڈیم فاسفرس کی زرد رنگت کو سُرخ کر دیتی ہے۔

(۳) بعض ایسی بیماریوں کے لئے جو ابتک لاعلاج خیال کی جاتی تھیں
ریڈیم بہت ہی مفید ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ لیوپس کے کئی مریض
اس سے اچھے ہوئے ہیں۔ اس سے بھی بڑھکر جو بات عجیب اور
تعجب خیز ہے وُہ یہ کہ ریڈیم مرض سرطان کے مریضوں کے لئے
بہت کچھ فائدہ مند ہوئی ہے۔ وا ثنا میں دو مریضوں پر آزمائش

گیگی اور دوٹی کو کامل صحت حاصل ہوئی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب خاصیت
ریڈیم کی یہ ہے کہ اس کی بدولت اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک اندھے
آدمی پر اس کا تجربہ کیا گیا۔ اس کی آنکھ پر ریڈیم کی نلکی رکھی گئی اور اس کو
کئی ایک چیزیں نظر آئیں۔ جو کہ کمرہ میں موجود تھیں۔ اگرچہ وہ اچھی طرح
ہر ایک چیز نہ دیکھ سکا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مہلک امراض کا علاج ریڈیم سے
کیا گیا ہے۔ آدھے سر کے درد کو تو آناً فاناً دور کر دیتی ہے۔

(۴) مینڈک کے بچوں پر شعاعیں ڈالی گئیں تو وہ آٹھ روز کے اندر بڑے
بڑے مینڈک ہو گئے۔ اور جب بڑے مینڈکوں پر یہی عمل کیا گیا تو وہ حد
سے زیادہ بڑھ گئے۔

انسان کی زندگی کو تباہ کرنے کے لئے ریڈیم بہت ہی خطرناک اور زود اثر
چیز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک کلوگرام ریڈیم ملک فرانس کی تمام آبادی کی زندگی ختم
کر دینے کے لئے کافی ہے۔ انسان اس کے اثر سے چوہوں کی طرح مرتے
ہیں۔ پہلے پہل تو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ریڈیم نے کس طرح کا اثر ان پر کیا ہے
مگر کچھ دنوں بعد ان لڑکوں کو مختلف بیماریاں آ دباتی ہیں۔ کوئی کسی بیماری
میں اور کوئی کسی میں مبتلا ہو کر راہی ملک عدم ہو جاتا ہے۔ مگر جیسا اوپر
بیان کیا گیا ہے۔ ریڈیم باوجود ان تباہ کن خاصیتوں کے انسان کے لئے
نہایت ہی مفید اور کارآمد چیز بھی ہے۔ ریڈیم کا تجربہ کیڑوں پر بھی کیا گیا
اور یہ انسانی زندگی کی طرح ان کے لئے بھی ویسی خطرناک اور تباہ کن ثابت
ہوئی۔ کچھ کیڑے لے گئے۔ آدھے ایک گلاس میں اور آدھے دوسرے
میں رکھ دیئے گئے۔ ایک گلاس کے پاس ریڈیم رکھا گیا۔ کچھ عرصہ بعد دیکھنے

پھر معلوم ہوا کہ اس گلاس والے لیمپ سے جو ریڈیم کے پاس رکھا گیا تھا تقریباً سب پودے مر گئے۔ دوسرے ویسے ہی زندہ تھے۔

بعض مختلف پرندوں کے انڈے ریڈیم کے پاس رکھے گئے اور ان میں سے مختلف جسم کے بچے پیدا ہوئے۔ جو کہ ان پرندوں سے جن کے کہ انڈے تھے بالکل مختلف تھے۔

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ وہ ہوا اور پانی جس میں ریڈیم کا اثر موجود ہو پیٹ کی بیماریوں کے واسطے اور خاصکر جگر کی بیماریوں کے نہایت ہی مفید ہے۔

افسوس کہ ریڈیم ابھی نہایت ہی تھوڑی مقدار میں دنیا میں موجود ہے اور اس کمی کی وجہ سے یہ ابھی محض سائنس والوں کی دلچسپی کا سامان ہے اور کہیں کہیں بڑے شفاخانوں میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے بعض جگہوں میں ایسے چشمے بھی ہیں جن کے پانی میں ریڈیم کے اثرات پائے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین میں ریڈیم خاص مقدار میں موجود ہے اور امید کیجاتی ہے۔ کہ وہ دن دور نہیں جب کہ اس کی خاصی مقدار دنیا میں موجود ہوگی۔ اور ہر ایک اس سے فائدہ اٹھا سکیگا۔

(ماخوذ از انگریزی)	سعید اللہ (امرتسری)

استفسار:- کسی ایسی کتاب کا نام اور ملنے کا پتہ درکار ہے جس میں شاہان مغلیہ یا کسی اور مسلمان بادشاہ یا راجہ کی تخت نشینی کا مفصل حال مع شرح سامان جلوس درج ہو۔ (عارف)

اگر عورتیں نہ ہوتیں؟

اگر عورتیں نہ ہوتیں، تو اس آماجگاہ آلام میں، اس دارِ کوائف میں، اور ہماری صعوبتوں بھری زندگی میں، اطمینان کا ایک ذرہ نہ ہوتا۔ ہماری تاریک رُوحیں ایسی تاریک ہوتیں کہ ان میں کبھی بھول کر بھی شعاعِ مسرت کا گذر نہ ہوتا؟ وہ لغزہ مبہم، وہ شعاعِ مسرت، جس کا نام عورت ہے اگر وہ اس آماجگاہ آلام میں نہ ہوتی تو ہم کیا ہوتے؟ ایک ساز ہوتے جس میں نغمہ نہ ہوتا، ایک جسم ہوتے جس میں جان نہ ہوتی۔ یوں سمجھو کہ ہماری زندگی ایک معلق عمارت ہوتی۔ جس میں نہ پشتیبان ہوتے نہ ستون، جو ہوا کے جھونکوں سے کبھی ایک طرف آپڑتی۔ کبھی دُوسری طرف، جسے نہ استقلال ہوتا نہ قیام۔

جس کو لوگ رُوحانی زندگی کہتے ہیں۔ اُس کا جزوِ اعظم وہی خاموش رُوحیں ہیں۔ جنہیں ہم کہا کرتے ہیں "عورات ہیں! ضعیف العقل ہیں! جاہلِ مطلق ہیں"! کوئی پوچھے وہ ایسی کیوں؟ ہیں؟

کیا دُنیا کی وہ آزادی جس کے ہم اتنے دلدادہ ہیں، دنیا کی وہ سوسائٹیشن جس پر ہم جان فدا کرتے ہیں۔ دُنیا کی وہ نعمتیں جن کے لئے ہمارا دم نکلتا ہے، کیا ان سب کے ہم اکیلے حقدار ہیں!

خدا کی آدھی مخلوق، ہماری عزت کی آدھی حصہ دار، وہ کس بیدردی سے محروم کی جاتی ہے۔ محروم کی جاتی ہے اور پھر یہ کوشش کیجاتی ہے کہ ہماری خدمت کرکے بھی ہماری راحتوں میں حصہ نہ لے۔ ہماری شریک

ہو کہ ابھی ہماری مسرتوں میں ہم سے جدا ہے۔ ہم جن دلفریب وادیوں میں دُنیا کی ہوا کھاتے ہیں۔ ان وادیوں کے پُرفضا عالم کا ذکر بھی اس کے کانوں تک نہ جائے!

یہ تو ہماری حالت ہو۔ اور اُن سراپا محبت تصویروں کو دیکھو جنہیں اپنی محبت اپنے اخلاص پر ناز ہے۔ یہ بھی خبر نہیں کہ ہم سے کیا کچھ چھین کر انہیں کیا دیا جاتا ہے۔ جو اہرات چھین کر ہم اُن کے ہاتھوں میں سنگریزے رکھ دیتے ہیں۔ وہ انہیں بھی جواہرات سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ ہماری وفا اور انکا لطف! ہمارا ظلم اور ان کی محبت! عالم میں دو متضاد باتیں اس سے زیادہ تکلیف دہ رنگ میں اور اس سے زیادہ دردانگیز صورت میں کبھی نظر نہ آئی ہونگی:

رُوح کے راگ اور اس کی شعریت کو اگر چشم بصیرت سے دیکھنا چاہتے ہو تو ان محبت کی دیویوں کو دیکھو، ان چیزوں کو دیکھو جن سے زندگی عبارت ہوتی ہے، جن پر حیاتِ رُوحی اور قیام قوم کا دارومدار ہے۔ دُنیا کی دو ذرہ حیات ہیں، روشنی دیکھو، پھول دیکھو، بہار دیکھو، مگر بہارِ زندگی کی خوشبو اور شعرِ حیات کی رنگینی انہیں خاموش رُوحوں میں پاؤ گے۔ اگر اپنے سے ان ہستیوں کو جُدا کر کے دیکھو تو ہماری زندگی کے تمام جہاتِ شعری نکل کر صرف ایک بےحس اور بےجان قالب رہ جائیگا، ہم سے حقیقتِ زندگی کو نکال دو پھر دیکھو اِس خراب آباد دُنیا کی دلچسپیاں کتنی رہ جائینگی۔

زندگی کے تمام شعبے، حیاتِ انسانی کی تمام حالتیں، ہمارے تخیلات اور حسّیات، غرضیکہ دُنیا کے ذرہ ذرہ سے قدرت کی اس نازک مخلوق کا ایسا مستحکم رشتہ قائم ہے جو اگر ٹوٹ جائے تو ہماری ہستیوں کو بیکار کر دے۔

ہماری زندگیوں پر ایسا غبارِ حسرت برسا دے جو نہ ہمارے آبِ تمدن سے دھوئے دُھل سکے، اور نہ ہماری عقل کے ہٹائے ہٹ سکے!

ازدواج ہی کو دیکھو، ہمارے نزدیک اس کی حقیقت ایک قہقہہ کی سی ہے۔ ایک ساعت کی ساعت یہ قہقہہ ہماری نگاہوں میں شگفتہ مسرت نظر آتا ہے اور پھر یکایک ہم اپنے ہی ہاتھوں سے اس شگوفہ کی پتی پتی نوچ ڈالتے ہیں اس کو زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسل دیتے ہیں یہاں تک مسلتے ہیں کہ اس کی پتی پتی خاک میں مل جاتی ہے اور ایک ایسا خلو ہماری زندگی میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی موجودگی ہم محسوس کرتے ہیں مگر اس کے علاج سے ناواقف ہوتے ہیں۔

لوگ کہا کرتے ہیں "عورت خطرناک چیز ہے" یہی نا کہ ان میں سے بعض عشوہ فروشی کرتی ہیں، حسن کے بازار لگا کر اپنے جمال ظاہری کو سستا بیچ ڈالتی ہیں اور اس تجارت میں خریداروں کو فریب دے دے کر یا لوگوں کی آنکھوں پر اپنی دلفریب اداؤں کے پردے ڈال ڈال کر وہ انکو لوٹ لیتی ہیں۔ یہ مانا کہ وہ ایسا کرتی ہیں مگر جب وہ دوکانِ حسن لگا کر جا بیٹھتی ہیں تو مرد جنکو اپنی دانشمندی کا دعویٰ ہے جو اپنے کو انجام بیں سمجھتے ہیں۔ وہ کیوں اپنے اعلیٰ اخلاق کے زعم میں سودا خریدنے اُن دوکانوں پر جاتے ہیں!

حسن کو اگر ہم دیکھیں تو خریدار کی نگاہ سے کیوں دیکھیں، قدرت کے لطائف میں، پھولوں کے درمیان، سمندر کے کنارے، سبزی سے بھرے میدانوں میں، یا پُر فضا بہار میں، ہم جہاں دیکھیں وہاں شعرِ حیات موجود ہے، انسانی حسن درحقیقت اس تمام شعریت کا مجموعہ ہے۔ ہم اسی رنگ میں اسکو کیوں نہ دیکھیں۔ اس جوہرِ حیات میں جس کو عورت کے نام سے تعبیر کرتے

ہیں۔ ہماری ہوسناکیوں کا دخل کیوں ہو؟

ہمارے حقیقی جذبات کو جنبشِ حیات دینے والی عورتیں، ہماری محسوسات کو اعلیٰ اور شریف بنا دینے والی عورتیں، یہ پاک ستارے ہمارے افقِ رُوح کی زینت ہوتے ہیں۔ نفس کے تاریک قعر میں اُن کی جگہ نہیں ہے۔

ازدواج درحقیقت کتابِ حیات کا بہترین باب ہے۔ اور پھر اس باب کے اوراق پر ہماری ہوسناکی کے سیاہ دھبّے!! کسی مرد کو دُنیا میں کسی چیز سے ایسا اخلاص نہیں ہوتا جیسا کہ عورت کو اُس مرد سے ہوتا ہے جس سے کہ وہ محبت کرتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے بازو عورتوں سے زیادہ قوی ہیں اور ہم دُنیا کے سخت سے سخت کام کر سکتے ہیں مگر ہمارے پہلوؤں میں ایسا سچا دل نہیں ہوتا جیسا کہ اُن پاک سینوں میں پایا جاتا ہے۔

کاش ہم اُن زخموں کو دیکھ سکتے جو ہم نے اُن نازک دلوں پر ڈالے ہیں۔ ہم اُن داغوں کو دیکھ سکتے جو ہمارے ہاتھوں اُن پُرخلاص اور صاف سینوں میں پڑے ہیں!

ہم میں سے وہ جنہیں علم کا دعویٰ ہے، ترقی کا ادعا ہے، تہذیب کا ملکہ ہے، جو جامۂ نصیحت اور قبائے موعظت پہن پہن کر پلیٹ فارم پر گرجتے ہیں۔ یا جو دستارِ فضیلت رکھ کر مجلسوں میں مسند کا کونا دباتے ہیں، وُہ اپنے فریب میں خود ایسے مبتلا ہیں کہ اُن کے گھر انسانی زندگی کے تجربہ نمونے ہیں! چند روز کی نئی دلہن کا جنازہ بیچ دروازے سے نکالا جاتا ہے تو کس کو خبر ہوتی ہے کہ اس سرد دِل میں کتنے گرم داغ دہک رہے ہیں!

بچپن کے دلفریب زمانہ میں اِن ذرا ذرا سی جانوں کی زندگی ایک ایسی لاہوتی شعریت اور آسمانی نغمہ سے مملو ہوتی ہے جو اپنے گرد

چاند کی سی روشنی، پھول کی سی بہار، اور مشک کی سی مہک پھیلاتی ہے۔ یہانتک کہ ہمارے سیاہ دل بھی ایک آن کی آن اُس سے متاثر اور منور ہو جاتے ہیں۔ پھر جب یہ قدرت کے کھلونے جوانی کی عالم قریب عُمر کو پہنچتے ہیں۔ تو اُن کی ہر ہر ادا میں ایک مقناطیسی قوت داخل ہو جاتی ہے۔ ایسی مقناطیسی قوت جو خلق خدا کو بلا بلا کر شعر حیات سے مستفیض کرتی ہے۔ یہ ننھے کھلونے بڑے ہو کر کبھی کسی گھر کو روشن کرتے ہیں، گاہے کسی بیابان کو گلشن بناتے ہیں، اور کبھی تھکے ماندے دماغوں کو اپنی مشکیں خوشبو سے معطر کیا کرتے ہیں۔ ہم ان عنایتوں کی یہ قدر کرتے ہیں کہ بچوں کی طرح ذرا کی ذرا ان کھلونوں سے کھیل کر یا تو الگ پھینک دیتے ہیں۔ یا توڑ ڈالتے ہیں۔ اور پھر تلاش کرتے ہیں۔ کہ اور نیا کھلونا کہیں سے مل جائے!

ہمارے نزدیک یہ خاموش مورتیں بیجان کھلونے ہیں جنہیں رنج و راحت کا احساس ہی نہیں۔ مگر اس بنانے والے سے پُوچھو جس نے محبت سے ان کھلونوں کو بنا بنا کر تمہاری دلبستگی کے لئے تمہیں عطا کیا! اور اس لئے عطا کیا کہ تم اس کی دلفریبی کے سہارے سے اس دنیا کی صعوبتیں استقلال سے برداشت کرو، انسانی فرائض کو بہتر ادا کر سکو، تا کہ تمہاری مصیبت کی گھڑیوں میں تمہارا کوئی انیس بھی ہو۔ لیکن تم نہایت خود غرضی میں قدرت کے ان رموز سے اندھے بہرے ہو گئے ہو اور انسانی صفات کو چھوڑ کر حیوانی زندگی کے گرویدہ ہو رہے ہو۔ اور پھر اس بے ڈھنگی پر بھی اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ! اِسی ستم پر یہ غرور! اتنی سی بودگی پر اس قدر طمطراق!!

اگر عورتیں نہ ہوتیں۔ تو تمہاری زندگیوں میں اطمینان کا ذرہ بھی نہ ہوتا اندھے بہرے جانوروں کی طرح بیابان وحشت میں سرگردان پھرا کرتے، نہ تمہاری زندگی زندگی ہوتی، نہ تمہاری موت 'موت'۔ تم اس زعم میں ہو کہ تمہارا تمدن یا تمہارا مذہب اخلاقی معلم ہے؛ مگر یہ کمزور مخلوق جسکو تم "صنف نازک" کے خطاب سے یاد کرتے ہو۔ یہی درحقیقت تمہاری اخلاقی اور روحانی معلم ہے۔ آج تم اس سے قطع تعلق کر لو۔ اور کل ہی ہم دیکھینگے کہ تم "اخلاق" اور "تمدن" کس چیز کا نام رکھو گے۔

اگر عورتیں نہ ہوتیں۔ تو نہ تم انسانی صفات کے مرکز ہوتے اور نہ تم کو "خدا کی تصویر" کہا جا سکتا۔ جن ہستیوں کا وجود تم اپنے لئے تکلیف دہ سمجھتے ہو۔ اگر یہ دنیا میں پیدا نہ ہوئی ہوتیں تو یہ عالم جس میں تم آج اشرف المخلوقات کہلائے جاتے ہو۔ ایک تاریک گورستان ہوتا جس میں ہر طرف ایک خاموشی کا عالم ہوتا اور تمہاری ہستی ایسی ہوتی جیسے گورستان میں مزار!!

"دردؔ"

نامۂ عشق - جناب نواب میر عابد علیخاں صولت جنگ بہادر متخلص بہ عابدؔ۔ رئیس حیدر آباد دکن کا چوتھا دیوان اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اگر اس ناظم ملک سخن کی چاشنی گیری کلام جنّت رُوح کا حکم رکھتی ہے تو کتاب کی نفیس چھپائی اور کاغذ کی آب و تاب بھی فردوس نگاہ سے کم نہیں۔ اور پھر مصنف یعنی حضرت ناظم کی ہاف ٹون عکسی تصویر نے اور بھی کتاب کے حسن کو بڑھا دیا ہے۔ حضرت ناظم سے درخواست کرنے پر مل سکتا ہے +

بزم قمر

اور

کشمیر کا ایک مجذوب جانور

حضرت خلیل الرحمٰن علیٰ نبیّنا وعلیہ السلام نے چشم عبرت سے ماہ و خورشید کی بے ثباتی دیکھکر لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ کا دم مارا۔ ایمان و یقین کو تازہ کرنے میں ہر ایک اہل بصر کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہئیے۔ کشمیری جنگلوں کا ایک جانور جس کی کیفیت ان سطور کے خاتمہ پر درج ہوگی۔ ایسا ہی قدرتی معلم اور سچا خدا دوست ہے جیسے کہ خدا کے پیارے خلیل ؑ تھے۔

غور سے دیکھئے کہ غرّہ ماہ سے سلخ تک بزم قمر میں کتنے انقلاب واقع ہوتے ہیں۔ روز اوّل مصحف حسن کی سورہ نوُ کا نشانِ رکوع ہے یا ابروئے محبوب کا خاکا یا حلقہ پر طاؤس کا دھوکا۔ پھر ہفتہ میں بڑھتے بڑھتے جبین محبوب کا سنہری ٹیکا ہے، یا چاند جس کی ملیح روشنی اور دل لبھانے والی ادا دُنیا کو محوِ حیرت کرتی ہے۔ حتّٰی کہ چودھویں رات کا شاہانہ جلوس بالکل نرالے ڈھنگ پر مترتب ہوکر تمام عالم کو قدرت کا ملہ صانع کائنات کے مشاہدہ کا لطف دکھاتا ہے۔ اس روز محمل شام فلک میں بدر منیر کی سواری بڑی شان بان سے نمودار ہوتی ہے۔ مشتاقانِ جمال کتانِ صبر کو چاک کر بیٹھتے ہیں اور جلسہ شروع ہوجاتا ہے۔ جس کا اثر نہ اسی بزم آرائی تک محدود ہے بلکہ سارے عالم کی محافل طرب کی ہنگامہ افروزی اُسی کا کرشمہ ہے۔ فلک کے

آبنوسی تخت پر ملکۂ قمر المنیر کا جلوہ اور گرد و پیش چمکتے ہوئے ستاروں کا جھمگٹا
جیسی جیسی سرد روشنی کی نورانی چادر کل عالم پر بچھا دی گئی ہے اور اس کے
شامیانے کے زیر سایہ بڑے بڑے شاہان عالی پایہ صبح قیامت تک
نہ جاگنے والی نیند میں سو رہے ہیں نور قمری کے اثر سے فواکہات و نباتات
میں رنگ آمیزی ہوتی ہے اسی کی بدولت شب ماہ میں کشمیر کے آب ڈل پر
عکس ماہ پڑنے سے نور جہاں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اسی کی ضیا سے شاہجہان
کے بنائے ہوئے کشمیری شالباغ کے فواروں میں پانی کو سنہری ستونوں کی زینت
ملتی ہے۔ مجالس عشق کی وہ بیابانی کی رہنما اگر ہے تو یہی چاندنی ہے۔
صوفیان خدا پرست کے دل ہلانے والے عشوے اسی میں ہیں۔ زاہدان گوشہ نشین
خلوت کو بھی چپکے کنج تنہائی سے نکال کر مرغزاروں میں ٹہلاتی ہے۔ مہرویان
پردہ نشین اسی کے بادۂ شوق سے مخمور ہو کر سر سے دوپٹے اتارے ہوئے
جلوہ افزائے لب بام ہو جاتے ہیں۔ غرض کتنا ہی سنگدل کیوں نہ ہو اس کے
نظارہ سے ایک بار ضرور وجد میں آ جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ پندرھویں رات
سے اس بزم سرور میں درہمی برہمی ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ تا اینکہ آہستہ
آہستہ ۲۹ تاریخ کی شب میں چاند بالکل نیست و نابود ہو جاتا ہے اور اس حسرتناک
انقلاب کو دیکھ کر کشمیر کے جنگلوں کا ایک جانور ایام بہار کی شب ماہ کو
یوں دیجور میں بدلتے دیکھنے سے متاثر ہوتا اور تمام رات کسی درخت کی شاخ میں
لٹکا ہوا صاف آواز میں رب سچا دنیا جھوٹی کا ورد کرتا رہتا ہے۔ اسی
سبب سے پہاڑی دہ باشوں نے اس کا نام "رب سچا" رکھا ہے ؀

شیر علی خاں کشمیر

زیارتِ سرہند شریف

ان چند سطور میں سرہند کے تاریخی واقعات اور امتیازات
پر مناسب روشنی ڈالنے کے ساتھ وہاں کی موجودہ قابلِ افسوس حالت
پر بھی کچھ اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور اسے بغرضِ اطلاع ناظرین بل
میں درج کیا جاتا ہے جو فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سرہند شریف کی آب و ہوا میں کوئی قابلِ تعریف بات نہیں - مگر یہاں کے کھنڈرات اور آثار الصنادید کی سیر نہایت پُرلطف اور عبرت بخش ہے۔ اگرچہ یہاں مجمعِ احباب مفقود ہے اور کوئی آدمی بھی نہیں جس کی صحبت سے دو گھڑی غم غلط ہو - مگر اس کا نعم البدل صبح و شام اُن پُرانے مکانات اور مزارات مبارک کے آثار قدیم کی زیارت ہے جو اپنی زبانِ حال سے افسانہ ماضی سُنا کر دل کو تڑپا دیتے ہیں - میرا خیال تو یہ ہے کہ سرہند شریف کے حالات اور آثارِ سلف کا کسی بقصرنے نظرِ غور سے نظارہ ہی نہیں کیا ورنہ ممکن نہ تھا کہ سرہند شریف کے آثارات کی ایک اور آثار الصنادید تیار نہ ہوتی - کیونکہ یہاں کی عظمت و شان دہلی کے مقابلہ میں کچھ کم نہیں - دہلی کو لوگ زیادہ تر اس وجہ سے قابلِ عزت اور پُرانے واقعات کا مخزن بتاتے ہیں - کہ با اثر شاہانِ مغلیہ کا دارالخلافہ و مدفن یہی شہر ہے - مگر اسی طرح سرہند شریف بھی مقبولِ بندگانِ خدا کی خوابگاہ ہونے کے لحاظ سے کچھ کم نہیں - سلسلہ مجددیہ کے علاوہ اور

بہت سے اولیائے کرام اور بزرگان دین بھی اس خاک میں آسودہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں
کہ سرہند شریف کو دنیا کا نامور مقام کہا جائے۔ موجودہ بستی کے ارد گرد دو
دو تین تین میل تک کھنڈرات کا سلسلہ جنگل کو شرمندہ بنانے کے لئے کافی ہے۔
سرہند شریف سے بجانب شمال ایک میل کے فاصلہ پر ایک عالیشان ویران عمارت
جہاز والی حویلی کے نام سے جو مشہور ہے۔ عمارت کو دیکھ کر معلوم ہوتا
ہے کہ کسی متمول امیر کا شاندار محل تھا۔ جو زمانہ کے ہاتھوں سے پامال ہوتا
ہوتے ہوئے بھی اب بھی اپنی خصوصیت کو قائم رکھے ہے۔ یہ کیسی قابل تعریف
بات ہے کہ اس قدر کمرے اوپر کی منزل میں ہیں۔ اتنے ہی زمین کی تہ
میں بنے ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ تہ خانوں میں روشنی اس طرح پہنچائی
گئی ہے کہ دیکھنے سے حیرانی ہوتی ہے۔ طرز تعمیر کچھ ایسا نرالا ہے کہ
پرانے فن عمارت میں جہاں تاج محل اور قطب صاحب کی لاٹ جیسی
مشہور عمارات موجود ہیں۔ وہیں ایک اور عمارات کا اضافہ بھی ہو جاتا
ہے۔ اس محل کے وسط میں سنگ مرمر کا حوض اس طریق پر بنایا گیا ہے
کہ محل کی تمام عمارت کے وسط میں پڑتا اور ہر جگہ سے یکساں نظر آتا ہے۔
اگرچہ یہ تمام عمارت نہایت تاریک اور شکستہ ہے۔ جس سے اس کے کل
حالات پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔ مگر پھر بھی سرہند شریف کو قابل فخر بنانے
کے لئے بہت کافی ہے۔

بزرگان دین کے مزار مبارک اور عمدہ عمدہ زیارت گاہیں تو چپے چپے
پر پھیلی ہوئی ہیں۔ سرہند شریف کے کھنڈرات اگرچہ باطن میں نیک بندگان
خدا کی پاک ارواح سے آباد ہیں۔ مگر افسوس ان شہر کے غریب اور امیر

باشندگان اور بندگانِ خدا کے مکانات خراب و خستہ ہونے کی زد میں آکر
مکان بے مکین رہ گئے ہیں اور اب مکینوں کا کوئی نوحہ خواں بھی نہیں خصوصاً
شام کے وقت کا بھیانک نظارہ بڑا دل شکن اور اپنی بیکسی کی یادگار ہے
پاک اور متبرک مکانات زمینداروں کے جانوروں سے آباد کر رکھے ہیں
قابلِ دید اور مشہور مسجدیں اپنی بربادی کی خود ہی مرثیہ خواں نظر آتی ہیں
شام کو مغرب کے بعد جو ایک عجیب بات میں نے اس جگہ دیکھی وہ یہ ہے
کہ ہوا کی سنسناہٹ میں ایک ایسی آواز سنائی دیتی ہے جو کسی مردِ بیمار
کے کراہنے یا شور و بکا سے پیدا ہو۔ ایک شام کا ذکر ہے۔ میں تنہا
ایک بزرگ کے مزار مبارک پر فاتحہ خواں تھا۔ کہ اسی وحشتناک اور
جنگل کے ڈراونے سین نے مجھے ڈرا سا دیا۔

سرہند شریف اور اس کے گرد و نواح کے رہنے والے ان قدیم
آثارات سے بالکل ناواقف اور محض مردہ دل ہیں۔ بات یہ ہے کہ کسی
عمارت کا کتبہ جس سے کچھ پتہ چل سکے اور قدیم شان عمارت باشان
اسلام کا اظہار ہو زمانہ کے دستِ تطاول سے صحیح اور سالم نہیں رہا۔ محض
ایک ایسا ڈھانچ موجود ہے جس کا گوشت پوست تمام خاکستر بن چکا ہے
مگر ہڈیاں اصلی جگہ بدستور چسپاں ہیں جن سے اصل شکل و صورت کا ایک دھندلا سا
نقشہ چشمِ تصور میں کھنچ جاتا ہے۔

انہیں عمارات میں ایک مشہور مسجد صدر قصائی کے نام سے
مشہور ہے۔ یہ تحصیل کے متصل آبادی کے ایک بیرونی گوشہ میں بندگانِ
خدا کی بندگی سے مستثنیٰ زاہدِ خشک کا چولا پہنے استادہ ہے۔ ایک

مولوی صاحب کی زبانی جو مسجد کے ملاں مگر بلند نظر اور روشن دماغ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ صدر قسائی اس مسجد کا بانی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا سنگ بنیاد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے نے رکھا تھا۔ جن کا اسم مبارک معلوم نہیں ہو سکا۔ اور اس کو تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ خود عمارت بھی اپنے بانی کی شان اور عالی دماغی کا بین ثبوت ہے مگر افسوس کہ بیچارے بنانے والے کے خیالات جو اس کی تکمیل کے متعلق ہونگے پورے نہ ہو سکے اور درمیان ہی میں ملکی سیاست کے انقلاب نے اس کو پامال کر ڈالا۔ مسجد کا قدیم حصہ جو تعمیر ہوا تھا وہ محض دیواریں ہی چھت تک پہنچ کر رہ گئی تھیں۔ خدا بھلا کرے میاں حشمت علی صاحب تحصیلدار کا جو بیس سال ہوئے سرہند شریف میں تحصیلدار ہو کر آئے اور مسجد کے گنبد اور اوپر کی پھر نئی تعمیر کر گئے جس سے یہ مسجد اب تک موجود ہے۔ درمیان کا گنبد جو تقریباً سو گز سے زیادہ کشادہ ہوگا ابھی تیار ہوا ہی تھا کہ تحصیلدار موصوف کو پٹیالہ بلا لیا گیا اور مسجد پھر نامکمل رہ گئی۔ مسجد کی دیواریں صرف معمولی چونہ اور اینٹ سے تیار نہیں ہوئیں بلکہ پتھر سے بنی ہیں۔ اور ایک دیوار کے آثار میں فقط دو دو تین تین پتھر تمام دیوار کے لئے کافی ہو گئے ہیں۔ یہ پتھر نہایت سیاہ فام کھردرے اور کوئی سو سو من پختہ کے ہیں۔ اور خدا جانے کس طرح اور کیسے انکو تعمیر میں استعمال کیا ہوگا۔

ایک پہاڑی چویا (نالہ) جو قصبہ سرہند شریف کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ لوگوں کو بارش میں آنے جانے کی بہت تکلیف دیتا ہے۔ پندرہ

یہ سال ہوئے کہ ناظم صاحب ضلع نے ریاست سے ایک پل کی منظوری لیکر
فیرل کے لئے ایک شخص مقرر کر دیا۔ اس بھلے مانس نے حکومت کے زعم
یں آکر وہی بڑے بڑے پتھر جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہی۔ مسجد سے نکلوا کے تعمیر
ل میں نصب کرا دیے۔ اور مسلمانوں کی شور و پکار پر کام بند اس وقت
ہوا جبکہ مسجد کا معتد بہ حصہ اُجڑ چکا تھا۔ غرضکہ ان پتھروں کی جگہ کو اینٹوں
سے پُر کیا گیا ہی جس سے مسجد نئے اور پرانے فن عمارت کا مخلوط نمونہ بن لاکر
رگئی ہی۔

شیخ وزیر علی پٹیالہ

از مولوی علی محمد صاحب معرفت رام دتہ مل تاجر کتب لوہاری دروازہ
لاہور۔ کتب ذیل موصول ہوئی ہیں:۔

بارہ امام۔ بارہ بزرگ اماموں کے حالات مع شجرۂ نسب۔ تقطیع جیبی
۶۵ صفحے کی کتاب۔ قیمت ۴ر

دس جنتی۔ رسول خدا کے اُن دس ساتھیوں کے حالات جنکو زندگی ہی میں
جنت کی بشارت ملگئی تھی۔ تقطیع جیبی قیمت ۲ر

پنجتن پاک۔ کے حالات ۱۰۰ صفحے۔ تقطیع جیبی۔ قیمت ۵ر

محبت رسول صلعم کے ساتھ محبت رکھنے کے معنی۔ علامتیں اور ثواب کا
بیان۔ یہ بھی جیبی تقطیع ہی۔ صفحات ۸۰ قیمت ۴ر

مرغوب القلوب۔ خواجہ شمس الدین محمد تبریزی کے اقوال۔ جیبی تقطیع ۲۴ صفحے
قیمت .. .. .. ۱ر یہ کتابیں عنوان بالا سے مل سکینگی۔ کتابیں
اپنے موضوع پر اچھی ہیں۔

آئینہ عبرت

مصنفہ جناب سہروردیہ بیگم صاحبہ اہلیہ جناب مولوی زاہد صاحب سہروردی ایم۔اے۔ بی۔ایل۔ بیرسٹرایٹ لا کلکتہ۔

جناب سہروردیہ بیگم صاحبہ اس وقت خواتین ہند میں بسبب علم و لیاقت اور خوشنویسی کے ایسی ممتاز اور ذیشان ہیں جیسا کہ ستاروں میں چودھویں کا چاند۔ ہمنے آئینہ عبرت کو جس کو جناب ممدوحہ نے حال میں ایک انگریزی تصنیف سے اقتباس کیا ہے پڑھا اور تعجب ہوا کہ ایسی پاکیزہ اور بامحاورہ اور شستہ فصیح اردو ممدوحہ نے شرقی بنگال میں کس طرح سیکھی۔ یہ کتاب قطع نظر حسن صوری یعنی جلد کی خوبصورتی۔ کاغذ کی عمدگی اور چھاپے کی صفائی کے۔ حسن معنی میں بھی لاجواب ہے۔ انسان پر مصیبت پڑتی ہی ہے۔ بالخصوص بیوہ عورتوں پر جب بچوں کا ساتھ ہو اور افلاس دامنگیر ہو۔ یہ کتاب ایسی حالت میں نہایت مسکن و معلم ہے۔ آئینہ عبرت میں ایک مغربی لیڈی کا حال ہے کہ کیا کیا مصائب اس پر گذرے اور کیسے صبر اور کیسی دانشمندی اور خوشمزاجی اور استقلال سے اس نے انکو جھیلا اور اپنے بچوں کی کیسی عمدہ تعلیم و تربیت کی۔ بالآخر خدا نے اس کے دن پھیرے اور اُس کا گھر عشرت اور آرام کا گھر ہوگیا۔ اس وقت اس نیک اور عاقل لیڈی نے اُن لوگوں کے ساتھ جنہوں نے اس کے زمانہ مصیبت میں اس کے ساتھ بدسلوکی کی تھی احسانات کئے اور ان کے سابق کے بُرے برتاؤ سے چشم پوشی کی۔ سوشل اور ریلیجس ہر پہلو سے یہ کتاب بہت مفید اور ضروری ہے۔ طالب علموں کے لئے چراغ ہدایت ہے۔ ان پر اس بات کو روشن کرتی ہے کہ مفلسی طلب علم و ہنر سے نہیں روک سکتی۔ اگر توفیق رفیق اور شوق کامل ہو۔ مصیبت افلاس اور بچوں کی تعلیم کی فکر میں مبتلا بیبیوں کے لئے یہ کتاب نہایت کارآمد ہے۔ اس کتاب کو آنریبل سنڈیکیٹ یونیورسٹی کلکتہ نے نصاب امتحان میٹرکولیشن کے لئے منظور کر لیا ہے۔ جناب ممدوحہ نے اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ ہم ان کی نیکدلی اور لٹریری قابلیت پر آفرین و مرحبا کہتے ہیں۔ درحقیقت وہ ایک بڑے ذی علم خاندان کی بیٹی ہیں۔ اسوقت سہروردیہ بیگم صاحبہ کے برادر عالی مرتبت آنریبل حضرت عبداللہ المامون السہروردی کی قابلیت علمی شہرہ آفاق ہے۔ آپ بیرسٹرایٹ لا ہیں۔ ٹیگور لا لکچرر ہیں۔ خیرخواہ اسلام ہیں۔ ایک نہایت لائق سپیکر اور واعظ ہیں۔ خدا اس خاندان کو روزافزوں ترقی دے۔

(سید اکبر حسین پنشنر جج الہ آباد)

ریویو

بچے کی تندرستی

مصر میں کچھ عرصہ ہوا ایک کتاب صحۃ المولود نامی شائع ہوئی تھی جسے ایک مصری فاضل ڈاکٹر عبدالعزیز نظمی نے جو قاہرہ میں حکومت کی طرف سے خاص حفظانِ اطفال اور بچوں کی تندرستی کے نگران ہیں تصنیف کیا تھا۔ اس مفید کتاب کا اب ورد اور سلیس ترجمہ اردو میں شائع ہوا ہے۔ اور بچے کی تندرستی اس کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ ترجمہ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری رودولوی نے کیا ہے جو عربی سے ترجمہ کرنے میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہیں اور ان کے کئی تراجم اس سے پیشتر چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ چنانچہ ابو مسلم خراسانی جو ناول مخزن ایجنسی کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ آپ ہی کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔ مولوی صاحب کے ترجمہ میں یہ بڑی خوبی ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ نمونہ کے طور پر اصلی کتاب کی تمہید کے ترجمہ کی چند سطریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ عبارت کی روانی کو دیکھتے ہوئے خیال بھی نہیں آتا کہ اصل عبارت عربی تھی جسے ایک مشاق اہلِ زبان اردو کے سانچے میں ڈھال رہا ہے:۔

"آدمی کا بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو اسکو نہ اپنا ہوش ہوتا ہے اور نہ اس کے بدن پر دوسرے جانوروں کے بچوں کی طرح کوئی قدرتی لباس پایا جاتا ہے۔ آدمی کے بچے کی کھال نہایت نرم اور نازک ہوتی ہے۔ بدن پر کوئی چیز اس کو سردی اور گرمی سے بچانے والی نہیں ہوتی۔ نہ پرندوں کی مانند پر و بال اور نہ دوسرے جانوروں کے بچوں کی طرح اون یا موٹی کھال۔ بالکل برہنہ۔ بے بس اور بے سمجھ ہوتا ہے۔ جلدی بھوکا پیاسا۔ اٹھا بیٹھا بھی نہیں جاتا"۔ غرض یہ کہ ترجمہ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ اصل کتاب کے پڑھنے کا لطف آتا ہے۔ زبان سادہ اور عام فہم ہے۔ کہ لڑکیاں آسانی سے پڑھ سکیں اور فائدہ اٹھا سکیں۔ اصل مصنف نے کتاب کے مطالب پڑھنے والوں کے ذہن نشین کرنے کے لئے یہ طریق اختیار کیا تھا۔ کہ ہر فصل کے خاتمہ پر اس فصل کا خلاصہ اور اس کے متعلق سوالات درج کر دئے تھے۔ مترجم نے بھی اس التزام کو نباہا ہے۔ یہ کتاب چھوٹی تقطیع پر بالتصویر اچھی صاف چھپی ہے۔ اور ایک سو چھیاسی صفحے کی ہے۔ قیمت فی جلد ۱۰ ار ہے اور مولوی محمد حلیم انصاری رودولوی (دفتر مخزن۔ لاہور) سے مل سکتی ہے۔

کلام اکبر

ہمارے محترم حضرت اکبر نے ایک تازہ عنایت نامہ میں صرف ایک شعر عنایت کیا ہے۔ چونکہ آپ کے کلام کا اشتیاق ہر شخص کو رہتا ہے اور چونکہ یہ شعر موزوں اور مناسب وقت بھی ہے۔ اس لئے ہم تحفۃً اس کو نذر مخزن کرتے ہیں:-

وہ کہتے ہیں کہ اے اکبر یہ روزہ اک قیامت ہے
بجا ارشاد ہوتا ہے مگر افطار جنت ہے

عید

عید کا مہینہ ہے اور پرچہ کے شائع ہونے کا وقت عید سے قریب ہے اس لئے ذیل کی فارسی نظم دلچسپی سے پڑھی جائیگی۔ اور خصوصاً جبکہ حضرت اکبر نے روزہ کے افطار کا تذکرہ کر دیا ہے پھر تو اس کا لطف کچھ وہی لوگ محسوس کرینگے جنہوں نے فرض صوم سے فارغ ہو کر عید کی ہے۔ مگر فراق احباب و اعزہ نے ان کی عید کا مزہ کرکرا رکھا ہے۔

چو من بعید ز یارم مرا بہ عید چہ کار

اگرچہ موسم عید است و جوش فصل بہار | صلائے عیش دہد با ہزار لحن ہزار
اگرچہ وقت طرب ہست و روز عیش افزا | جہانیاں بسرت جہاں نقش و نگار

یکے بمژده که عیدِ مہِ صیام آمد — یکے بناز که بختِ من است برخوردار

یکے بعیش که عید آمد و بہار آمد — یکے بناز خرامد بخانۂ خمار

وزد بصحنِ گلستان نسیمِ عنبر بیز — لباس عالمیان ہست طبلۂ عطار

یکے رود سوئے بازار در لباسِ نو — یکے رود سوئے گلزار با دف و مزمار

یکے ستاده بیاران کند معانقہا — یکے نشستہ بمسجد برائے استغفار

یکے منم که علی الرغم جملہ اہلِ جہاں — کنم بناخنِ غم سینہ و جگر افگار

کنم بناز جہانگاه خیرِ مقدمِ عید — جگر بآتشِ غم چشمِ زار زار بیا

ہزار اشک فشانم مگر ہنوز کم است — ہزار نالہ کنم ہم نیاید اندر کار

چرا نہ گریم و چوں اشکِ خوں فشاں نکنم — که با قیامِ وطن گشتہ ام غریبِ دیار

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم — حدیثِ دل بکہ گویم کرا کشم بکنار

بہار را چہ کنم زینتِ بہار نماند — نگار را چہ کنم رفت وقتِ نقش و نگار

بگو با بر بہاراں که اشک خوں بارد — بگو بگلشنِ شاداب ای شجر ذی الثمار

بغیر غسل برفتند چوں زن و دختر — ز غسل پیکرِ زارم چرا نہ دارد عار

چو مادرم ز جہاں شد بغیر گور و کفن — چرا نہ بر تنم آید لباسِ فاخره بار

چہ دل کشاید ازینم که زنده در گورم — ز مردگاں که غمِ شاں دل گرفت قرار

فرو شدند بسیلاب اقربا در دم — نماند جانِ غمین مرا کسے غمخوار

بایں امید که عکسے ز دوستاں بینم — کنارِ آب نشستم بسانِ بوتیمار

برنگِ ریگِ رواں کارواں عمر رواں — چو موجِ دجلہ بیکدم دمے ندید قرار

امید نیست که عمرِ گذشتہ باز آید — امید نیست که یارم دگر رسد بکنار

نہ آید آب فرو رفتہ باز اندر جو — گلِ فسرده نہ خندد بصد ہزار بہار

شہید تیغ جفا ام زمن مپرس اے دوست — بروز عیش بگریم اگرچہ ابر بہار

بہ عیدہا ہمہ خلق من بعید زیار

چو من بعید زیارم مرا بہ عید چہ کار

کلام عزیز

(خاک کی بستی)

جام جم کیوں دیکھئے کیوں ورسلو دیکھئے — کس لئے ساقی کا حسن روئے پردہ دیکھئے

ذوق اگر اس خاک کی بستی کا منظر دیکھئے — ذرہ ذرہ میں ہے اک عبرت کا دفتر دیکھئے

کیسے کیسے نامور کیسے کیسے تاجدار

سو رہے ہیں سر سے اوڑھے چادر گرد و غبار

کوئی مونس ہے نہ انکا اور نہ کوئی غمگسار — چارہ گر ہے اب نہ کوئی اور نہ ہے تیماردار

چند افعی ہیں یہ انکے گلے کا اب ہیں ہار — ہڈیوں پر انکے کیڑوں کے کیا نقش و نگار

مرجع دنیا تھے اور ہر علم میں طاق تھے

سب وہی تو ہیں جو کل تک شہرۂ آفاق تھے

الوداع اے دوستان باوفا و باصفا — الفراق اے جان نثاران عزیز باوفا

الرحیل اے رہ نوردان طریق ابتدا — السفر اے ساکنان گلشن دارالفنا

السلام اے بعد ما آیندگان فتنی

برشما خوش باد ناخوش اے دنیائے دنی

سرزمین طبقۂ گور غریباں دیکھئے — دیدہ عبرت نگہ سے یہ بیاباں دیکھئے

اک ذرا آ کر یہاں کا ساز و ساماں دیکھئے — آسماں کے کچھ ستارے ہیں یہاں پنہاں دیکھئے

چپ ہیں لیکن اُنکی خاموشی نہیں ہے بے سبب
مٹ و نشاں ٹوٹی ہوئی قبروں سے اب تک ہیں یہ سب

کیا بتاؤں کچھ عجب وحشت سرا ہے یہ مقام
آسماں ہے اور نہ سیارہ و ثوابت کا نظام
گھر بنے ہیں اس طرح سے جنمیں در ہیں اور نہ بام
گوشہ گوشہ میں پڑے ہیں چند بوسیدہ عظام

یہ مثلث البیت ہے دیکھو نگاہِ غور سے
کچھ نہ پوچھو یہ بسر کرتے ہیں اب کس طور سے

کس قدر ہے تفرقہ پرداز چرخِ کجمدار
ایک حالت پر کبھی رہنا نہیں اسکو قرار
دیکھکر اس صفحۂ خاکی پہ ہر اک کا مزار
پڑھ رہا ہوں حضرتِ غالب کا مطلع بار بار

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

کام آتی ہے نہ دولت اور نہ حشمت اب یہاں
وہ حکومت ہے نہ اُنکی اور نہ ہیں وہ حکمراں
وہ ہیں اور زیرِ زمیں ہے تنگ و تاریک اک مکاں
وہ ہیں اور اک قید خانہ وہ ہیں اور اک خاکداں

ہاں مگر اخلاق اُنکے صفحۂ دنیا پہ ہیں
یادگارِ اشفاق اُنکے صفحۂ دنیا پہ ہیں

[illegible]

عشق

میونشین سرور جہان آبادی آنجہانی نے جو نظمیں ہمیں آخر میں سال کی تھیں ان میں سے دو ہمارے پاس باقی ہیں۔ اور یہ ایک اس پرچہ میں درج ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ نظمیں مرحوم نے دوسرے پرچوں کو بھی دیدی

میں گردبادِ کوئے ملامت ہوں خضر کو — مجھ کو کہاں خیالِ نشیب و فرازِ عشق

ہستی ہے میری صورتِ آئینہ خیال — ہوں میں طلسمِ جلوۂ حیرت طرازِ عشق

وہ روشناسِ سوزِ محبت ہوں میں سرور

پہلو میں داغِ عشق ہوں۔ دل میں گدازِ عشق

تضمین

مجد صاحب نے یہ تضمین حضرت بیان یزدانی مرحوم کی اس بیتہ غزل پر کی ہے جو ایک عرصہ ہوا مخزن میں چھپ کر نہایت مقبول ہو چکی ہے اور امید ہے کہ اس تضمین کو بھی ویسی ہی مقبولیت حاصل ہو گی۔

راحتِ دلِ زار بیتاب ہیں جا لے آجا — بختِ خفتہ کو بھی اک بار جگا لے آجا

اے مرے چاند مرے گھر کے اجالے آجا — خواب میں زلف کو مکھڑے سے ہٹا لے آجا

بے نقاب آج تو اے گیسوؤں والے آجا

اشک آنکھوں میں ہیں اور لب پہ ہیں نالے آجا — ہجر میں زخمِ جگر ہو گئے آلے آجا

دل ہوا داغ پڑے جان کے لالے آجا — تیری پرسش کو ترستے ہیں یہ چھالے آجا

راہ میں چھوڑ گئے قافلے والے آجا

حسرتِ عالمیاں کون ہوا تیرے سوا — زیبِ تن کس کے ہے خلعتِ لولاک لما

چاند دو ٹکڑے ہوا کس کے اشارہ سے بتا — کون ہے ماہِ عرب کون ہے محبوبِ خدا

اے دو عالم کے حسینوں سے نرالے آجا

ہوش طولِ شبِ فرقت نے اڑا رکھا ہے — عقل کو طاق پہ نسیان کے اٹھا رکھا ہے

بس سوا سانس کے اب جسم میں کیا رکھا ہو — دم تری دید کو آنکھوں میں کھنچا رکھا ہے

[illegible] ہے ہیں تیرے بیمار سنبھالے آجا

دھیان میں میرے گناہوں کو اگر لاتے ہیں — کاتبِ نامۂ اعمال بھی شرماتے ہیں

کیا کہوں خاک احباب مجھے بہلاتے ہیں — ہوں سیہ کار مرے عیب کھلے جاتے ہیں

کملی والے مجھے کملی میں چھپالے آجا

نوک کی لیتے ہیں اب خارِ بیاباں سرِ راہ — پاؤں کٹ کٹ کے ہوے جاتے ہیں قرباں سرِ راہ

دو قدم طے نہیں ہو سکتا ہے میداں سرِ راہ — دیکھتے ہیں تجھے پھر پھر کے مغیلاں سرِ راہ

ڈگمگاتے ہیں قدم کون سنبھالے آجا

تیری کیا بات ہے کیا شان ہے اللہ غنی — تو ازل سے ہوا گنجورِ جنابِ احدی

گنجِ اسرار دی ہر ہاتھ میں تیرے کنجی — وقف ہے تیرے لئے دولتِ گنجِ مخفی

کھل گئے ہفت سماوات کے تالے آجا

گھر سے نو دو ماہ عرب جب شبِ معراج چلا — راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے فرشتے ہر جا

کر کے سب منزلیں طے تا بمقامِ اقصیٰ — پہنچا محبوب تو مشتاقِ رحمت نے کہا

خلوتِ راز میں اے ناز کے پالے آجا

ان بیاباں میں نہیں خارِ من و تو کا نشاں — کفر سے کوئی غرض ہے نہ خیالِ ایماں

یاں نہ کثرت کی جگہ ہے نہ دوئی کا امکاں — رنگِ وحدت ہے یہاں غنچۂ خلوت ہے یہاں

اے گلِ گلشنِ لولاکَ لَمَا لے آجا

دیکھیں کب تک ابھی قسمت میں ہے آنسو پینا — امجدِ زار کا اب ہو گیا مشکل جینا

ہوتے جاتے ہیں ہرے زخم بہ رنگِ مینا — صورتِ لالہ ہے پر داغ بیاباں کا سینا

پڑ رہے ہیں تیرے بیمار کے لالے آجا

تازہ غزلیں

(از جناب مولوی مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی)

دلِ پُر درد سے جو آہ پُر تاثیر نکلی ہے | غمِ پنہاں کی لیکر ساتھ اک تفسیر نکلی ہے
یہ کون آتا ہے یارب استقبالِ محبت میں | سیہ خانہ سے مجنوں اک نئی شمشیر نکلی ہے
سزا جو چاہے دو راضی ہوں میں جھگڑا ہی کیا اس کا | کسی کی ہو خطا اب تو مری تقصیر نکلی ہے
مجھے لیجا کے رکھدو اس کی گلی میں آج سمجھے | سُنا ہے چارہ سازوں میں یہ اک تدبیر نکلی ہے
دکھاؤنگا تمہیں بھی میں آخر اپنی ہستی کا | کہ آج اک ابتدائی عشق کی تصویر نکلی ہے
لہو جس رنگ سے بہتا ہے دل کا کس نے کھایا ہے | گراں بستوں سے اک جوئے شیر نکلی ہے
ہجوم و عجز سے دیکھا عبادت کرنیوالوں نے | بساطِ خواب پر دھندلی سی اک تعبیر نکلی ہے
نظر ہے مفتیانِ شہر کی کوتاہ بینی پر | پرستاری بتوں کی علتِ تکفیر نکلی ہے
ہجومِ عام ہے سب ہیں دیکھکر اسکو | مرے بعد آج میرے گھر سے اک تحریر نکلی ہے
عزیز اب وعدۂ صبر آزما پر اس نے ٹالا ہے | بڑی مشکل سے آج اک زیست کی تدبیر نکلی ہے

(از جناب نورالدین صاحب عنبر)

عمر بھر وہ مجھ کو تڑپاتے رہے | اک جھلک کو بھی وہ ترساتے رہے
کچھ نہ پوچھو میرے دل کی حسرتیں | کھیل بن بن کر بگڑ جاتے رہے
بحرِ ہستی میں بچی کب جانِ زار | یونہی گر طوفانِ غم آتے رہے
غنچہ ہائے گلستانِ آرزو | بن کھلے افسوس مرجھاتے رہے
منہ کے آگے میرے دل کا آئینہ | حسن پر وہ اپنے اتراتے رہے

کاوش میرے زخمِ دل کی دیکھئے — جو نمک کے تیر برساتے رہے
تھک کے جب بیٹھے کبھی جا کیمپ میں — یادِ یارانِ وطن آتے رہے
عنبرِ مہجور جب یاں کیا وطن — تھا وطن جن کا وطن جاتے رہے
کہہ دیا عنبر نے پھر اُن کو جواب — کل جو احباب اسکو سمجھاتے رہے
میکدے کے جام خالی دیکھ کر — اشکِ خوں آنکھوں میں بھر لاتے رہے

(از جناب بسمل کاسگنجوی)

دشمن سے رازِ وصل کہا انتہا ہوئی — یہ عمر بھر میں ایک ہی ہم سے خطا ہوئی
کس کی طرف سے رنج کی آج ابتدا ہوئی — الزام مجھ پہ رکھتے ہو اب انتہا ہوئی
دردِ فراق نسخۂ عیسےٰ سے بڑھ گیا — کس کا تھا میں مریض یہ کس کی دوا ہوئی
ہے آفتابِ حشر کا بھی رنگ نیلگوں — طولِ شبِ فراق کی اب انتہا ہوئی
اے بے نیاز تیری کریمی کے میں نثار — بخشی گناہگار سے جو کچھ خطا ہوئی
وہ سو رہے تھے چین سے میں محوِ دید تھا — کس وقت آہ مرغِ سحر کی صدا ہوئی
شاید کسی کے دل کو کیا تم نے پائمال — پھیکی جو آج شوخیِ رنگِ حنا ہوئی
اُس سیم تن کے کوچہ میں پہنچے ہوا کے ساتھ — خاکِ مزار حق میں مرے کیمیا ہوئی
خنجر بکف گئے تھے وہ زنداں کی سمت کو — کیا جانے کس اسیر پہ مشقِ جفا ہوئی
تنہا ملیں کہیں تو کہیں اُن سے رازِ دل — یہ فکر یہ تلاش ہمیں بارہا ہوئی
دل کی لگی کو آپ نے سمجھا ہے دل لگی — ناداں بننے کی آپ کے اب انتہا ہوئی
مرقد میں بھی پڑا ہے اندھیرے سے واسطہ — ہم سے نہ آج بھی شبِ ہجراں جدا ہوئی
جیسے وہ آئے ویسے ہی بسمل چلے گئے — تم سے تو بات بھی کبھی [illegible]

برادرِ مرحوم کی یادگار

ہماری دونوں ٹوپیاں "محسن الملک پیٹنٹ" و "وقار الملک پیٹنٹ" جیسی کہ
موصوف تھیں۔ ویسی ہی پبلک نے انکی قدر کی جس کے لئے ہم حسبِ قدر مشکور ہیں
تھوڑا ہے۔ مگر اسی وضع کی ذرا کم قیمت ٹوپیوں کی بہت مانگ تھی۔ اس لئے ہم نے
مرحوم بھائی مولوی عبد الرشید چشتی بی۔ اے کی یادگار میں جن کے نام پر
ہماری دکان کا نام ہے اور جنکو ترکی ٹوپی نہایت عزیز تھی۔ ایک ٹوپی

رشید پیٹنٹ

اٹلی سے خاص آرڈر پر بنوائی ہے۔ چونکہ ہم چاہتے ہیں کہ ترکی ٹوپی جو اب ہمارا
قومی شعار بن چلی ہے ہر مسلمان کے سر پر نظر آئے۔ اس لئے ہم نے اس نئی
ٹوپی کی باوجود اس قدر خوش وضع ہونے کے قیمت نہایت تھوڑی رکھی ہے۔

رشید پیٹنٹ

۱۔ چھوٹی دیوار۔ اوپر سے نیچے تک قریباً برابر بہتر پٹی جھرو ریشم کا پھندنا۔ ۶
۲۔ چھوٹی دیوار۔ اوپر سے نیچے تک نقلی سبلی کا استر۔ ریشم کا پھندنا۔ ۴

(عبد الحمید چشتی) عبد الرشید برادرز جنرل مرچنٹ انار کلی لاہور

آبحیات
فوائد مصفّا
قیمت
حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور

اُردو اور بھاشا

اُردو زبان کے مٹانے یا کمزور بنانے کی کوشش دراصل ملک کے حق میں سخت نقصان رساں ہے۔ ایک ہردلعزیز اور عام زبان جس نے ہندو مسلمانوں کی متحدہ معاشرت کی گود میں پرورش پائی اور ان دونوں قوموں کے میل ملاپ ہی سے وجود میں آئی۔ اسکی سرپرستی دونوں پر واجب ہے۔ ذیل کے مضمون میں اسی بات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور اُمید ہے کہ یہ خیال اپنا اچھا اثر دکھائیگا۔

آفاق پر ہیں طاری آثار شام غم کے
اللہ دل کو قوت دے صبر کی سکوں کی

جب سے میں نے انبالہ چھوڑا اخباروں اور رسالوں کو مضمون لکھنا گویا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے کسی رسالہ میں یا اخبار میں میرا مضمون بہت کم دیکھا ہوگا اس کے بعد کچھ تو مصروفیت تھی اور کچھ بیماریاں۔ نیز ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جن معاملات پر لکھنا ضروری معلوم ہوتا تھا میں سمجھتا تھا کہ ملک کے بڑے آدمی جو صلح کل کے خواہاں ہیں۔ ان معاملات پر قلم فرسائی نہیں کرتے۔ عام لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں اور عوام کے ساتھ میدان میں آنا مہذب آدمیوں کا کام نہیں ہے۔

سگے پاے صحرا نشینے گزید بخشمے کہ زہرش ز دنداں چکید
شب از درد بیچارہ خوابش نبرد بخیل اندرش دخترے بود خرد
پدر را جفا کرد و تندی نمود کہ آخر ترا نیز دنداں نبود
پس از گریہ مرد پراگندہ روز بخندید کاے مامک دلفروز
مرا گرچہ ہم سلطنت بود و بیش دریغ آمدم کام و دندان خویش

چنانچہ اردو ہندی پر ایک عرصہ سے جھگڑے ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ عوام میں مقدمہ بازی بھی ہوئی مگر اکثر خواص کو اس بحث پر خاموشی اختیار کرتے دیکھا میں بھی خاموش رہا اور بھاشا کے بارے میں آج تک ایک حرف نہیں لکھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اردو کی معاونت صرف مسلمانوں پر فرض نہیں ہے بلکہ ہندو صاحبان میں بھی کثرت سے اس کے معاون موجود ہیں۔ چنانچہ منشی حکم چند صاحب مرحوم ہیڈ ماسٹر اول گورنمنٹ ہائی سکول دہلی نے ایک وقت اردو کی تائید میں وہ اعلیٰ درجہ کا مضمون لکھا تھا کہ اگر کوئی دل جلا مسلمان بھی لکھتا تو ویسا ہی لکھتا۔

غرض یہ ہے کہ اگرچہ عوام ہندو بھائی اردو کے مخالف اور بھاشا کے طرفدار تھے مگر خواص ہندو صاحبان یا تو اردو کے طرفدار تھے۔ یا خاموش تھے۔ جو لوگ اس میدان میں اترے نہ تھے وہ کسی اور طرح سے اردو کے مربی بن گئے تھے مثلاً شعر کہتے۔ مشاعرے قائم کراتے۔ اردو مضامین لکھتے اور لکھاتے کرتے۔ دہلی کے بزرگ تو پہلے گروہ میں شامل تھے۔ یعنی کھلم کھلا اردو کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اب بھی کرتے ہیں اور حال میں گورنمنٹ ہائی سکول دہلی کی میٹنگ ہندوستان و ماسٹران میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ بعض بزرگ مثلاً

گنگا پرشاد نادر۔ ماسٹر پیارے لال صاحب رائے بہادر اور ایسے ہی دیگر صاحبان فریق ثانی میں شریک ہیں۔ یعنی کبھی مخالفت اُردو کی نہیں کرتے اور خود اہل زبان اور زبان دان ہیں۔ اسی طرح انبالہ کے بزرگوار وکیل لالہ مرلیدھر صاحب۔ اکثر شعر کہتے تھے۔ اخبار ضیائے کل اردو میں نکالا تھا ایک دفعہ مشاعرہ بھی قائم کیا تھا اور ان ہی کے ذیل میں ان کے دوست پنڈت مادھو رام صاحب وکیل انبالہ کو بھی میں سمجھتا تھا۔ مگر کچھ عرصہ ہوا میں نے پنڈت مادھو رام صاحب کا ایک مضمون دیکھا جو انہوں نے زمانہ میں چھپوایا تھا۔ مضمون لمبا چوڑا ہے مگر اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پنڈت صاحب نے اپنے ہندو بھائیوں کو ترغیب دی ہے کہ اردو کو جو مسلمانوں کی زبان ہے ترک کریں اور اس کی جگہ ناگری کو رائج کریں۔ خاصکر لالہ سری رام صاحب دہلوی پر انہوں نے بہت کچھ لے دے کی ہے اور خطا ان بیچاروں کی یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعروں کا تذکرہ حال میں ایک بڑی جلد میں لکھکر شائع کیا ہے اور اس تذکرے کی اور جلدیں زیر طبع ہیں۔ پنڈت صاحب نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے زور سے اپنے فوائد کے حاصل کرنے اور اپنی قوم کے فائدہ پہنچانے پر کمر باندھ رکھی ہے اور وہ اول خویش بعدہٗ درویش پر عمل کر رہے ہیں مگر ہندو ہیں کہ اول درویش بعدہٗ خویش پر عمل پیرا ہیں۔ چنانچہ لالہ سری رام صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر عمل کیا ہے کہ اپنے کالیداس اور تلسی داس کو تو چھوڑ دیا مگر داغ اور امیر مینائی وغیرہ کے حالات لکھکر شائع کئے۔ یہی اول درویش بعدہٗ خویش ہے۔ یہ ہے مختصر طور پر پنڈت مادھو رام صاحب کے مضمون کا اختصار۔

تعجب ہے۔ وہ پنڈت مادھو رام جو اردو سے نہایت شوق رکھتے تھے۔

جنھوں نے وید و شاستر کی واقفیت کے وقائع سکھ وغیرہ بزرگوں کی سوانح
عمریاں خود اردو میں تصنیف یا ترجمہ کر کے اپنے خرچ سے شائع کیں اب وہ
یوں فرماتے ہیں کہ وقت وقت کا راگ ہے۔ وقت نے پنڈت جی کے
خیالات کو بھی بدل دیا ہے

ہمیشہ نہیں رہتا وال رُخ کو دیکھئے   چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

حالات اور واقعات بدلتے رہتے ہیں غرض جب میں نے اپنے دوست
پنڈت بدری دت صاحب جیسے مہذب اور متین شخص کو اس میدان میں
اُترتے دیکھ لیا تو میں نے سمجھا کہ اب اس اکھاڑے میں اُترنا خلاف
مصلحت نہیں ہے بلکہ خاموش رہنا اغراضِ ملکی کے خلاف ہے ع

بیا تا دریں باشیوہ چالش کنم

چنانچہ اردو اور بھاشا کے بارہ میں میں بھی اپنے خیالاتِ منتشر کو ایک جگہ
کرتا ہوں اور اپنے دوست پنڈت جی سے اِنصاف اور توجّہ کا امیدوار ہوں

تو بہار ہست جنوں و پاک گریبان مدے   آتشم افتاد و بجان جنبش دامان دے

اول دیکھنا ہے کہ ہندوستان میں کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جواب
پچھلی سرکاری گنتی میں دو سو اکیاون گنی گئی تھیں۔ مگر اب ۱۴۷ کا شمار رہ گیا ہے۔ اب
یہ پوچھنا چاہئے کہ ان میں سب سے زیادہ کونسی مروّج ہے یعنی ہندوستان
کی سب سے بڑی تعداد باشندگان کے بولتی ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ
اُردو کو۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ ان سب میں آسان کونسی ہے۔ جواب
اُردو۔ وجہ یہ کہ ہندوستان کے کسی حصّہ میں چلے جائیے اس کا سمجھنے
والا مل جاتا ہے۔ چوتھا سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی دو

بڑی قوموں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان کونسی ہے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں کہ اردو۔ اردو میں جہاں ہزاروں شاعر مسلمان ہیں اور ہو گذرے ہیں وہاں ہزاروں ہی ہندو بھی ہیں اور گذر چکے ہیں ؎

مری سانی ذریں میں بھی ہم میں بھی میری منزلت ہے ۔ ہنوز سیر کو جوگی ہے تو توقع تھا ۔ امید مغفرت ہے

پانچواں سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی وہ کونسی زبان ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی کتابیں ترجمہ ہوئی ہوں۔ لکھی گئی ہوں۔ تصنیف کی گئی ہوں۔ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اردو۔ جہاں اوّل مسلمانوں میں سے شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن کا ترجمہ اردو میں کیا اس کے ساتھ ہی یعنی ابتدائی زمانہ میں ہی ایک ہندو بزرگوار نے رامائن کی بھی مذہبی اور متبرک کتاب کا اردو میں یوسف زلیخا کے بحر میں نظم میں ترجمہ کیا۔ اس بزرگ شاعر کا تخلص منشی تھا۔ اس نظم کی خوبی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ نمونہ یہ ہے ؎

شہنشاہِ اودھ مع مسرت تھا اک روز | سریر زرفشاں پر رونق افروز
سپے آرائش تاجِ زرافشاں | کیا آئینہ پیشِ رو کے تاباں
نگاہِ شہ پڑی کاکل پہ اک بار | سفید آئے نظر بال اس میں دو چار
خزاں دیکھی بہارِ زندگی میں | اماں دیکھی جسد اک بندگی میں
کہا دل میں کہ آیا دورِ پیری | نہیں زیبا ہے اب تاجِ امیری
مناسب ہے کہ اپنے روبرو اب | یہ تاج و تخت بخشوں رام کو سب
کریں رام اب اودھ میں بادشاہی | کروں صحرا میں میں یادِ الٰہی
بسشٹ منی سا ماں کو بلایا | اسے مرکوزِ خاطر سب سنایا

اُسی زبان میں بیان کرتا ہے جو اُسے عزیز تر ہوتی ہے اور جس میں وہ اپنی آیندہ نسلوں کو مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ زمانہ حال میں جہاں صدہا فقہ کی کتابیں اُردو میں مسلمانوں نے شائع کر دیں۔ وہاں منشی دوارکا پرشاد اُفق نے بالمیکی رامائن مہابھارت۔ سریمد بھاگوت اور بھگوت گیتا کو اُردو لباس پہنا دیا ؎

اللہ رے کامیابی اس چشم پُر فسوں کی   عقلیں ہزار اُبھریں تابع رہیں جنوں کی

چھٹا سوال یہ ہے کہ کل ہندوستان میں ہر دلعزیز کونسی زبان ہے؟ جواب یہ ہے کہ اُردو۔ جتنے تھیٹر اور ڈراما ہوتے ہیں سب اُردو میں اکثر تھیٹریکل کمپنیوں کے مالک ہندو ہیں۔ گر ایکٹر لوگ اپنا اپنا پارٹ اُردو میں ادا کرتے ہیں اور اُردو بھی شاعرانہ ہوتی ہے اور مقفیٰ۔ بات چیت بھی وہ مقفیٰ عبارت میں کرتے ہیں کیا حیرانی ہے کہ بمبئی میں تماشا ہو تو تھیٹر والے اُردو میں بیان کریں۔ مدراس میں ہو تو اُردو میں۔ کلکتہ اور لاہور میں جائیں تو اُردو میں تماشائیوں میں مارواڑی بھی ہوتے ہیں۔ بنگالی بھی۔ پنجابی بھی۔ اور دکنی اور ہندوستانی بھی۔ اگر یہ سب لوگ اُردو نہیں سمجھتے تو تین روپے سے لیکر چار آنہ تک کیوں اداکر کے تھیٹر میں جاتے ہیں ؎

اللہ اللہ یہ نورِ فلک و رنگِ زمیں   سچ تو یہ ہے کہ اسے جلوہ گری کہتے ہیں

ایک اور مزا ہے۔ ہندو صاحبان کے راس دھاری بھی راس اُردو ہی میں کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ اُردو کیا ہے۔ اصل میں مخلوط بھاشا ہے میری رائے میں اس کو اُردو کہنا ہی غلط ہے۔ یہ تو ترقی یافتہ بھاشا ہے۔ ساتواں سوال یہ ہے کہ علمی ترجمے اور ذخائر ہندوستان کی کونسی زبان میں زیادہ آئے۔ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اُردو میں۔ عیسائیوں نے اپنی بائبل

اللہ اکبر! ایک زمانہ وہ تھا کہ پنڈت جی اردو کی کتابوں کے لئے سفارش کرتے تھے کہ مدارس میں پڑھائی جائیں۔ یا آج سرے سے اردو ہی کو رخصت کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت شاعری اور علم ادب کے اردو رسالے کثرت سے جاری ہیں۔ کمال دہلی ہندو دوستوں کے اہتمام سے نکلتا ہے جس کے ایڈیٹر و پبلشر پیارے لال صاحب رونق و چندی پرشاد صاحب شیدا دہلوی ہیں۔ رسالہ زمانہ جس میں میرے دوست کا یہ مضمون چھپا ہے خود ہندو دوستوں کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح سے اور بیسیوں رسالے اردو میں جاری ہیں۔ کوئی ادبی ہے۔ کوئی اخلاقی۔ کوئی اصلاحِ رسوم کوئی انجمنوں اور جلسوں کی کیفیت کا۔ کسی میں نظم و نثر دونوں اور کسی میں ایک ہی ؎

نفرت نے باغ ہستی پیش نظر کیا ہے دیکھو بہار اکبر اس موتے لالہ گوں کی

ایک رسالہ دہلی سے مولوی ناصر علی خاں صاحب بہادر کے اہتمام سے نکلتا ہے جس کا نام صلائے عام ہے جس نے ثابت کر دیا کہ ہندوستان میں اگر کوئی زبان ایسی ہے کہ جس میں ہر قسم کے خیالات اور ہر قسم اور ہر طرح کے مضامین آ سکتے ہیں اور اعلیٰ درجہ اور اعلیٰ پیمانہ پر آ سکتے ہیں تو وہ اردو ہی ہے۔ ویسا ہی رسالہ مخزن نے ثابت کر دیا ہے۔ سررشتہ تعلیم ہائے سرکاری نے تو اردو میں جان ڈال دی گورنمنٹ کی مربیانہ توجہ نے تو اس کا پایہ آسمان پر پہنچا دیا ؎

جس جگہ تو حسن فوراً فتنہ دال پیدا ہوا چاہ میں یوسف گرا تو کارواں پیدا ہوا

سرکاری انگریز افسروں کے اردو میں چار درجہ کے امتحان ہوتے ہیں۔ لوئر سٹینڈرڈ۔ ہائر سٹینڈرڈ۔ پروفیشنسی اور ہائی پروفیشنسی۔ بڑے بڑے قومی اخبار ہندو اور آریہ صاحبان کے اردو میں ہیں جیسے ہندوستانی۔ اخبار عام۔ اخبار ہندوستان۔ انہی خزانہ والی زبان کو جسے ہندو

چو ہنگام اجل آید بکارت گلہ نہ لگہ آید | بچھائی کاہ کی تیری وہی تیرا بچھانا ہے
قبا و پیرہ و رنگیں ہمہ از تن تو بکشایند | دئیں گے کفن کی چادر جو تیرا خاص بانا ہے
ہزاراں کھانا گر داری پُر از حلوا و انگبیں | نہ یوں موشت ارد واجو تیرا خاص کھانا ہے
بہ مادر پدر فرزنداں برادر ہا کہ می نازی | وہی تجھ کو جلائینگے جنہاں پر پیت ٹھانا ہے
تو جہاں آمدی اینجا شدی خود خانۂ خانہ | تو اپنے آپ سے بھولا کسی کو نا پچھانا ہے
شراب شرع مینوشی اجل کردی فراموشی | مرن کو دور مت سمجھو عجب ٹک بہانا ہے
طلب بیداری دارم کہ روز اول شفاعت تھا | بسار و مت دلی را کہ آخر رام رانا ہے

آٹھواں سوال یہ ہے کہ عوام کو سہولیت کس زبان سے ہے۔ اردو سے یا بھاشا سے؟ جواب اردو سے۔ دلیل کیا؟ دلیل یہ ہے کہ اس وقت باوجود تعصب کے اس رو کے اردو کی کثرت رو کے نہیں رکتی۔ چنانچہ ڈاک خانہ جات میں جتنی چٹھیاں اردو زبان میں ڈالی جاتی ہیں اور کسی زبان میں نہیں پڑتیں۔ حالانکہ دس سال ہوئے ہونگے لالہ ہنسراج صاحب نے لاہور۔ انارکلی میں اپنے آریہ اور ہندو بھائیوں کو یہ ویاکھیان دیا تھا کہ تم ناگری میں چٹھیاں ڈالا کرو۔ چنانچہ صدہا معتقدین ناگری میں چٹھیاں ڈالنے لگے۔ مگر اردو کی تعداد کو نہیں پہنچیں۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں گورنمنٹ نے یہ حکم دیدیا کہ سائل چاہے ناگری میں عرضی دے خواہ اردو میں۔ اور ہندوستوں نے زور بھی لگایا مگر عرضیاں اردو ہی میں زیادہ پڑیں اور پڑیں گی۔

باصاف دل مجادلہ با خویشتن دشمنی ست | ہر کس کشد ہر آئنہ خنجر بخود کشد

(باقی آئندہ)

نور احمد نور

خاقانی اور عرفی کے کلام کی تنقید

(۲)

[illegible] ہوتا ہے جس کے دیکھتے ہی سے فوراً مخالف یا موافق
[illegible] شغل ہیں جوابی قصاید یا جوابی غزلیں لکھنے
[illegible] نے اِس طرز کو نکالا۔ آستین
[illegible] کہتے ہیں کہ فلاں شاعر نے جو فلاں شاعر
[illegible] بڑھ گیا ہے۔ حالانکہ شاعر نے اپنی طبیعت
[illegible] فردوسی نے حمد میں یہ
شعر لکھا ہے ؎

پناہ بلندی و پستی توئی   ندانم چہ ہر چہ ہستی توئی

نہایت بے ساختہ اور رواں دواں شعر ہے گویا ریگستان [illegible]
میں بے تکلف اِک اُٹھائے جا رہا ہے اور دوسرا مصرعہ تو بہت ہی
سادہ اور معنی خیز۔ دلکش ہے۔ مولانا نظامی گنجوی نے سکندر نامے کے
شروع میں یہ جواب دیا ہے ؎

پناہ بلندی و پستی توئی   ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

پہلا مصرعہ تو گویا فردوسی ہی کا ہے۔ ہاں دوسرے مصرعے میں تکلف
سے منطق کا مسئلہ بگھارا ہے۔ جسے ہمارے معمولی ملّا اور اساتذہ نہیں
سمجھ سکتے۔ نیستند کی تاویل کی جاتی ہے کہ نیست ہونے والے ہیں لیکن

اس صورت میں ملا نظامی (ہمہ فانیند) فرما سکتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ
سب ممکن الوجود ہیں اور واجب الوجود صرف تو ہے۔ اصل یہ ہے کہ ممکن
کا مفہوم عدمی ہے۔ جسے نیست سے تعبیر کیا ہے۔ ممکن اصطلاح متکلمین
منطقیین میں وہ ہے کہ جس کا نہ عدم ضروری ہو نہ وجود ضروری ہو۔
کیونکہ اگر وجود ضروری ہوگا تو واجب الوجود بنجائیگا۔ اور عدم ضروری
ہوگا تو ممتنع الوجود بنجائیگا۔ حالانکہ دونوں محالات سے ہیں۔ گویا امکان کے
معنی عدم ضرورۃ العدم والوجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم عدمی ہے یعنی لفظ
عدم کے تحت میں داخل ہے۔ پس نیستند سے مراد ممکن اور آنچہ ہستی سے
مراد واجب الوجود ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ ہمہ ممکن اند و چیزے را کہ ہستی
حقیقی (واجب الوجود) نامند آں توئی۔ مگر فردوسی کی شاعری ایسے دقیق
اور پیچ در پیچ مسائل سے بری ہے۔ اس کا حسن تو سادگی اور آمد اور اکثر
نیچرل ہے۔ پس جو لوگ مولانا نظامی کے کلام کو فردوسی کے کلام پر ترجیح دیتے
ہیں۔ یہ اُن کی سُبکی ذہن اور کوتاہ نظری کا مقتضا ہے۔ ہاں مولینا نظامی
موٹے موٹے الفاظ زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ قوام میں رچے اور
نظم میں ٹھیک ہوتے ہیں جیسے ؎

قیبا مناخیر در پیش کن تو خوشبو ز اندیشہ خویش کن

قیب سے مراد عارف اور صوفی اور مناخیر (ناک کے نتھنے)
پیش کرنے سے مراد پاس انفاس ہے۔ غریب فردوسی کو ایسے مضامین
کی ہوا بھی نہیں لگی۔ ماحصل یہ ہے کہ ... کی امر پیرا و شاعری فردوسی
کے کلام ... اور عقلی ... الفاظ و معانی نظامی اور خاقانی

کے نظر آتا ہے۔ مگر خاقانی بھی مسلک میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔ عرفی
کا کلام صاف و شگفتہ ہے۔ تاہم کہیں کہیں وہ بھی قصائد میں علوم و فنون کے
مسئلے داخل کرتا ہے۔ مثلاً اپنی تعلّی میں لکھتا ہے ؎

ای بانی پیرہ جزء ابا بکلام خندد جوہر فرد است دلیل تقسیم

متکلمین اور فلاسفہ میں بڑی طول طویل بحث ہو اور اس پر مبسوط کتابیں
لکھی گئی ہیں۔ ملا نصیر الدین طوسی کی مشہور و مبسوط کتاب اشارات میں
اجسام پر بڑی زبردست بحث ہے۔ یہ ہمیشہ عربی مدارس میں انتہا کی کتاب ہو۔
مولینا عبد الحق صاحب خیرآبادی اور مولینا مفتی لطف اللہ صاحب
علی گڈھی مرحومین کے بعد اب اس کتاب کا کوئی پڑھانے والا ہندوستان
میں نظر نہیں آتا۔ ہم کبھی اس پر بحث کرینگے۔ بشرطیکہ پیارے مخزن کے
ناظرین کو دلچسپی ہو۔

متکلمین کہتے ہیں کہ اجسام اجزائے لایتجزیٰ سے مرکب ہیں اور فلاسفہ
کہتے ہیں کہ صورت ہیولیٰ سے۔ چونکہ اس سے صورت اور مادے کا قدیم
ہونا لازم آتا ہے۔ جس کے آریہ بھی قائل ہیں اور قدیم بجز ذات خدا کے
کوئی نہیں لہٰذا علمائے متکلمین اسکو رد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اجسام ایسے
چھوٹے چھوٹے اجزا سے مرکب ہیں۔ جنکا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

عُرفی کے شعر میں جوہر فرد کے وجود کا ردّ ہے۔ گویا وُہ فلسفی بنا ہی
اور جوہر فرد جزء لایتجزیٰ ہی۔ یعنی وُہ شے جس کا تجزیہ اور تقسیم نہ ہو سکے۔
جیسے نقطہ یعنی طرف خط۔ جو ریاضی کی اشکال میں ہوتا ہے اور تجزیہ اور تقسیم
قبول نہیں کر سکتا۔ نہ ہم اس کو اشارہ وغیرہ سے بتا سکتے ہیں نہ محسوس

کرا سکتے ہیں ورنہ یہ بسیط (غیر منقسم) نہ رہیگا بلکہ منقسم ہو جائیگا - پس عرفی کہتا ہے کہ اگر میں کھلتی کے طور پر بھی اہل کلام کو جوہر فرد کی تردید میں الزام دینے لگوں تو متکلمین کے دعوے پر خود جوہر فرد ہنس پڑے اور چونکہ ہنسنے میں لب کھل جاتے ہیں - پس لبوں کا کھلنا ہی جوہر فرد کی تقسیم کی دلیل ہو جاتے وہو المطلوب -

ایک اور مدحیہ قصیدہ کے قطعہ میں منطق کی اصطلاحات ! رکھتا ہے ؎

اگر بقصر جلالش روند پایہ شمار　　کز نیم پایہ بود زاں شمار سبع شداد
عجب مداں کہ قدم سودہ بار بسگلند　　ہم از بدایت سلّم نہایت اعداد

شرح :- اگر ممدوح کے قصر جلال کی سیڑھیاں گننے کو لوگ چڑھتے ہوئے چلے جائیں جس کی آدھی سیڑھی کے برابر سات آسمانوں کی سیڑھیوں کا شمار ہے تو عجب نہیں کہ سیڑھیاں گننے والوں کے پاؤں گھس جائیں اور انکو واپس ہونا پڑے اور سیڑھیوں کے شروع ہی میں مراتب اعداد کا خاتمہ ہو جائے یعنی گننے کے لئے کوئی عدد نہ رہے - حالانکہ اعداد کی کوئی انتہا نہیں جہاں تک چاہو گنتے چلے جاؤ - اس میں ایک نکتہ یہ ہے کہ مولانا محب اللہ بہاری کی کتاب سلّم میں وجود لا تناہی کو برہان سلّمی سے باطل کیا ہے - اس ایک شعر میں کتنے مناسبات اور پہلو ہیں جنکو علماء و فضلا ہی سمجھ سکتے ہیں -

موازنہ و تنقید خاقانی اور عرفی کے کلام پر تھا - تفنن نے قلم کا رُخ دوسری جانب پھیر دیا -

عرفی نے خاقانی کے بعض قوافی پر طبع آزمائی کی ہے گل پر نہیں - چونکہ خاقانی کا یہ نعتیہ قصیدہ کورس منشی فاضل میں داخل ہے - اور ہمارا ہر دلعزیز مخزن اسکالروں اور پروفیسروں کی نظر سے گذرتا ہے - لہذا خاقانی

محبّت کا ایک پہلو

یہ ایک خیال ہے۔ مگر ایسا خیال کہ خواب و خورش خیال کر دیتا ہے۔ دل میں ایک بیقراری پیدا ہوتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ تھم جھکے بعد یہ خود بخود دُور ہو جائے گی۔ مگر نہیں۔ یہ بیقراری جان لینے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہی خیال پہلے ایک خیالِ اُلفت ہوتا ہے۔ پھر محبّت کا درجہ آتا ہے اور آخر میں شررِ عشق کا شعلہ بھڑکنے لگتا ہے۔ وُہ بیقراری جس کی ہستی دماغ چند شانوں تک محدود سمجھی جاتی ہے۔ ایسی بیقراری ہے کہ اسکے آنے کے ساتھ ہی دل و دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ دل میں ایک درد اُٹھتا ہے۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سر چکرانے لگتا ہے۔ اور آخر انسان مجنوں وار گر پڑتا ہے مگر یہ بیقراری یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ؎

لحد میں آتے ہی مجنوں نے پوچھا!
بتا منکر! مری لیلےٰ کہاں ہے!

ہائے محبّت! تو وہ مرض ہے۔ جس کا کوئی علاج نہیں۔ تو وُہ سانپ ہے اور سانپ بھی زہریلا۔ جس کے کاٹے کا کوئی منتر نہیں۔ تیری جھنک سمندر کی لہر ہے۔ جو کئی کارواں کا رختِ ہستی بہالے جاتی ہے۔ تو وُہ آتشکدہ ہے جس کے آگے آتشکدہ مجوس بھی سرد ہے۔ تو وُہ دریائے ذخّار ہے جس کی رو کے سامنے کسی شے کو قیام نہیں۔ تو وُہ ڈراونی بھیانک شکل ہے جس سے بڑھ کر کوئی ہیبت ناک صورت نہیں۔ تجھ سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی جادو نہیں

بہ شیشۂ دل پر ذرا سی ٹھیس لگا کر چکنا چور کرنا بھی تیرا ہی کام ہے۔ میں تیری کیا تعریف کر سکتا ہوں۔ جبکہ مجنوں۔ وامق۔ فرہاد و یعقوبؑ کے ایسے اشخاص تیرے مداح ہیں ؎

درد خاک بسر چاک گریباں کر کے
جان لیتی ہے مگر بے سر و ساماں کر کے

شیخ محمد عبد المجید آحمد بی۔اے (ہوشیارپور)

قطعہ

روزہا باید کہ تا یک مشتِ پشم از پشتِ میش
زاہدے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

ہفتہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل
شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن

ماہہا باید کہ تا یک نطفہ از پشت و رحم
صفدرے خیزد بمیداں یا عروسِ انجمن

سالہا باید کہ تا یک سنگِ قابل ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق در یمن

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از فیضِ طبع
عالمے دانا شود یا شاعرِ شیریں سخن

عمرہا باید کہ تا گردونِ گرداں یک شبے
عاشقے را وصل بخشد یا غریبے را وطن

دورہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا اُویس اندر قرن

یا برو ہمچو زناں نیرنگ بازی پیشہ کن
یا بیا ہمچو سنائی گوئے در میدان بزن

دردِ محبت

[illegible] محبت نے جو ہو کے لئے

[illegible] انقلاب [illegible]

اے دردِ محبت تو کیا [illegible] نہیں تو عجیب ہے۔ آہ! کوئی میرے دل سے پوچھے کہ تو کس قدر پیارا ہے۔ ہائے کسی کا دردِ محبت [illegible] کہ جس قدر بڑھ سکے بڑھتا جا۔ آہ! بڑھ بڑھ [illegible] مگر کیا تو میرے ہی دل میں رہیگا! ہائے کیا مجھ ہی کو بیتاب کرتا رہیگا! مجھ ہی پر اثر ڈالتا رہیگا اور ہائے! کیا تجھ سے یہ نہ ہوگا کہ کسی دوسرے کے پیارے دل میں بھی ذرا سی چسک پیدا کرے! درد نہ سہی۔ ایک دفعہ ٹیس ہی ہو جایا کرے۔ آہ! اگر تو تمام دن اور رات کے ہر منٹ میں میرے دل میں ایک ہوک، ایک افسوس پیدا کرتا رہتا ہے تو کیا دوسری طرف دن میں کیا ہفتہ میں بھی کبھی ایک ہی دفعہ ایک نازک سی ہلکی پھلکی چٹکی نہیں لے سکتا؟ اُف! کیا تو نے ایک ہی کے دل میں رہنے کی قسم کھائی ہے۔ کہ دوسری طرف رُخ بھی نہیں کرتا۔ ہائے میں نہیں کہتا کہ میرا سا بیقرار و بیتاب کرنیوالا درد دوسرے نازک اور پیارے دل میں ہو۔ مگر آہ! خفیف سا ہو۔ میٹھا میٹھا ہو کبھی کبھی ہو۔ مگر ہو تو سہی! ہائے! کیا یہ نہ ہوگا کہ اس پاش پاش دل کا عکس ہی دوسرے دل میں پڑے۔ آہ! اگر میرے دل میں ایک تیر سا چھدا ہوا اپنی جانگزا خلش دکھا رہا ہے تو اُدھر گلاب کے کانٹے ہی کی خفیف سی

چبھن ہو۔ اُف ! اے دردِ محبت میں نہیں چاہتا اور ہرگز نہیں کہ جیسا گہرا زخم میرے دل میں لگا ہے۔ جیسا تیر کا میرے جگر پر لگا ہے ویسا ہی دوسری طرف بھی ہو۔ مگر اُسے ایک ہی دل کو خون کرنے والے درد۔ اے ایک ہی شخص کو دنیا جہان سے بیکار کر دینے والے درد۔ اے کسی نامراد کو موت کا تمنائی بنا دینے والے درد۔ اے راتوں کی نیند کو اڑا دینے والے درد .... میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اُدھر صرف ایک خفیف سی خراش، ایک چھوٹی سی پھانس کی خلش ہی ہو۔ جس میں کسی وقت میٹھا میٹھا درد ہو جایا کرے۔ تاکہ جس وقت اس دردِ محبت کے بیقرار کا اُس سے سامنا ہو تو کمبخت بے دردی کی بجائے اس میں بھی ایسا ہلکا ہلکا درد ہوا کرے اور اسے بھی کسی کے درد کا احساس ہونے لگے۔ مگر ہائے ! یہ تصور فضول ہے۔ تو نے تو میرے ہی دل کو دیکھ لیا اور تو متعدی نہیں ہے۔ کہ ایک سے اڑ کر دوسرے کو بھی جا لگے۔ اے کاش۔ تو ایک سے اڑ کر دوسرے کو لگ جایا کرتا۔

اُف۔ اے آتشِ شوق کے شعلے ! بس معلوم ہو گیا کہ تم میں میرے ہی جلانے کی طاقت ہے۔ آہ ! تمہاری جانسوز لپٹ سے اتنا نہیں ہوتا کہ دوسرے دل کو جو برف کی طرح سفید اور ٹھنڈا ہے ذرا بھی گرمی پہنچاؤ آہ ! اگر پگھلے نہیں تو کم از کم پسیجے ہی سہی۔ مگر نہیں یہ بھی نہیں۔ بلکہ اُدھر کی جو خنکی ہے وہ بھی تمہاری گرمی کے سبب مجھ تک نہیں پہنچتی۔ آہ تم مجھے ایسے ہی جلاتے اور پھونکتے رہتے مگر اتنا کرتے کہ دوسری طرف ذرا سی گرمی تو پہنچاتے ذرا سینک تو لگتی۔

آہ! ایک طرف تو آگ بھڑک رہی ہے اور دوسری طرف دھیمی دھیمی آنچ بھی نہیں پہنچتی۔

آہ! اے دردِ محبت۔ معلوم ہو گیا کہ تو دوسری طرف کچھ بھی اثر نہیں کر سکتا صرف ایک ہی کو بے چین کرنے کی طاقت تجھ میں ہے۔ مگر ہاں ایک بات یہ تو بتا کہ سوسائٹی میں تجھے کیوں ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور چاہے کتنا ہی پاک و سچا ہو مگر وہ تجھے اوچھا ہی کچھ سمجھتی ہے؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناپاک آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ پاکی اور سچائی اسے دکھائی نہیں دیتی۔

ہاں ہاں اور بڑھ اور بڑھ یہاں تک کہ میرا خاتمہ تجھی سے ہو۔ آہ کسی کی دردِ محبت! خدا شاہد ہے کہ تو مجھے جہان کی سب چیزوں سے پیارا ہے اور خدا اُس کو دوزخ کا کندہ کرے جو کسی وقت بھی یہ چاہتا ہو کہ تجھ میں زیادتی نہ ہو بلکہ کچھ کمی ہو جائے . . . .

ایک دردرسیدہ

تربیتِ اطفال

یہ ایک تقریباً چار جزو ۲۲×۱۶ تقطیع کا مفید رسالہ مولوی محمد تجمل علی اللہ صاحب ایڈیٹر ملت لاہور نے انگریز عالم مسٹر لاک صاحب بہادر کی کتاب سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بچوں کی پیدائش سے لیکر جوانی کی عمر تک ان کی تربیت کے بیحد کارآمد اور موزوں طریقے بتائے گئے ہیں۔ اور یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ فاضل مترجم نے ملک کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ کیونکہ آج کے بچے ہی کل باپ ہونگے۔ اور جیسی تربیت انکو ملی ہوگی اسی پر اپنی اولاد کا اُٹھان اُٹھائینگے۔ بس ملک کی خوشحالی

روزنامچہ نوّاب سربلند جنگ بہادر

(چیف جسٹس حیدر آباد دکن)

نواب سربلند جنگ حاجی مولوی محمد حمید اللہ خاں صاحب اوّل طالب علم مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علیگڈھ کی تعلیم انگلستان کے زمانہ کی ڈائری جس کا ایک حصّہ بابت جنوری ۱۸۸۲ء مخزن کے جون نمبر میں نکل چکا ہے۔ اور اب ہم جناب موصوف کی عنایت سے اس کے دُوسرے حصّہ بابت ماہ فروری ۱۸۸۲ء کا ترجمہ بھی شائع کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس مضمون کے ساتھ بعض اشخاص اور مقامات کے ناموں پر تشریحی نوٹ بھی ہونے سے اس کا لُطف مزید ہوجاتا۔ لیکن یہ امر تنگی وقت کے سبب بعد کے حصص میں ملحوظ رکھنے کے لئے ملتوی کیا جاتا ہے

یکم فروری ۱۸۸۲ء | کننگھم اور شیلی کے لکچروں میں شامل ہوا۔ شیلی کے لکچر میں سیلے سے ملا اور باہر نکلنے کے بعد تک کے مراسلہ کی بابت جو ریویو میں شائع ہوا تھا گفتگو کرتا رہا۔ ٹرنٹی ہال کے طالب علم روکسبرگ کے ساتھ کافی پی۔ کرائسٹ کالج میں جاکر رابرٹ اور خاکی سے ملاقات کی۔ ٹرنٹی کالج کے چند طلبا کے کمروں پر گیا۔ لیکن وہ موجود نہ تھے۔

۲- فروری | حسب معمول لکچروں میں گیا۔ گاؤ شائی ہوم پالیسی کے متعلق مباحثہ تھا۔ اور میں یوں چاہتا تھا۔ لیکن مجھے پروتھروس کے ہاں جانا تھا۔ اس لئے

مین توال وقت آ گیا لیکن چونکہ جلسہ ملتوی ہوگیا ہے اس لئے مجھے آیندہ ہفتہ
بولنے کا موقع ملے گا۔ ٹیزر نے اس پالیسی کے خلاف بہت موثر گفتگو کی۔
پروتھرو کے ہاں گیا۔ وہاں چند ایڈیٹروں سے ملاقات ہوئی۔ شہزادہ اور دیگر
کمبل ہوتے رہے۔ احباب ہیں نے تقریبات۔ ... کیمبرج کا اضافہ کیا۔ سوا گیارہ
بجے واپس آیا اور ٹیزر کے کمرہ میں دو بجے تک بیٹھا رہا۔ جہاں چند دوست
جمع تھے۔

۴۔ فروری | کڈ کے ہمراہ ناشتہ کیا اور تھوڑی دور ٹہلنے نکلا۔ شام کو
وربکر کے مکان پر گیا۔ اور نو بجے اوسکر براؤننگ سے ملا جہاں رئیس سے
ملاقات ہوئی اور انہوں نے میرا تعارف آوسکن چیمبرلین سے کرایا۔

۵۔ فروری | حسب معمول لیکچروں میں شریک ہوا۔ یونین میں گیا۔ جہاں مباحثہ
ہنڈمین نے شروع کیا۔ اور فروسٹ نے اس کی مخالفت کی۔ مکان میں تل رکھنے
کی جگہ نہ تھی۔ ہنڈمین کی کل اسپیچ میں مجھے کھڑا رہنا پڑا۔ لیکچر بہت عمدہ تھے
کرائسٹ کالج کے فیلوز نے ... نے مباحثہ کو ملتوی کر دیا۔ اس لئے کسی
دوسری شب یہی مباحثہ پھر ہوگا۔ امید ہے کہ ہمیں دوبارہ شامل ہونگا۔ موریسن
نے جو اسپیچ دی وہ بہت دلچسپ نہ تھی۔ اور نہ بہت فصیح و بلیغ تھی۔

۶۔ فروری | شام کو ہربن جی سے ملنے گیا۔ اور وہاں مسز بال اور اسکی دو لڑکیوں
سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر پروتھرو کے مکان پر گیا۔ آج شام کو ڈیلے نے
مجھ سے ذکر کیا کہ حیال کالج کا طالب علم ایسٹرلے بیمار ہے۔ اور اس لئے میں اس
کی مزاج پرسی کے لئے گیا۔ تعلیم کے بعد گرنیس کے ہمراہ کافی پی اور آٹھ بجے
ٹرینٹی کالج میں مارسین سے ملا۔

عبد اللہ

۸۔ فروری | گھر خط لکھے۔ ٹیچوک کے سوالات کے جواب لکھے اور حسب معمول لکچروں میں شامل ہوا۔ اوراتی کے ہمراہ کافی پی اور پھر عجیب سر کالج میں وال سے ملنے گیا۔ دس بجے واپس آکر کچھ پڑھا۔

بوس نے مجھ سے کہا کہ میں کہیں جارہا ہوں اور اس لئے مجلس کا جلسہ میرے کمرہ میں نہیں ہو سکتا۔ اچھا میں اپنے کمرہ میں اس روز جلسہ منعقد کروں گا۔

۹۔ فروری | حسب معمول لکچروں میں شریک ہوا۔ شام کو باوجودیکہ زمین نرم تھی ہم ٹینس کھیلے۔ سات سے پونے نو تک کالج میں مباحثہ ہوتا رہا۔ بعد ازاں نیچرل سائنس کلب میں گیا۔ جہاں آوانی نے میرا نام پیش کیا۔ یہاں پانی کے اجزا پر مضمون پڑھا گیا۔

ہربن تی کے کمرہ میں جا کر تھوڑی دیر قیام کیا۔ گیارہ سے پہلے کالج میں آیا اور پون بجے تک کام کرتا رہا۔ اب آرام کرتا ہوں۔

۱۰۔ فروری | کارٹسل کے ہمراہ ناشتہ کیا۔ مسٹر کاکس کے پاس گیا اور انکو چہارشنبہ کے دن لنچ کی دعوت دی۔ پونے آٹھ بجے مجلس کا اجلاس میرے کمرہ میں ہوا۔

۱۱۔ فروری | حسب معمول لکچروں میں گیا۔ شام کو پانچ بجے مسٹر جی کی کے پاس اپنا پرچہ دکھانے گیا۔

۱۲۔ فروری | یونین میں گیا۔ ملتوی شدہ مباحثہ ڈائنسز نے شروع کیا۔ اسکے بعد بہت عمدہ بحث ہوتی رہی۔ بعض پرانے ممبروں نے بھی لکچر دیئے۔ صرف ۵۰ ووٹ اس کے موافق اور ۲۹۹ مخالف ہوئے۔ آج سہ پہر کو والنٹیرز سات میل تک گئے۔ ہمارے ہمراہ بینڈ بھی تھا۔ میں فوج کے میدان میں تت پر

پہنچا تھا۔ اس لئے والنٹیرز کو کنگ بھیجنے کے لئے سٹرک میڈنگلی پر تھوڑی دُور
تک مجھے بھاگنا پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں فوج کے ساتھ گیا ہوں۔ مجھے آج کی
مسافت بہت اچھی معلوم ہوئی۔ اگرچہ شام کو نہایت تھک کر چور ہو گیا تھا۔

۱۳۔ فروری | آشلی کے لکچر میں گیا۔ چند احباب میرے کمرہ میں لنچ کھانے آئے
یونین تک وال کے ہمراہ نہایت چہل قدمی کرتا ہوا گیا۔

۱۵۔ فروری | ہندوستان خطوط روانہ کئے۔ حسب معمول لکچروں میں شامل ہوا
پونے آٹھ بجے چیمبرلین کے ہمراہ کافی پی۔ بعد ازاں ہارسین کے پاس گیا۔
اور انہیں آئندہ چہارشنبہ کو کافی کی دعوت دی۔

آج سہ پہر کو قواعد کرنے گیا۔ فوج کے قواعد میں یہ میری پہلی قواعد ہے

۱۶۔ فروری | حسب معمول لکچروں میں شریک ہوا۔ وال کے ہمراہ لنچ کھایا
تعلیم کے بعد مباحثہ میں گیا۔ عورتوں کے حقوق پر بحث تھی۔ میں اس کی موافقت
میں بولا۔ مارل کلب سائنس میں شامل ہوا۔ کیس کالج کے طالب علم آدم نے
خیالاتِ افلاطون پر مضمون پڑھا۔ جو بہت دلچسپ تھا۔

۱۷۔ فروری | مسز کاکس کے ہاں گیا۔ تعلیم کے بعد چند دوست چار پینے
میرے پاس آئے۔ او۔ آر کے مکان پر نو بجے گیا اور دس بجے واپس آیا
اور آدھ گھنٹہ شیلی اور ادانی کے پاس بیٹھا رہا۔

۱۸۔ فروری | لکچروں میں شامل ہوا۔ بعد ازاں گورلک ناتھ کے ساتھ ٹہلنے
گیا۔ تعلیم کے بعد چند دوستوں کو کافی پینے بلایا۔ ڈیبیٹنگ سوسائٹی کی
آج کمیٹی میٹنگ تھی۔ ہفتہ گزشتہ میں وال صدر نشین اپنے قواعد بنانے
میں ایک قاعدہ کا ذکر کرنا بھول گیا تھا۔ اور اسے ڈر تھا کہ لوگ اس کا تمسخر

اُڑا دینگے ۔ آج ذکر ہُوا کہ صدر نشین اور سکرٹری وغیرہ آئندہ ہفتہ غیر حاضر رہیں
میں نے کہا کہ آج کا کام شروع ہونے سے پہلے وال وغیرہ بیان تحریری
داخل کریں کہ وُہ قواعد مذکورہ کا ذکر کرنا بُھول گئے ۔ اُمید ہے کہ میری رائے
منظور ہوگی ۔

۱۹۔ فروری | مِس جونک کے لکچر میں شریک ہُوا ۔ سہ پہر کو قواعد میں شامل ہُوا ۔
سینٹ جان کالج میں سمتھ کے ہمراہ کھانا کھایا ۔ تھوڑی دیر کے لئے یونین گیا
گیا ۔ نارتھ ہمپٹن کی جانب سے بریڈلا ممبر منتخب ہُوا ۔ اور بہت سے آدمیوں
نے اس کے موافق رائے دی ہے ۔

اوامی نے مجھ سے آکر کہا کہ کل آٹھ بجے میرے ہمراہ ناشتہ کرنا ۔ میں اس
نوکر کے نام جو میرا بستر درست کرتا ہے ایک پرچہ لکھدونگا کہ مجھے پونے آٹھ
بجے بیدار کردے ۔

۲۰۔ فروری | شیلی کے لکچر میں شریک ہُوا ۔ والد کا خط آیا ۔ مکان پر سب
بخیریت ہیں ۔ سہ پہر کو ٹینس کھیلا ۔

اوامی کے ہمراہ ناشتہ کیا ۔ سوجی موٹری (جاپانی) اس کے ہاں تھا اور اس
نے کل کے لئے مجھے لنچ کی دعوت دی ۔ آج شام کو چند اشخاص میرے ہمراہ
کافی پینے آئے ۔

۲۱۔ فروری | حسب معمول لکچروں میں گیا ۔ سوجی موٹری کے ہمراہ لنچ کھایا ۔
اور جاپان وغیرہ کی بابت ذکر ہوتا رہا ۔ یونین گیا ۔ اور مذاقیہ تصاویر دار
اخبار پڑھتا رہا ۔ قانونی امتحان کے پرچے پڑھنے کتب خانہ و آفس میں گیا ۔ لیکن
دیر ہوگئی تھی ۔ اس لئے کتب خانہ بند ہوگیا تھا ۔ چند لوگوں کو کافی پینے بلایا ۔

جنسِ لطیف کی بیقدری

ذیل کا مضمون اس نفیس کتاب کے ایک اور باب کا ترجمہ ہے جس کا ایک باب ستمبر کے مخزن میں "جنسِ لطیف کی موجودہ حالت" کے عنوان سے نذرِ ناظرین ہو چکا ہے۔ اور اُمید ہو کہ یہ حصہ خاص دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

معزز بیبیو!

میری آج کی تقریر اس تو ہم پرستی پر ہوگی جو تمام دنیا میں جنسِ لطیف کی بیقدری کے متعلق پھیلا ہوا ہے۔ عورت کی قدر کم ہونے کی تاریخ درحقیقت اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جبکہ یہ جنسِ لطیف وجود میں آئی۔ اور طبعی طور پر اپنے ہمجنس (مرد) سے کمزور ثابت ہوئی۔ مگر ہمیں اس بات کا سوچنا ضروری ہو کہ آیا جنسِ بشری کے اس ضعف کو اس کی خلقی کمزوری کے سبب حقیر و کم مرتبہ شمار کرنا درست، اور اس سے ہمسر کا سا برتاؤ کرنا ناجائز ہے؟ یا ایسا کرنا مرد کی ہٹ دھرمی اور ناحق پژوہی ہو؟ اگر ہم غور کی نظر سے دیکھیں تو عورت نصف جنسِ بشری ہونے کے علاوہ نوعِ انسانی کے فرائض او اعمال میں بھی برابر آدھے کی شریک، اور بقائے نوع کی کفیل۔ بلکہ اس کی موجب ہے۔ اس لئے ہمیں اس سوال کا حل کرنا اور اس کے حسبِ منزلت اس کی چھان بین میں حصہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

"مرد کہتے ہیں کہ عورت صرف ایک کارآمد ظرف یا سامان ہو۔ اس کی

بعض کا مطلب یہی ہے کہ مرد اسے کام میں لاتے۔ اور جب چاہے یا ناپسند ہے تو اس کو بدل سکے۔ یعنی ایک کی جگہ دوسری عورت سے تعلق کر لے ان کے اعتبار سے عورت ایک نہایت بے قدر جنس اور حقیر شے ہوتی ہے۔ عورت کے مرتبے کے متعلق یہ خیال ایسا چھایا اور پھیلا کہ اس نے جنس لطیف کو بالکل مرد کی نظر سے گرا دیا۔ اور بہت سی دنیا کی مصیبتیں اور آفتیں اس کے ذریعہ سے وجود میں آئیں۔ عورت مجبور ہوئی کہ اپنی قدر کرانے اور مرد کے دل پر قابو پانے کے واسطے ذاتی اور صفاتی کے علاوہ بہت کچھ بناوٹ اور آرائش سے کام لے۔ تاکہ اسی ذریعہ سے مرد کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ جو اس کی قدر و منزلت میں کمی۔ اور اس کے حق میں کھوٹ کپٹ کرنے کے سوا اس کو ناقص اور ناکارہ بھی بتاتا رہتا ہے۔ حالانکہ اگر مرد عورت کے حال پر کامل توجہ کرتا اور اس کی قدر و منزلت پہچانتا تو اس بات سے دنیا کی بہت سی برائیوں کا دفعیہ اور اہل دنیا کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن افسوس! بدقسمتی سے مرد کو اپنی برتری کا خیال اسے عورت اور اپنے ہمسر کے حقوق پامال کرنے کا محرک ہوا اور اس نے اس بارہ میں کیا جو کچھ کہ کیا۔

آسمانی ادیان نے بعض جزئی اور معمولی امور کے سوا عورت کو بالکل مرد کا ہمسر اور برابر بنا دیا ہے۔ اور دین اسلام نے تو عورت کے حقوق کو اس فیاضی سے قائم کیا ہے کہ اس کی نظیر کسی اور دین میں مشکل ملیگی۔ اس دین کے ہادی نے عورت سے نیک برتاؤ کرنے کی زور سے ہدایت فرمائی ہے۔ مگر نادانی اور وحشت کے زمانہ کی رسموں اور پرانی عادتوں کا زور شرعی احکام اور ہادی کی ہدایتوں پر غالب ہی رہا۔ اس نے زبردست کو زیردست آزاری سے باز نہ

کسنے دیا۔ اور اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ آخرکار دونوں فریق کمزور اور مبتلائے آلام ہو گئے۔

آسمانی دین کی تعلیم اور اُس کے ہادی کی بتائی ہوئی راہ یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں برابر اور ہمسر ہیں۔ یہ تعلیم خالی از مغز نہیں۔ اس میں نہایت اعلیٰ حکمت مضمر اور کوئی بجد شریف غرض اس کے اندر مستتر ہے۔ اور وُہ حکمت ایسی ہو کہ سوسائٹی کی حالت درست ہو سکتی ہے تو اسی سے اور نوع بشری کو فائدہ کثیر پہنچ سکتا ہے تو محض اُس کے وسیلہ سے۔ اس لئے صرف جوہر پر عمل کرنا اور شریعت کی اصلی غرض کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مردوں کی تربیت کی طرح عورتوں کی تربیت کا مدار بھی اسی بات پر رکھا جائے۔ کہ اُن کی بہترین دماغی اور عقلی قوتوں اور اخلاقی احساسات کو قوی بنایا جائے۔ اور جنس لطیف کو ہر حیثیت سے لطف و محبت، رحم، مروّت، تواضع اور خلق کا پتلا بنانے کی کوشش ہو۔ تاکہ وُہ طاقتور جنس (مرد) کے ساتھ مغلوب و محکوم کی طرح زندگی بسر نہ کرے۔ بلکہ اسی طرح کی زندگی گذارے جیسے ایک اپنے فرائض کا خیال رکھنے والا اور اپنی نازک ذمہ داریوں کو بخوبی سمجھنے والا شخص سوچ سمجھ کر فائدہ بخش کام کرتا۔ اور اپنی زندگی سے خود بھی نفع اٹھاتا اور دوسروں کو بھی راحت و آرام پہنچاتا ہے۔ یہ صورت نوع بشری کی خوشحالی بڑھانے، اور سوسائٹی کے زبردست کارکن ہاتھ کو قوت دینے میں اپنی سحر نما تاثیر دکھائیگی۔ اور جس مجتمع میں ایسی حالت پیدا ہو جائے۔ اس کو سعید ترین انسانی گروہ بنا دیگی اگرچہ سوسائٹی میں جنس لطیف کی بے وقری کا خیال میراث قدیم کے طور پر

[illegible] ممکن ہے - نہایت برا و نقصان دینے والا خیال ہے - اس خیال کا
[illegible] عورت [illegible] اور حیلہ سازی سے کام لینی،
[illegible] زیب و زینت کے [illegible] سے مرد کا دل اپنے ظاہری حسن
[illegible] کے واسطے کرتی ہے
[illegible] خود عورت کا کوئی حق نہیں - جب تک کہ مردوں ہی کا حق
ہے - [illegible] ہوسکتا ہے :-

عورتوں کی [illegible] مردوں کے فوائد کا لحاظ اور قصد کرنا
ضروری ہو - تاکہ وہ مردوں کے دل اپنی طرف کھینچ سکیں - انہیں فائدہ پہنچائیں
اُن پیاری ہوں اور اُن کی نظروں میں عزت پائیں - اور ان ذرائع سے
بچپن میں مردوں کی تربیت اور جوانی میں اُن کی خدمت اور دلداری اور
پیری میں اُن کی خیرخواہی اور خبرگیری کرتی ہیں اور عورتوں کی تربیت
ایسی ہو کہ وہ مردوں کی زندگی کو آراستہ اور لطیف بنا سکیں - ہر وقت
اور زمانہ میں اور ہر جگہ اور مقام میں عورتوں کے فرائض صرف یہی ہیں جیسا کہ
بیان ہوا اور انہیں کی اُن کو بچپن سے تعلیم دینا واجب ہے - میری
رائے میں تو اس نامور [illegible] فیلسوف کا خیال بالکل ٹھیک ہے - مگر اس نے
ایک غلطی کی - اور اس کی غلطی یہ ہے کہ عورتوں کے خاص حقوق کو نظرانداز
کر گیا - حالانکہ عورت بذاتِ خاص بھی چند حقوق رکھتی ہے - اور اُسے جو کام
کرنا ہے وُہ اپنی ذات اور مرد دونوں کے واسطے کرنا ہے - جیسے کہ مرد
خود اپنے واسطے اور اپنی شریک زندگی - یا بہترین نصف (عورت)
کے لیے کشمکش حیات کے جھمیلے میں پڑتا ہے - کیونکہ اگر عمل کا حصہ صرف

ایک ہی فریق کو دیدیا جائے تو دوسرا بیکار محض ہوگا اور میزانِ عدل کے دونوں پلّے برابر نہ رہنے سے مرد کا پلّہ عورت پر غالب آجائیگا۔ اس لئے کہ کارکُن جنس وہی ٹھہر گیا اور اپنی قوت و شوکت سے عورت کو مغلوب بنائیگا۔

عورت کے بھی نفس اور جان ہے وہ بھی کچھ حقوق رکھتی ہے۔ مگر مرد نے ہمیشہ دنیا میں یہی سمجھا ہے کہ عورت کی خلقت صرف اس کے [illegible] رہنے اور اُس کی خدمتگذاری کی غرض سے ہوئی ہے۔ یہ کبھی حضرت کی فہم شریف میں نہیں آیا کہ آپ کی آفرینش بھی درحقیقت عورت کی خدمت کرنے اور اس کی راحتِ زندگی کا سامان بہم پہنچانے کے لئے ہوئی ہے تاکہ آپ عورت کی بے قدری سے باز رہتے اور اس کے حقوق کو پامال کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ پس اگر مرد اس بات کو ماننے لگے تو عورت کی بہت سی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے۔ اور وہ ان بیہودہ بناؤ سنگار کے دھندوں سے مستغنی بن جائے جو آج اُسے محض مرد کے دل پر قابو حاصل کرنے اور اُسے اپنی طرف مائل بنانے کے واسطے کرنے پڑتے ہیں۔ اور ہم عورتوں کو اس سے یہ فائدہ پہنچیگا کہ اپنی عزت و منزلت کو بے خطر پاکر مطمئن ہو جائیں اور اپنے کام کو بہترین طریقہ سے بجا لائیں۔ اور طرفین کو طمانیت خاطر ہاتھ آنے کا نتیجہ سوسائٹی اور نسل کے حال کی خوبی نظر آنے لگیگا۔ ایک کے دوسرے پر ظلم و زبردستی کرنے یا عورت کی بے وقری اور ذلت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ وہ عورت جو نوعِ انسانی اور جنسِ بشری کا نصف اور بہترین نصف ہے۔ اور جنس بشری کو خدا نے دیگر مخلوقات پر جو عزت و شرف عطا کیا ہے وہ محض اُس کے اخلاقی اوصاف کی وجہ سے ہے نہ کہ بہیمی جذبات کی بنا پر

... پردے اور نقاب کے بارہ میں شور و غوغا کیوں مچتا ہے؟ کوئی کہتا ہے کہ پردہ ... نہ ہو۔ یا ہو تو ہلکا سا اور صرف دل اور آنکھ کا۔ اور کسی ... نہیں ... کی تخت حاجت ہے۔ اور اس کو سخت ... بیان ... آخر اس پردے کی علت کیا ہے؟ یہی خوف ... ہاتھ لگنے کا اندیشہ ہے۔ ناحق کرش اشخاص ... ان کی ... دست اندازی کریں گے۔ اور نام و ننگ کا شیشہ ننگ جفا سے چور چور ہو جائیگا! میں کہتی ہوں کہ یہ تمام اندیشے اور خطرات محض ایک بات سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ مرد عورت کے حقوق پہچان کر ان کا محافظ بنے، اس کی وہی قدر کرے جو ایک برابر والا اپنے برابر والے کی قدر کرتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہمسر اور ہم رتبہ کی بے وقری کر کے اسے ذلیل بنا دے۔ اور اس کی جان پر خواہ مخواہ ظلم کیا کرے عورت کو فتنہ یا باعث فتنہ تصور کرنا مرد کی بے انصافی اور بیجا غلطی ہے۔ فتنہ تو مرد کے دل میں بستا ہے جس نے بے وجہ عورت کے حقوق پامال کئے۔ اور اس کو حقارت کے ساتھ نظر سے گرا دیا۔

بہنو! میں اپنی نازک جنس کی داستان غم سنا چکی۔ اور بہت کچھ اپنی مصیبت کا دکھڑا رو لیا۔ اب آپ خوش ہوں کہ خدا کی مہربانی سے ہمیں وہ زمانہ ملا ہے جبکہ ہم اپنے نوعی حقوق حاصل کرنے میں آزاد ہیں۔ اور اب مرد کے جور بیجا سے ہم کو رہائی مل سکتی ہے۔ آزادی کا دور ہے اور سب اپنے اپنے حقوق مانگتے اور پاتے جاتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے حقوق نہ لیں؟ ہمیں اس کی مطلق کوشش نہ کرنا چاہئے

کہ مردوں کے خاص حقوق پر دست انداز ہوں۔ اور اُن کے پرانے
جور و ستم کا انتقام لینے کے درپئے نہیں۔ یہ صورت تو پھر اُسی خرابی کو
بڑھائیگی جو آجتک موجود رہی اور ہے۔ بس ہمیں خاص اپنے حقوق کی
حفاظت کرنی چاہئیے، اور مردوں کو بتا دینا چاہئیے کہ عورت بھی دُنیا
میں کوئی وجود اور قدر و قیمت رکھتی ہے، اُس کے بھی جان ہے اور جسم
اور جسم میں دِل ہے اور دل میں آرزو اور اُمید۔ وُہ اپنے حقوق کو ضائع
نہیں کرسکتی۔ لیکن ہم کو اِس بارہ میں جنگ و جدل سے کام لینے کا خیال
نہ آئے۔ ہم مردوں کو اس طریقہ سے مغلوب کریں کہ وُہ اپنے مغلوب ہونے
کو ذلت نہ سمجھیں بلکہ اپنی سچی عزت شمار کریں۔ اور اس کا وسیلہ یہی
ہم باہمی اتحاد اور اعانت سے اپنی اوہام پرستی اور نمائش پر فریفتگی
کو دُور کریں۔ اپنی عقلی، دماغی، اخلاقی، اور پاکیزہ قوتوں کو ترقی
دیں۔ علم و ادب، اور دین میں پختہ ہو کر مرد کی انانیت توڑ دیں۔
اور اُسے بتا دیں کہ عورت اس کی لونڈی نہیں۔ بلکہ ہمسر اور شریک
زندگی ہے۔ وُہ سایۂ مسرت کی صدا اور شعرِ حیات کا نغمہ ہے۔ اور
ہماری اس اصلاح سے خاندانوں اور گھرانوں کے حال کی وُہ اصلاح
ہوگی کہ باید و شاید؟"

محمد تسلیم انصاری۔ ردولوی

سفر

یہ مضمون اپنے موضوع پر بہت دلچسپ ۔ غور سے لکھا گیا ہے ۔ اور اس کا
طرز مضمون نگاری دوسروں کے لیے ایک نمونہ ہو سکتا ہے ۔

تحصیل علم کے دو طریقے ہیں ۔ ایک اصولی ۔ دوسرا عملی جو علم کتب سے حاصل
ہوتا ہے ۔ اس کو اصولی اور جو مشاہدے کے ذریعہ سے سیکھا جاتا ہے ۔ اس کو
عملی کہتے ہیں ۔ اصولی کا مدعا دوسرے شخصوں کے خیالات یا ان کے
مشاہدے یا تجربے پر مبنی ہوتا ہے ۔ بخلاف اس کے ذاتی مشاہدے اور
شخصی تجربے کا نام عملی طریقہ ہے ۔ صورت اول میں ہم دوسروں کی مدد
کے محتاج اور دست نگر ہیں ۔ اور شکل دوم میں ہم خود مختار اور آزاد یا یوں
کہیئے کہ ایک حالت میں ہماری رفتار کا انحصار بمصداق شعر

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

بیرونی حرکت پر ہے اور دوسری صورت میں ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب
انداختیم پر کاربند ہونا پڑتا ہے ۔ پس ظاہر ہے کہ عملی طریقہ کا نقش نقش
کالحجر کا حکم رکھتا ہے اور صحیح نتائج کے پیدا کرنے میں بہت معاون ہوتا ہے
اس میں شک نہیں کہ انسانی زندگی دقتوں کی گتھی اور پیچیدگیوں
کا مجموعہ ہے کبھی انسان کو مصیبت و تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔
کبھی رنج و غم کا ۔ اور کبھی غربت اور نکبت کا ۔ اور چونکہ مجموعی شکل میں

وہ رکاوٹیں ہیں جو انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ عملی طریقے کو خیرباد کہے۔ اور اصولی قاعدے سے اپنے علم کی پیاس کو فرد کرے۔ اور کتب اور صرف کتب ہی پر قناعت کرے۔ لیکن وہ مبارک شخص جو ان بلاؤں سے بری ہے یا بہلہ میں ایک جوشیلا اور پُر امنگ دل رکھتا ہے کسی طرح محض مطالعہ کتب سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اس کا جدت پسند دماغ اور اس کا محقق دل اس کو کبھی اجازت نہ دینگے کہ وہ مدرسہ کے گوشہ یا کتب خانے کی چار دیواری میں محدود رہے۔ شیخ سعدی۔ ابن بطوطہ اور سیّد کی سوانح عمریاں ہمارے اس دعوی کے مدلل ثبوت ہیں۔

طریقہ عملی کی اس قدر وضاحت اور تعریف سے میرا یہ منشا نہیں کہ صرف سفر ہی تحصیل علم کا معقول ذریعہ ہے بلکہ مطالعہ کتب و اخبار بینی وغیرہ بھی اکتساب علم کے خاص ذرائع ہیں اور اس کے حاصل کرنے میں ایک معتد بہ مدد دیتے ہیں۔ میں اس مضمون میں سفر کے متعلق رائے کا اظہار کرونگا۔ اور انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ کسی موقعہ پر مطالعہ کتب پر بحث کیجاویگی

سفر لغوی رو سے صرف شہر سے باہر جانے پر دلالت کرتا ہے لیکن اصطلاحی معنی کے لحاظ سے بہت وسیع لفظ ہے۔ ہر ایک عجیب و غریب شے کو بہ نظر تحقیق مشاہدہ کرنے کے علاوہ غیر ممالک کو دریافت کرنا۔ نئے نئے تجارب سے مستفید ہونا۔ دنیا کی نشیب و فراز سے واقفیت پیدا کرنا سفر کے معنی آخری میں داخل ہیں۔ وہ قومیں جنہوں نے سفر کے مفہوم کو بخوبی سمجھ لیا ہے اور اپنے زندگی کے مدعا میں دنیا کا سفر کرنا بھی داخل کر لیا ہے۔

آج ترقی کے فلک الافلاک پر صدر نشین نظر آتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم ہندوستانیوں
میں جہاں بدقسمتی سے اور بھی کئی عیوب موجود ہیں۔ وہاں یہ عیب بھی عموماً پایا
جاتا ہے کہ ہم کو سفر کرنا نہیں آتا۔ حالتِ سفر میں باوجود دونوں آنکھیں کھلی
کے اندھے اور باوجود صحیح دماغ کے پگلے بن جاتے ہیں۔ بجائے اس کے
کہ سفر ہماری معلومات میں اضافہ کرے اور اس طرح ہماری رُوح کو فرحت بخشے
ہمارے لئے وہ رنج کا ایک مخزن بن جاتا ہے۔ اور ہماری کوشش یہ ہوتی ہے
کہ جس طرح جلد ممکن ہو۔ ہم ان مصیبتوں سے سبکدوش ہو جائیں۔ علاوہ
ازیں ہندوستان کی یہ پرانی مثل کہ گھر کی آدھی باہر کی پوری سے اچھی ہے
ہندوستانیوں کی رائے کا اظہار جو وہ سفر کی نسبت رکھتے تھے۔ صاف
الفاظ میں کر رہی ہے کہ وہ سفر اور تفریح بہت کم فرض جانتے تھے۔ برخلاف
اس کے اہل فرنگستان و اہل امریکہ کو ملاحظہ فرمائیے اور اُن کے حالات کو
پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ سفر اُنکی زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ وہ سفر میں
حیاتِ ابدی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ و امریکہ علم کے
معدن۔ تہذیب کے مخزن اور اخلاق کے مسکن بنے ہوئے ہیں۔ ہماری
کوئی بات خواہ استدلال پر ہی کیوں نہ مبنی ہو۔ اس وقت تک شرفِ قبولیت حاصل
نہیں کرتی جب تک یورپ یا امریکہ اپنی معیار میں وزن کر کے اس کو پوری
نہ اتار دے۔ ”ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا“

خیر خدا خدا کر کے بعض ہندوستانیوں میں سفر کا شوق بھی پیدا ہوا
ہے۔ تو وہ یورپ اور امریکہ میں جا کر بجائے اس کے کہ ان کے اعلےٰ
اوصاف۔ اُن کی متجسس طبیعت۔ ان کے علم و کمال سے بہرہ ور ہوں

خوب گل چھرے اڑاتے ہیں۔ اور جب واپس آتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملایا کرتے ہیں اور مطلب کی بات ندارد ۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اصُولِ سفر آپ ناظرین کے گوش گذار کئے جائیں۔ بعض ناظرینِ رسالہ ایسے بھی ہونگے جن کی ہدایت کے لئے اُن اصُولوں کو پیش کرنا گویا لقمان کو حکمت سکھانا ہے۔ اس لئے اُن حضرات سے میں معافی کا خواستگار ہُوں ۔ ان اصولوں کو بیان کرنے سے پیشتر گذارش ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل امور کا خود پابند بناؤ ۔

اول ۔ جس مقام کی سیر کرنا منظور ہے۔ اس کے مجمل حالات سے اگر ممکن ہو پہلے ہی آگاہی حاصل کرلو۔

دوم ۔ ایک روزنامچہ اپنے ساتھ رکھ جس میں ہر ایک قابلِ ذکر چیز کا حال درج کرو۔

سوم ۔ نہایت لازمی اور اشد ضروری ہے کہ اخلاقِ پسندیدہ اور اوصافِ حمیدہ سے خود کو آراستہ کر کے قدم باہر نکالو ۔ چال چلن اور خصلتوں کو اس قدر مہذب طور اور رنگ میں رنگ لو کہ غیر ممالک کی نا جائز دلفریب اداہیں تم پر اپنا جادو نہ چلا سکیں۔ ورنہ اغلب ہے کہ پردیس بجائے رحمتِ الٰہی کے قہرِ ذوالجلال بن جائے ۔

اس قدر پابندی کے بعد سفر یقینی نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ مندرجہ ذیل اصُول نظر انداز نہ کئے جائیں۔

۱ - قوتِ فیصلہ کو صحیح قاعدے پر پیدا کرکے کام میں لاؤ - ورنہ بہت ممکن ہو کہ تم سفر کے اصلی مطلب کو فوت کر دو - اور غیر ضروری چیزوں کو بافراغت سمجھو - نہایت موقع پر قابلِ مشاہدہ چیزوں کی ایک طویل فہرست پیش کرتا ہوں جو کم و بیش ہر مقام پر پائی جاتی ہیں - بادشاہوں کا دربار خصوصاً اس موقع پر جب کہ سفیروں کو باریابی کا موقع حاصل ہوتا ہے یا جبکہ ان میں مقدمات پیش ہوں - عبادت گاہیں - خانقاہیں - منہدم یادگاریں - بندرگاہیں - برباد شدہ کھنڈرات - کتب خانے - مکاتب - مختلف کارخانجات - محلات - باغات - توشہ و سلاح خانجات - لین دین کے بازار - شہسواری کے کرتب اور دوسری کسرتیں - فوج کی قواعد - اور وہ چیزیں جو اس شہر کی خصوصیات سے ہوں -

۲ - اس مقام کی جہاں کا قصد ہے زبان سے کم و بیش واقفیت پیدا کرو - تاکہ اس مقام کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکو - اور وہاں کی تمدنی - معاشرتی - اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈال سکو - اور اپنے علم میں اضافہ کرسکو - چونکہ ہر ملک کی زبان سیکھنا تقریباً ناممکن ہے اس لئے انگریزی زبان کے سیکھنے پر اکتفا کرو - کیونکہ روئے زمین کے کل علمی خزائن اس میں محفوظ ہیں اور کرۂ ارض کی دوسری زبان ہونے کا شرف اسکو حاصل ہے -

۳ - قابلِ مشاہدہ چیزوں کے انتخاب میں اور ان کو استقلال سے معائنہ کرنے میں ہوشیاری سے کام لو - اور صرف اپنے ہی مذاق کے مطیع نہ بن جاؤ - ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک حجام سے

جس نے اس سے پیشتر دربار شاہی میں دخل نہیں پایا تھا۔ دریافت کیا گیا کہ اُس نے وہاں کیا دیکھا۔ جواب دیا کہ بادشاہ کے بال عمدہ طریقے سے تراشے ہوئے تھے۔ بیچارے حجام ہی پر کیا منحصر ہے۔ سوداگر۔ بندرگاہوں اور لین دین کے بازاروں کو خاص طور پر مشاہدہ کرتے ہیں۔ سپاہی۔ قلعوں۔ سلاح خانوں اور میگزینوں کو۔ طلبہ کتب خانوں اور مباحثوں کو۔ مدبر عدالتوں کو۔ غرضیکہ ہر ایک شخص اپنے پیشہ اور مذاق کا گرویدہ ہے۔ اور دُوسری نادر چیزوں سے ناآشنا نظر آتا ہے۔ اسی طرح اس میں ایک خاص کمی باقی رہ جاتی ہے جس کا دور کرنا رفتہ رفتہ اُس کی قدرت سے باہر ہو جاتا ہے۔

۴ - غیر ممالک میں سفیروں اور سکتروں سے ملاقات کرو۔ تاکہ تم کو اور ممالک کے حالات بھی معلوم ہو جائیں۔ اُن بزرگوں کی زیارت بھی ضرور کرو جو لازوال شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ تاکہ تم کو معلوم ہو جائے کہ زندگی اور شہرت میں کس طرح رابطہ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تم سفر سے واپس آؤ تو اُس ملک سے بالکل تعلق قطع نہ کر لو۔ بلکہ وہاں کے واقف کاروں سے خط کتابت کو جاری رکھو تاکہ وہاں کی تبدیلیاں اور حالات تم کو معلوم ہوتی رہیں۔

۵ - یہ موقع دو کہ دُوسرے شخص تم سے سفر کے متعلق سوالات کریں۔ تم اپنے مشاہدے کو خود بخود بیان نہ کرو۔ اپنے خیالات۔ جذبات اور مشاہدات پر پورا پورا قبضہ رکھو اور موقع اور محل پر ان کا اظہار اپنے دوستوں کی موجودگی میں کرو۔ قرینِ قیاس واقعات کے بیان

کرنے میں دقت تھا۔ سیدھے سادے لوگ اور خاص کر عوام کے سمجھانے میں۔ ورنہ وہ بجائے عمدہ رائے قائم کرنے کے تمہارے تجربات کو قصہ کہانی سے تعبیر کریں گے۔ فارسی کی ضرب المثل "جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ" ایسے ہی سیاحوں کی لفاظی اور فضول گوئی کا نتیجہ ہے جو اصول مذکورہ پر عامل نہیں ہیں۔

۶۔ نئے ممالک میں جا کر اپنے طریق معاشرت اور طرز تمدن و آداب کو بالکل فراموش نہ کرو۔ اور وہاں کی ہر ایک شے کے عاشق نہ بنجاؤ بلکہ خذ ما صفا ودع ما کدر پر کاربند رہو۔ اور بعض عمدہ باتوں کو چن کر اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کرو۔

یہی وہ اصول ہیں جن کی پابندی نے یورپ کو یورپ اور امریکہ کو امریکہ بنا دیا اور ان کی خلاف ورزی نے ہندوستان کو ابھرنا تو کیا اصلی حالت پر بھی قائم نہیں رکھا۔ اس فرق کو دیکھیئے اور عبرت حاصل کیجئے۔ ع "بر رسولاں بلاغ باشد و بس"۔

سفر بھی موافق عام اصول کے اپنی خوبیاں اور برائیاں لئے ہوتے ہے۔ لیکن اگر کچھ بھی غور سے دیکھا جائے تو اس کے فوائد اس کے نقائص سے زیادہ ہیں۔ مضمون بخیال طوالت صرف فوائد کے اظہار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ امر تو اس مختصر میں ثابت کر دیا گیا ہے کہ سفر اکتساب علم کے لئے کس قدر ضروری ہے۔ اس لئے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تبادلہ خیالات جو دنیا میں بہت سے ایجادوں کا باعث ہوا ہے۔ سفر کی بدولت بہ حسن

وجوہ عمل میں آتا ہے۔ مختلف مقامات کی تمدنی۔ معاشرتی اور اخلاقی خوبیوں کا آپس میں مقابلہ کرکے اپنے لئے ایک مکمل قاعدہ تدوین کرنا سفر کی وجہ سے سرانجام پا سکتا ہے۔ انسانی طبیعت کا مقتضی ہے کہ وہ عجیب و غریب اشیا کی ٹوہ میں رہتی ہے۔ سفر اس خواہش کو پورا کرتا رہتا ہے المختصر سفر انسان کو کامل۔ پختہ کار۔ اور دنیا کے نشیب و فراز سے واقف کار بنا دیتا ہے۔

حامد حسین رضوی المشہدی اسسٹنٹ ماسٹر
از امراؤتی (برار)

غزل

ترے فراق میں جینا بشر کا کام نہیں — ہزار شکر کہ اس عمر کو دوام نہیں
گلوں سے کہتی ہے جو چٹکا کے یوں نسیم سحر — چلے چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں
قیامت آئے اٹھے روئے یار سے پردہ — خدا وہ صبح دکھائے کہ جس کی شام نہیں
پھنسا جو زلف میں اس کی ہوا عزیز جہاں — وہ دل ہے صید زبوں جو اسیر دام نہیں
دعائے خواب اجل ہجر میں مناسب ہے — یہی وہ شے ہے جو عشاق پر حرام نہیں
خدا کی یاد میں حوروں کی یاد لائے واعظ — نگاہ غیر پہ کرنا کیا حرام نہیں
نگاہ یار نے دنیا میں یہ کیا اندھیر — بیاض صبح کو چشم سواد شام نہیں
قریب آتی ہے اے روح قبر کی منزل — ہوا جو کوچ وہاں سے تو پھر مقام نہیں
لہو بہا ہے جہاں خاص تیرے کشتوں کا — وہ ارض پاک زیارت گہ عوام نہیں

سمند عمر کو آہار ہو سکتے کیونکر
زیادہ اس سے کوئی تیزیٔ گام نہیں

نظام جنّت مقام

ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی علمی اور ادبی دنیا اس سخت صدمہ سے دل بریاں اور چشم گریاں ہے۔ آہ کہنا ہے کہ اعلیٰ حضرت نظام الملک آصفجاہ سادس جنت آشیان میر محبوب علیخاں مغفور فرمانروائے دکن برّد اللہ مضجعہٗ و افاض علیٰ وجہہٖ شآبیب رحمتہ و رضوانہ نے جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۰

اردو زبان کے سرپرستوں میں نظام مغفور کا بڑا مرتبہ تھا۔ آپ نہ صرف اس زبان کے سرپرست تھے بلکہ خود ایک قادر الکلام سخنور بھی تھے۔ مخزن بھی اس رنج واندوہ میں دلی حصہ لیتا ہے جو علمی اور ادبی دنیا کو اس صدمہ جگرگداز سے پہنچا ہے۔

عرش نشین نظام

اور مخزن اور ناظرین مخزن اعلیٰ حضرت قدر قدرت بندگان عالی متعالی مدظلہم العالی نظام الملک آصفجاہ سابع ہز ہائینس میر عثمان علی خاں دام ملکہ اورنگ نشین دکن کی تخت نشینی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے خداوند ذوالجلال سے اُن کے جاہ وجلال اور دولت و اقبال کی استدعا ہے۔ اور ان کے لئے اپنے سلف صالحین کی روش پر استقامت کا طلبگار ہے۔ ع این دعا

از من و از جملہ جہاں آمین باد +

کلامِ اکبر

فلسفہ میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندنی — سعی کا موقع ملے تو آرٹ یا سائنس سیکھ
دشمنِ اسلام سے بچ پہچان لے نادان دوست — وقعتِ قومی جو چاہے چھوڑ لفاظی کی سیکھ

اکبر

غرۂ شوال

یا

ہلالِ عید

یہ نظم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کے تازہ نتائج فکر سے ہے۔ اور گو دیگر ذرائع سے شائع ہو چکی ہے تاہم ناظرینِ مخزن کی اس سے ضیافتِ طبع نہ کرنا ایک فروگذاشت ہوتی۔ اس لئے اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے:-

غرۂ شوال اے نورِ نگاہِ روزہ دار — آکہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار
تیری پیشانی پہ تحریرِ پیامِ عید ہے — یعنی تیری شام صبحِ عیش کی تمہید ہے
سرگذشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے — اے مہِ نو ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے
جس علم کے سایہ میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم — دشمنوں کے خون سے رنگیں قبا ہوتے تھے ہم
زندگی تیری جبیں بوسی اسی رایت کی ہے — حسنِ روز افزوں سے تیرے آبرو ملت کی ہے
آشنا پرور ہے قوم اپنی وفا آئیں ترا — ہے محبت خیز یہ پیراہنِ سیمیں ترا

عندلیبِ حجاز

کی نذر

(حضورِ رسالت پناہی میں)

مسجد شاہی لاہور میں ایک جلسہ ۹۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو ترکی اور اطالیہ کے قضیۂ نامرضیہ کے متعلق اظہارِ رنج و افسوس کے لئے منعقد ہوا تھا جس میں بہت سی پُر جوش تقریریں ہوئیں اور مسلمانانِ لاہور نے یکدل و یکزبان ہو کر اطالیہ کے جابرانہ حملہ کی نسبت اپنی ناراضگی ظاہر کی۔ اس وقت جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی اس مختصر مگر پُر سوز نظم نے حاضرین پر ایک وجد کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ شیخ صاحب ممدوح نے ان اشعار پر نظرِ ثانی فرما کر انہیں بہ غرضِ اشاعت ہمیں عنایت کیا ہے:-

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا

قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

ہوا نصیب اجل اشتیاقِ آزادی
سمندِ عمر کو اک نور تازیانہ ہوا

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

مسلم یونیورسٹی

فصلِ گل آئی چمن میں پھر ہوا سودا ہمیں ۔ بیٹھے بیٹھے چکر آئے ہنسی لینا ہمیں

ہاتھ اب بڑھتے نہیں اپنے گریباں کی طرف ۔ ہنستی ہے خلقِ خدا آتا ہے جب رونا ہمیں

دل میں بھولے سے نہیں آتی ہے اب گھر کی یاد ۔ آنکھیں کھلاتی ہے کس کی صورتِ زیبا ہمیں

خود بخود نفرت ہوئی جاتی ہے حسن و عشق سے ۔ کیا کرے کی الفتِ گیسو بھلا رسوا ہمیں

مصحفِ رخسار اس کے یاد آ جاتے نہیں ۔ دل ہے سیپارہ الٰہی غم ہے یہ کیسا ہمیں

چارہ گر بھی دنگ ہیں یہ ہے نئی دیوانگی ۔ طوق کی حاجت نہ ہے زنجیر کا کھٹکا ہمیں

وادیٔ وحشت کی جانب اب نہیں اٹھتے قدم ۔ اے جنوں تو نے کیا مبہوت کچھ ایسا ہمیں

سنگِ طفلاں کا نشانہ کون ہوگا خلق میں ۔ جذبۂ دل کھینچتا ہے کب سوئے صحرا ہمیں

ابر کے آتے ہی نفرت اور بھی ہے بڑھ گئی ۔ خوش نہیں آتا ہے ذکرِ ساغر و مینا ہمیں

مہوشوں کی صحبتوں سے بھاگتے ہیں دور دور ۔ باغ میں آتا نظر ہر پھول ہے کانٹا ہمیں

چٹکیاں لیکر کوئی کہتا ہے مرکر زار یا ۔ دل مچلتا ہے چلو لیکر لبِ دریا ہمیں

ضبط کہتا ہے نہ آئے لب پہ ہرگز رازِ عشق ۔ درد کہتا ہے کہ دردِ دل ہے کچھ کہنا ہمیں

ہل رہے ہیں خود بخود لب بہہ رہے ہیں جوئے اشک ۔ آج ہے منظور یارب ذکر یہ کس کا ہمیں

یہ بلندی سے گرا ہے کون پستی کی طرف ۔ کونسی وہ قوم ہے جس کا کہ ہے رونا ہمیں

دھاک کس کی خلق میں بیٹھی ہوئی تھی ہر طرف ۔ اب نہیں آتا نظر اس میں کوئی ویسا ہمیں

کون تھی وہ قوم جو حکمت پہ نازاں تھی ۔ حال کس کا اب نظر آتا ہے افسانا ہمیں

علم کے دریا بہائے خلق میں کس قوم نے ۔ ناؤ کس کی ڈوبتی ہے کچھ نہیں پروا ہمیں

کس نے عالم کو سکھایا خلق و اخلاق و ادب — آپ کو بھی کچھ خبر ہے آتا تھا کیا کیا ہمیں

فلسفہ جغرافیہ حکمت میں تھا ممتاز کون — کیا زمانہ تھا کہ مانا کرتی تھی دنیا ہمیں

کیا ستم ہے سیکھ کر تاریخ دانی خلق میں — غیر قومیں دے رہی ہیں آج کیا دھوکا ہمیں

وہ تجارت اور صنعت کہاں جو پہلے تھی — اب نظر آتا نہیں انجام کچھ اچھا ہمیں

اے مسلمانوں نہیں کے ہم بھی تھے نونظر — آج دیکھو تو نہیں ہے کچھ غم فردا ہمیں

نام آور ہم ہوتے تھے آہ جس تعلیم سے — ذکر اُس کا اب کتابوں میں نہیں ملتا ہمیں

خلق کہتی ہے کہ چھوٹا منہ بڑی یہ بات ہے — کھو دیا اس طرح سے آخر نہ کچھ آیا ہمیں

رات دن عیش و طرب کی صحبتیں ہیں اور ہم — ٹھوکریں کھلوا رہا ہے ساغر و مینا ہمیں

وقت جاتا ہے مگر اس کی نہیں کچھ ہمکو قدر — کام وہ کرتے نہیں جو کچھ ہے کرنا ہمیں

ہند میں ہوتی ہے اب تیار یونیورسٹی — علم کا ہر گھر میں آجائیگا اب چرچا ہمیں

آگیا وہ وقت وعدوں کو کرو اپنے وفا — جو کہ دینا ہے وہ تم دل کھول کے دینا ہمیں

نام کر جائیں زمانہ میں تساہل چھوڑ کر — ہر طرح اس کی مدد سے خلق میں زیبا ہمیں

خود بھی دیں اور دل سے ہم بولو نہیں ہم اس کام میں — ہائے گر ہمت کہے گی خلق پھر کیا کیا ہمیں

چلے تھے انجام یہ ہر وقت حیرت سے نظر — کیا زمانہ میں ملیگا وقت پھر ایسا ہمیں

سب کی نظروں میں ہینگے آہ ہم کتنے حقیر — کیا سمائی دل میں ہے اب کچھ نہ آئیگا ہمیں

بحرِ غم میں پھر نہ ڈوبے گا بیڑہ قوم کا — دست و پا کا گر ہلانا اب بھی کچھ آیا ہمیں

یا الٰہی خلق میں دے تو ہمیں توفیق نیک — شرم دامنگیر ہے افعال سے کیا کیا ہمیں

امتِ احمد پہ یا رب رحم کر اور جلد کر — واسطہ اس کا کیا جس کے لئے پیدا ہمیں

اب تباہی کے ہمیں سامان آتے ہیں نظر — کوئی دنیا میں نظر آتا نہیں اپنا ہمیں

سخت حیرت ہے کرینگے ہم ترقی کس طرح — آفتوں نے ہر طرف سے آکے ہے گھیرا ہمیں

[illegible] باقی [illegible] — اپنے [illegible] سے ہیں جنگل [illegible]
رات دن [illegible] — اب نہ وہ ہمدردیاں [illegible]
جو سکھایا تھا [illegible] نہیں — [illegible] جہالت نے [illegible]

[illegible] حق سے دعا
[illegible] تو [illegible]

ماہر کستوری

مناجات

یہ نظم [illegible] ایک مصرع دو مختلف بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ دونوں بحروں کے اوزان یہ ہیں :-

(۱) مفتعلن مفتعلن فاعلن۔

(۲) فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔

اے میرے اللہ میرے پروردگار　　نعمتوں کا تیری ہو کیونکر شمار
کون ہے جو کرسکے تیری ثنا　　ہے ترے اوصاف کی کیا انتہا
تو نے ہی پیدا کیا انسان کو　　اور یہ رتبہ دیا انسان کو
اشرفِ مخلوق کا بخشا خطاب　　ذرہ جو تھا ہوگیا وہ آفتاب
تو نے ہی انسان کو بخشی زباں　　تو نے ہی بخشے اسے لب اور دہاں
تو نے ہی انسان کو ناطق کیا　　تو نے ہی سب پر اسے فائق کیا
عقل بھی بخشی اسے اور جان بھی　　باطل و حق چیز کی پہچان بھی

جان دی ایماں دیا اور دل دیا — تھا نہیں کچھ بھی اسے سب کچھ کیا

طیر کو تو نے دیئے اک مشت پر — شیر کو تو نے دیئے دل اور جگر

بحر کو تو نے کئے گوہر عطا — باغ میں تو نے دیئے ہیں گل کھلا

دیدۂ مخلوق سے تو ہے نہاں — پا نہیں سکتا کوئی تیرا نشاں

آنکھ سے مفقود ہے تو اے خدا — ہر کہیں موجود ہے تو اے خدا

ہے گلِ گلشن میں بھی تیری ہی بو — نغمۂ بلبل میں بھی ہے تو ہی تو

لب پہ ہیں سب کے تری وحدت کے گیت — گاتے ہیں طائر تری قدرت کے گیت

یاد میں ہیں تیری ہی سب قمریاں — ڈھونڈتی کوکو سے ہیں تیرا نشاں

سرو پر آ کر جو ہیں نغمہ سرا — جھومتا ہے سن کے وہ تیری ثنا

کوہ کی حالت جو یہ سکتے کی ہے — چھا گئی ہیبت تری اس پر بھی ہے

بحر کو بھی ہے تری ہی جستجو — ڈھونڈتا ہے تجھ کو بھی یہ سو بسو

پاتا ہے بے سود جب اپنی تلاش — کرتا ہے سر کو دے پھر پاش پاش

ڈھونڈتے ہیں تجھ کو مہ اور آفتاب — یاد میں ہے تیری ہی گریاں سحاب

چلتی ہیں دن رات جو یہ آندھیاں — تیرے ہی پانے کو ہیں ہر سو رواں

خم ترے آگے سرِ شاہ و گدا — تابعِ فرماں ترے ارض و سما

تو نے جو فرما دیا وہ ہو گیا — کر نہیں سکتا کوئی چون و چرا

رحم کر اب ہند پر اے کردگار — فضل سے تیرے ہو یہ بیڑا بھی پار

ہند سے اب جہل کو تو دور کر — روشنی سے علم کی معمور کر

دور کر اب ہند سے یارب نفاق — بھیج دے اس کی جگہ تو اتفاق

حال جو بد اس کا ہے ہو جائے نیک — قومیں ہیں جو ہند میں ہو جائیں ایک

حامدِ خستہ کی ہے یہی دُعا
ہند کو ہو ثروت و حشمت عطا

حامد حسن قادری بدایونی

اِشتیاقِ یار

مَیں میٹھی نیندوں سے جاگتا ہُوں بوقتِ شب بیقرار ہو کر
صَبا کے جھونکے رواں ہوں جس دم ستارے چمکیں شرار ہو کر
میں میٹھی نیندوں سے جاگتا ہوں تری طرف اُٹھ کے بھاگتا ہوں
اُٹھے ہی آتے ہیں تیرے در تک یہ پاؤں بے اختیار ہو کر

پہنچ کے نہرِ خموش و تاریک پر جو دھیمی رواں صَبا ہو
مہک بھی چمپا کی ہو چلے گم خیالِ خوش جیسے خواب کا ہو
لپٹ کے بلبل کے دل سے رہ جائے جس طرح پرفغان بلبل
لپٹ کے تیرے گلے سے بالکل جو میں بھی مر جاؤں پھر مزا ہو

میں غش میں مرتا ہوں رہ چکا ہُوں اُٹھا مجھے مرغزار سے تو
برس مرے چشم زرد و لب پر بلائیں لے لے کے پیار سے تو
خنک ہیں اور زرد گال میرے ہے تیز و پُر شور دِل کی دھڑکن

دل حسرتیں کا یہیں ہے مدفن ہٹا نہ اس کو کنارے تو
خواجہ دل محمد ایم اے لاہور

"مثنوی نیرنگ سحر"

یعنی

شکنتلا کا مشہور افسانہ

(من تصنیف اقبال ورما سحر)

منشی اقبال ورما صاحب سحر نے یہ نظم ایک سنسکرت کے قدیم ناٹک سے ترجمہ کر کے عنایت کی ہے۔ چونکہ اردو زبان میں ایسے مضامین کی بہت ضرورت ہے اور اس سے ایک گونہ مسرت ہوئی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ ہندو بھائیوں کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ لہٰذا ہم شکریہ کے ساتھ اس مثنوی کو شائع کرتے ہیں۔ اور اُمید وار ہیں کہ لائق دوست اس کے باقی ابواب بھی ہمیں کو عنایت کرینگے :۔

باب اوّل

"عشق کی کرامات اور شکنتلا کی پیدائش کے حالات"

رُباعی

(حمد)

یا ہادی گمراہ و گنہگار مدد یا رحم نمائے بندۂ زار مدد

یا جا رہو و دل لاچار ہو — یا حامیٔ عشق و مددگار ہو

(اسی باب کا حاصل مطلب)

اے عشق تو نے نقش نئے کیا کیا کیا — کیا کیا رباب حق سے بھی بیگانہ کیا
تنہا بنا کے [illegible] اپنے سب [illegible] — اچھا کیا تو نے یہاں چھا نہ کیا

کہتا ہے جو داستانِ دلکش — یوں خامہ سے ہے بیانِ دلکش
قدرت کہ جو ہے گوشۂ بر — تھا ایک عدیم نیک اختر
تھا زاہد متقی نام اُس کا — بس حق پہ عمل تھا کام اُس کا
وہ ایسا کہ اسیرِ معرفت تھا — سچا تصویرِ معرفت تھا
وحدت کی چمک نہاں تھی ہر سو — قدرت کی جھلک عیاں تھی ہر سو
غنچہ تھا تو دھیان میں جھکا تھا — گل تھا تو خوشی سے ہنس رہا تھا
لاتی تھی صبا ہوائے جنت — یوں دہر میں تھی فضائے جنت
اک صفحۂ راز برگ تر تھا — اک زاہد مست ہر شجر تھا
موجوں کی وہ آب میں روانی — کہتی تھی فسانۂ نہانی
پانی میں حباب کے وہ ہستی — دکھلا رہی تھی فریبِ ہستی
اُٹھا تھا یہ پردۂ حقیقت — ہر شے میں تھا جلوۂ حقیقت
اس طرح وہ عابدِ خردمند — تھا محو عبادتِ خداوند
بوئے گلِ خاص پیرہن میں — تھی راحت راست اسکے تن میں
تھا یادِ خدا میں وہ جو بس اک — پُر رشک ہوا دلِ ملائک
اک اک نے حسد سے ہاتھ مارا — یوں کھیل بنا ہوا انگارا

بلوا وہیں حورِ مینکا کو — بتلایا سبھوں نے مدعا کو
درویش کی بندگی بگڑ جائے — یوں باغِ دعا میں اوس پڑ جائے
بولی وہ کہ سہل بات پائی — یہ کہکے چلی زمیں پہ آئی
پہنچی وہ مہارشی کے بن میں — اک پھول نیا کھلا چمن میں
سنگار سے سج سجا کے پہنچی — وہ نزدِ فقیر جا کے پہنچی
بے پردہ تھا نورِ حسنِ دلکش — ظاہر تھا غرورِ حسنِ دلکش
مستیِ خرام کا یہ تھا حال — فتنہ تھا قدم قدم پہ پامال
آئی وہ لگاتی سوز کی آگ — گاتی ہوئی حسن و عشق کے راگ
بس محوِ صدائے نغمہ زا تھے — خاموش تھے [illegible]
کرتی تھی الاپ بے خبر دل — لوٹا جاتا تھا رقص پر دل
صحرا میں غرض جو گونج اٹھی تان — چھوٹا عابد کا ذکر و دھیان
دیکھا تو تھی اک نگارِ خوش رو — بس دل میں سما گئی [illegible]
آنکھوں سے پیئے وہ جام سرشار — کچھ بھی نہ رہے حواس زنہار
جوبن میں بھرا ہوا تھا جادو — اس تن میں بھرا ہوا تھا جادو
دیوانہ بنایا ہر ادا نے — زائل کئے ہوش دلربا نے
انداز پہ دل ہوا تھا قرباں — آواز پہ دل ہوا تھا قرباں
پہلے تو تھا بندۂ خدا وہ — اب بندۂ بت وہی ہوا وہ
اس دل میں فروغِ حق عیاں تھا — اک جلوۂ باطل اب وہاں تھا
گمراہ تھا نورِ بت سے وہ پیر — پیدا تھا روشنی میں اندھیر
ہر چند تھا فکرِ راہ [illegible] میں — ششدر ساکت تھا ہر قدم میں

یاد آگئیں حسرتیں نکل کر   ارمان مچل پڑے مچل کر
ہمت دی نفس نے جلا کی   جرأت ہوئی عرضِ مدعا کی
ظاہر ہوئی حالتِ نہانی   اُس رنگ پریدہ کی زبانی
تھی بسکہ بری وہ مدعا کوش   در دل سے ہوگئی ہم آغوش
وہ پاک خیال جڑ سے نکلے   ارمان اِدھر اُدھر سے نکلے
دونوں ہوئے خلطِ وصل میں چور   مہ نے لیا آفتاب سے نور
میعادِ حمل غرض گزر کر   نکلا وہ جسد میں نورِ انور
یعنی دختِ ایک دلبری سے   جادو سی عیاں ہوئی پری سے
آنچل پہ اٹھایا مینکا نے   دامن میں رکھی کلی صبا نے
شرمائی ہوئی ادا سے آئی   عابد کی بغل حیا سے آئی
بولی کہ اے نکتہ دانِ اُلفت   لے نذر یہ ارمغانِ اُلفت
اس نور کی جا نظر میں رکھنا   ہاں نقشِ وفا کو بر میں رکھنا
اچھا تو وطن کی ہو اجازت   جانے کی عطا ہو مجھکو رخصت
دیکھی جو وہ دخت ماہ پارہ   عابد کو ہوا غمِ نظارہ
اُس غنچہ کو دیکھ وہ ہوا زرد   کر یاد سبب کو اک ہوا درد
تصویر سی چشم ہوگئی وا   حیلہ کا گرا نظر سے پردا
آنکھوں سے اڑا حجابِ غفلت   جانا کہ بگڑ گئی عبادت
منہ پھیر حجاب کر گیا وہ   بس خوفِ خدا سے ڈر گیا وہ
ہو کر کے غریقِ بحرِ افسوس   بولا صد حیف بختِ معکوس!
اے نفس کیا یہ تو نے کیا ہائے   کیسی ہوئی بھول یہ خطا ہائے

تقوے کا مٹا نشاں صد افسوس
محنت ہوئی رائگاں صد افسوس

یہ کہکے وہ ہو کے زار رویا
بس سوز سے شمع وار رویا

دیکھی جو پری نے کج ادائی
کچھ فتح پہ اپنی مسکرائی

اس جا پہ تُرت حسیں کو چھوڑا
دریا نے گہر زمیں کو چھوڑا

آہستہ وہاں سے خود اُٹھ آئی
جنت کو چلی اُڑی ہوائی

واں بسوامتر کو نہ تھا ہوش
تھیں یار و دشت سب فراموش

دُنیا کی نہ اسکو تھی خبر کچھ
غم تھا عقبےٰ کا تھا بھی گر کچھ

چھوڑا اس دشت کی زمیں کو
دیوانہ سا چل دیا کہیں کو

درویش تھا کنو اک نکو کا
ناگہ واں پہ ہوا نمودار

دیکھا تو تھی خاکِ جا سے تنویر
آئینہ میں حُسن کی تھی تصویر

اک ہنس تھا سر پہ سایہ افگن
شعلہ سا نہاں تھا زیرِ دامن

خوبی کی تھی اک نرالی صورت
پیاری تھی وہ بھولی بھالی صورت

تھا بسکہ رحیم پیرِ دانا
واجب اُسے چھوڑنا نہ جانا

معصوم پہ اس کو رحم آیا
آنکھوں پہ لیا گلے لگایا

گھر لایا غرض اُسے وہ خوش کام
رکھا اس کا شکنتلا نام

پلتی تھی سہیلیوں میں بن میں
بڑھنے لگی شاخِ گل چمن میں

انتظارِ مرگ

انگلستان کے خوشگو شاعر رابرٹ براؤننگ کی والدہ نے اپنے انتقال سے تھوڑی مدت پہلے ایک نظم انگریزی میں انتظارِ موت کا نقشہ کھینچا تھا اس کا ترجمہ نظم اردو کے شائقین کے مطالعہ کے لئے ذیل میں درج ہے :

کھلنے کی ہے منتظر [illegible] بہشت
[illegible] میں اک پیکِ بہشت
کیا پردہ دستِ قدرتِ حق سے ہے ٹوٹ رہا
جس کے تلے تھا رات جہاں مرا بستر بچھا
کھلتی ہے روح کی بھی کبھی بخیہ ممات
دیکھوں گی کیفیتِ طلسم حجاب اثبات
یعنی قدم کے روز مکمل کی روشنی
دے گی مٹا حدوث کی گھنگھور تیرگی

سی۔ مہتہ۔ صادق۔ (احمد پور)

کلامِ حامد

ہمارے مکرم مسٹر حامد علی خاں صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ لکھنؤ کبھی کبھی اپنے تازہ نتائج افکار سے مخزن کو گنجینۂ گوہر معانی بنایا

نعت مہدان نہ ہیں ہیں نظارگیِ حسنِ صنم — شوقِ جلوہ ہے تو آ دیکھ تماشا کوئی دم

جو کوئی آگے ملا وہ بھی ہوا دریا دل — آشنا بحرِ تعرف کے ہیں کیسے حاتم

چشمِ دیدار کہاں جلوہ ناگاہ سمجھ — دیکھ دم بھر میں ہوئی جاتی ہے صحبت برہم

ایک نیرنگ ہے یہ رنگِ تماشا سالک — رم تماشے میں لگا شوق کے ہے شوق کو رم

کیف کا کیف ہے کم ذوقِ تماشا کیا ہو — جذبۂ شوق جو ہو کیف کا نشہ ہو نہ کم

حال کی قید نہیں وقت کی تعریف نہیں — ہوش ورد دم کو سمجھ دم ہے یہ ہر جزئیِ عدم

نقشِ موہوم ہے بنا و اہمہ خلاقِ زمن — کوچۂ وہم کی ہے راہ بہت تم در خم

دیکھ وہ سرو سرافراز ادھر ہے مائل — خاکسار اس کو پسند آئے ترے سر کی قسم

سینۂ بریاں جو ہے اُن کا ہوا وہ دمساز — دیکھتا ہے جگرِ خستہ و چشمِ پُر نم

ناظرِ جلوہ ہیں وہ جو ہیں سعیدانِ ازل — جن کا ہے طالعِ فرخندہ نہیں بخت دژم

روبرو کیوں نہ ہو یہ آئنۂ غیب و شہود — چشمِ باطن جو ہوا ہوش کے ہے گوش اصم

پاسِ انفاس کے جادے سے چلا آ سالک — دل میں وہ بانگِ جرس گونج رہی ہے پیہم

خاکسارانِ طریقت کے یہاں ہیں جو آئے — اسکو آجائے نظر جلوۂ طاؤسِ حرم

شام سندر ہے اسی بن کی گپھا میں قصاں — لے نوازی میں ہے سرمست وہ جانِ عالم

کنزِ مخفی ہے وہ استارِ خفی میں روپوش — چشمِ اخفیٰ کو ہے مشہود یہ سرِ اعظم

خلوتِ دل میں یہی ایک ہے دمساز انیس — رابطہ دل سے ہوا مونسِ جان و ہمدم

جذبۂ شکر ہے مجذوب تماشا ہے نظر — دیکھ لے سالکِ مجذوب نگاہِ محرم

کیوں نہ ہو جلوۂ مستور تجلی پیکر — مظہرِ فیض ہوئی ہے کششِ کافِ کرم

ساقی اے محوِ تغافل تجھے کچھ ہوش نہیں — خود نما جلوہ ہوا جلوہ نمائے عالم

یہ دمے چند جو صحبت ہے غنیمت ہی سمجھ — دیکھ لے شوق سے تو بھی رُخِ زیبائے صنم

سبھی ہم باہم ہو تو بھی خود آ ساں بنکر وسوسہ ہو نہ کوئی خطرہ مسرت ہو نہ غم
خود شناسی کی خلاقی میں جلتی ہے کہاں ڈگمگا سکیں ہیں ہم تمکین نہ تعجب نہ بھرم

وصلِ عریاں جو ہوا پردہ حائل نہ رہا
طلب و طالب و مطلوب ہوئے ہیں باہم

عریانِ خراباتی ساقی دہلوی

دلِ بیقرار سو جا

عنوان بالا پر جناب سرور جہاں آبادی کی پُردرد نظم جو فروری ۱۹۱[illegible] کے مخزن میں شائع ہو کر منظورِ نظرِ ناظرین ہوئی تھی۔ اس پر یہ خمسہ ہمارے عنایت فرما جناب انجم صاحب نے اشاعت کے لئے ہمیں عنایت کیا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ بھی دلچسپی کا باعث ہوگا:-

نہ تڑپ کسی کے غم میں نہ ہو اشکبار سو جا نہ کر آہ و نالۂ ظالم تو یوں بار بار سو جا
لے آنکھیں بند کر بھی ارے بیقرار سو جا کسی مست خواب کا تو نہ ہو انتظار سو جا
کہ گذر گئی شب آدھی دلِ بیقرار سو جا

ترے حال سے ہے غافل وہ ستم شعار سو جا وہ وفا کرے گا وعدہ نہ کر اعتبار سو جا
سوئے در نگاہ کیوں ہے مرے غمگسار سو جا کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گذر گئی شب آدھی دلِ بیقرار سو جا

یہ بسی ہوئی چمن سے جو ہوا آ رہی ہے چھن کے یہ شمیم روح پرور ہے نہ باغ [illegible]

ہے غضب بیقراری تیرا یہ ستم تڑپنا — کہیں ہو نہ جائے اک دن ترے حق میں سم تڑپنا
نہ بیے لے جان آخر شب رنج و غم تڑپنا — مجھے خوں رُلا رہا ہے ترا دمبدم تڑپنا

ترے غم میں آہ کب سے میں ہوں اشکبار سوجا

تجھے کیا یہ ہو گیا ہے جو کسی پہ مبتلا ہے — یہ فضول رو رہا ہے یہ عبث تڑپ رہا ہے
اسی دن کو ہم نے ناداں تجھے بارہا کہا ہے — ترے پہلے سابقہ ہے شب غم بڑی بلا ہے

کہیں مر نہ جائے ظالم دل بیقرار سوجا

انجم۔ از گیا

علم

وہی ہے اے علم مرحبا زینۂ بام عروج — تیری برکت سے ہوا آفاق میں نام عروج
رہنمائے منزل مقصد ہے تو سب کے لئے — تو نسیم صبح ہے غنچۂ مطلب کے لئے
تیرے ہی زیر قدم ہے خسروی کا افسری — دبدبہ قائم ہے تیرے دم سے شان قیصری
تیری پیروی سے پہنچے آدمی افلاک پر — سرکشی تجھ سے کرانی ہے بشر کو خاک پر
کنج آسایش میں گنج شائگاں تجھ سے ملے — عالم فانی میں عمر جاوداں تجھ سے ملے
تیرے دم سے نت نئی ایجاد ہے آفاق میں — تیرے ہر جلوہ کی ہر دم یاد ہے آفاق میں
خوش نصیبی شوکت و حشمت ترا انعام ہے — تیرا اک خادم ہے اقبال جسکا نام ہے
اہل عالم کے لئے تو مونس و غمخوار ہے — تیری ہی برکت سے یاں ہر اک کا بیڑا پار ہے
تیرا دامن جس نے تھاما وہ ٹھکانے لگ گیا — تیری پابوسی میں آیا یہاں منزل کا نشاں

تو ہے اک شانِ ید اللہ خلق کے ہر کام میں — فتح و نصرت ہے تری برکت سے ہر مہم میں

جو ترے باغِ معانی کی ہوا کھاتے نہیں

باغ عالم میں کبھی نشو و نما پاتے نہیں

اے چراغ بزمِ ہستی محفل آرائے جہاں — تجھ سے روشن ہے بیابانِ ہستی کا [illegible]

تو ہے اک شمع ہدایت راہِ حقیقت کے لئے — اک چراغ نور ہے تو اہلِ طریقت کے لئے

امتیازِ نیک و بد تیرے سوا ہوتی نہیں — تجھ سے محکم ہے جہاں میں رشتۂ دنیا و دیں

عاشقانِ حق کو تو ہے دیدۂ عین الیقیں — غاشیہ بردار ہیں تیرے جہاں میں ہر کہیں

تجھ سے ہے قائم جہاں میں عزت و شانِ بشر — وہ شجر ہے تو کہ ہے جس کا بہت میٹھا ثمر

تو ہے کانِ عقل و دانش مخزنِ حکمت ہے تو — زینتِ انساں ہے تو زیور ہے تو عزت ہے تو

باعثِ نازِ سخنور زینتِ اوراقِ سخن — تو ہے تجھ سے ہی فزوں ہے رونقِ ہر انجمن

فی الحقیقت نوعِ انساں کا تو اک استاد ہے — سچ تو یہ ہے تیری برکت سے جہاں آباد ہے

ہر کہ شد شیدائے حسنت عاقل و فرزانہ شد

سرکش از حکم تو در بزم جہاں دیوانہ شد

قطعہ

ظلم سے اُس بُت کے تنگ آیا تو دل سے یہ کہا — چھوڑ دے اُسکی محبت ہے بڑا وہ بے وفا

بلبل اک ہی جانور لیکن تجھے ہے عقل و فہم — حُسن مثلِ گل ہے دونوں کو نہیں اصلا بقا

وہ ستمگر ہے بڑا بے رحم ہے سفاک ہے
بے مروت ہے وہ بدخو ہے سراپا بیوفا

حسن تو جاتا رہیگا خاک میں ملجائے گا
دل لگائے آدمی اُس سے کہ جسکو ہو بقا

مجھ سے سُنکر یہ دل نے دیا مجھ کو جواب
نامِ صد افسوس اُلفت کا دیا تو نے مٹا

شاہراہِ عشق میں رکھا تھا جب تو نے قدم
تھی قسم کھائی ہمیشہ تو رہیگا باوفا

حُسن کی دیوی تو مالک ہے کرے جو چاہے وہ
اس کی ہر اک بات پر راضی رہے عاشق سدا

جانور تو بیوفائی پر وفا کرتا رہے
اور انساں بیوفائی کا کرے ہر دم گلا

گو وہ ظالم ہے ستمگر ہے ستم ایجاد ہے
یہ بھی تو دیکھو کہ ہے زہرہ جبیں مہ لقا

اور بقائے حسن سے کیا بحث ہے ہمکو عبث
یہ کسی کا شعر کیا تم نے نہیں اب تک سنا

شورِ بلبل کم نگردد گر رود گل از چمن
حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست

تازہ غزلیں

حافظ خدا ہی اب فلکِ فتنہ گر کا ہے
کچھ اور قصد آہ قیامت اثر کا ہے

سر پھوڑنے کا قصد ہر آشفتہ سر کا ہے
حافظ خدا ہی آج ترے سنگِ در کا ہے

ظاہر ہے حسن و عشق کا آپس میں ارتباط
میرا تنِ نزار جواب اس کمر کا ہے

آشوبِ حشر کہتے ہیں جسکو وہ ہے نہ ہو
فتنہ اُٹھا ہوا کوئی اس رہگذر کا ہے

بیٹھے ہیں دیکھنے کو ترے کوچے غیر ہیں
لیجاتے ہیں کہ راستہ یہ میرے گھر کا ہے

کیونکر نہ بدگماں ہوں لیتے ہی مجھ سے خط
کچھ رخ پھرا ہوا سا مرے نامہ بر کا ہے

اُس بے خبر کو دے خبر اے آرزوئے مرگ
مہماں مریضِ ہجر ترا رات بھر کا ہے

اٹلی کے مال کو بائیکاٹ

اور

مظلومانِ طرابلس فنڈ کی مدد

ہم نے عہد کر لیا ہے کہ آئندہ اٹلی کا مال ہرگز ہرگز نہ منگائیں گے۔ ایک بہت بڑا آرڈر جو اٹلی کی ٹوپیوں کا دے چکے ہیں۔ اُسے ہم نے کینسل کر دیا ہے۔ نیز ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہماری مشہور و معروف ترکی ٹوپیوں (محسن الملک پیٹنٹ و وقار الملک پیٹنٹ ساختہ **کوسٹی لنڈن**) کی جس قدر بکری یکم **نومبر** سے تا اختتام جنگ ہوگی اُس میں سے فی ٹوپی چار آنے (۴) مصیبت زدگانِ طرابلس فنڈ کے لئے نذر کریں گے۔

محسن الملک پیٹنٹ استر تمام ولایتی چمڑے کا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر ٹوپی دستیاب ہونی محال ہے۔ **قیمت** مع پھندنا استنبولی اعلیٰ قسم ۸ [illegible]

وقار الملک پیٹنٹ بشرح [illegible] آراستہ ریشمی کپڑے کا اور کناروں پر چکنائی سے حفاظت کے لئے چمڑے کی پٹی۔ **قیمت** مع پھندنا استنبولی اعلیٰ قسم [illegible]

تازہ مال آگیا ہے اور اس میں بہت رنگ اور سائز موجود ہیں۔ فرمائش کے ساتھ ناپ [illegible]

حجاز پر جانیوالوں کو اطلاع (سفر میں بہت وزنی ٹرنکوں اور صندوقوں سے کیا حاصل ہے، چمڑے کے ہینڈ بیگ۔ گلیڈسٹون بیگ اور کٹ بیگ) منگوالیجئے جن کا ہم نے دربار کی خاطر بہت سا تازہ سٹاک منگوایا ہوا ہے اور نرخ نہایت ارزاں کر دیا ہے۔

سردیوں کیلئے ہر قسم کا تازہ مال آگیا ہے۔ سوئٹر۔ بنیانیں۔ کمبل۔ موزے وغیرہ وغیرہ۔

(مفصل فہرست دکان مفت) **عبدالرشید برادرز۔ جنرل مرچنٹ و سٹیشنرز۔ انارکلی لاہور**

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

[illegible] ۔ مصنفہ مولوی سید محمد [illegible] فرہنگ صفحہ قیمت بلا محصول ڈاک ۱۲

اقبال و لہن ۔ مصنفہ مولوی محمد نشیر الدین احمد خاں قیمت قسم اول [illegible] قسم دوم [illegible]

خواب ہستی ۔ مرزا احمد سعید صاحب بی۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن [illegible]

ابو مسلم خراسانی ۔ بالا اقبال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے

مولوی محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے

سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے .... [illegible]

کلام نیرنگ ۔ غلام بھیک بی۔ اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن [illegible]

انتخاب مخزن ۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب ۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک ۔ [illegible]

[illegible] جالستان ۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی ۔ دہلی کی زبان میں دہلی کا سچا واقعہ [illegible]

دربار نمبر ۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا ہے ۔ [illegible]

مثنویات میر حسن ۔ مثنوی بینظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک قلمی نسخہ سے نقل کر کے شامل کی گئی ہے [illegible]

سیر تبت ۔ انگریزی کتاب [illegible] ان تبت کا بامحاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ [illegible]

مرقع خوشخطی ۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت سے ہندی بچوں، کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا۔ جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ سکتے ہیں ۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب نے اس کے اہتمام میں مدنظر رکھا ہے ۔ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کے واسطے اس وقت ملک میں موجود نہیں قیمت ۵

درخواستیں بنام مینیجر مخزن ۔ لاہور آنی چاہئیں

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - بیرسٹر ایٹ لا کا ریویو

ہندوستان کی اسلامی تاریخ مصنفہ مولوی کرم الٰہی صوفی پر

مخدوم و مکرم جناب مولوی کرم الٰہی صاحب! السلام علیکم۔ میں نے آپکی کتاب "اسلامی تاریخ عہد افغانیہ" شروع سے لیکر آخر تک پڑھی ہے۔ یہ کتاب نہایت برمحل لکھی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلم اسکی بہت قدر کرینگے۔ تاریخی تحقیق کے اعتبار سے دیکھا جاوے تو اکثر مقامات اس کتاب کے قابل داد ہیں اور آپکی قوتِ استدلال اور درایت تاریخی کو ثابت کرنیکے علاوہ اس بات پر نہایت قوی حجت ہے کہ ہندوستانی مسلموں میں مذاقِ تاریخ نویسی ابتک معدوم نہیں ہوا اور ابھی قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی تاریخ کو غیر اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے واقعات کو مورخانہ نگاہ سے دیکھنے والے لوگ اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر انکے علاوہ عام پڑھنے والے لوگ اور بالخصوص مسلم جنکی قومی روایات کی یہ کتاب ایک نہایت روشن اور صحیح تصویر ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اخلاقِ فاضلہ کے وہ گراں قدر اصول سیکھ سکتے ہیں۔ جو ان کی قوم کی ابتدائی تاریخ سے عیاں ہیں اور جنپر عمل کرنے سے حجاز کے صحرا نشین تیس برس کے اندر شتربانی سے جہانبانی تک پہنچکر اقوامِ قدیمہ کی تہذیب کے وارث اور تہذیب جدیدہ کے بانی بنگئے۔ تاریخ کا مقصد اگر اخلاقی ہے اور میرے خیال میں تاریخ کا یہی مقصد ہونا چاہئے، تو آپ کی تصنیف اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے اور میں بحیثیت ایک مسلم ہونیکے آپکا شکرگذار ہوں کہ آپنے یہ کتاب عین ضرورت کے موقع پر لکھ کر اپنی قوم پر احسان کیا۔ قومیت کا احساس جسکو بالفاظ دیگر قومی خودداری کہنا چاہئے۔ قومی زندگی کے لئے ضروری ہے اور جن وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے وہ بھی قومی حیات کیلئے ضروریات میں سے ہیں۔ پس اس اعتبار سے آپکی کتاب کا مطالعہ ہر مسلم پر واجب ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں ہر مسلم خاندان اس کتاب کے پڑھنے سے مستفیض ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپکو آپکی محنت اور جانکاہی کا اجر دے اور بہترین انعام آپکو اس مقدس رسول کی بارگاہ سے ملے جسکے کام سے بنی نوعِ انسان کی نجات اور جس کے نام سے ہماری قومیت وابستہ ہے۔ والسلام

آپکا خادم محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا

نوٹ:- کتاب مولوی کرم الٰہی صاحب صوفی۔ ٹونگہ ضلع گجرات سے مل سکتی ہے

و

چھپکر تیار ہے
خیالستان
یعنی
سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے کی مصنفہ قصوں اور مضامین کا مجموعہ
یہ کتاب پونے چار سو صفحوں سے زیادہ حجم کی چھوٹی خوبصورت تقطیع پر نہایت خوش قلم چھپی ہے۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ سرورق کا کاغذ سفید ولایتی جس پر سرخ و سبز رنگ کے بیل بوٹے ہیں۔
ایک مختصر سی تمہید جناب میر نیرنگ صاحب بی۔اے نے لکھکر اس دلچسپ مجموعہ کے کتاب کی صورت میں پیش ہونے کی ضرورت ظاہر کی ہے۔
سید سجاد حیدر صاحب کے اچھوتے مضامین جس قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں محتاج بیان نہیں۔ صرف مثال کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض اوقات ایسی فرمائشیں آتی رہی ہیں کہ
"مخزن کا ایک پرانا پرچہ جس میں صاحب موصوف کا فلاں مضمون تھا تلاش کر کے ایک روپیہ کا وی۔پی کر دیجئے"
اب ان کے وہ سب مضامین جو مخزن میں نکلے ہیں اور دیگر مضامین جو اردو رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں یکجا نہایت اہتمام اور خوبصورتی سے چھپے ہوئے ہدیہ ناظرین ہیں شائقین جلد منگوائیں۔
قیمت ـــــ علاوہ محصول ۱۲؍
منیجر رسالہ مخزن میکلگن روڈ۔ لاہور

التماس
اگر بجز نمبر خریداری جو ہر ایک پرچہ کی پشت پر ہوتا ہے
نام خریداری خط و کتابت میں ضرور لکھا کریں ورنہ تعمیل
نہ ہونے کی شکایت معاف!
ہمارے صیغہ میں نام القاب یا مقام کی جو غلطی ہو اس کی اصلاح
کے لئے فوراً اطلاع دیں۔ عنایت ہوگی
مینیجر مخزن

اب حیرت میں ہوں کہ قدما کے علم نجوم اور تصورات و تصدیقات متعلقہ
اجرام سماوی کا نقشہ کھینچوں۔ یا فلاسفۂ یونان اور مسئلہ الواحد
لا یصدر عنہ الا الواحد کا ذکر چھیڑوں کہ کیونکر علت العلل سے
اول عقل اول صادر ہوا۔ پھر عقل اول نے فلک اول اور عقل ثانی
کو پیدا کیا۔ عقل ثانی نے آسمان ثانی اور عقل ثالث کو پیدا کیا علیٰ ہٰذا
القیاس عشرہ اور سبع یعنی تسع سماوات کا بیان کروں جو ان کے
خیال میں شفاف مادی کرے ہیں۔ جن میں نجوم لامعہ کے جواہر
جڑے ہیں۔ اور آپ کے سامنے بلا خرق و التیام گھومتے ہیں۔
نہیں بلکہ چکر لگا رہے ہیں اور اپنی تاثیرات سے اہل زمین نہ فقط
ابن آدم بلکہ جملہ حیوانات و نباتات و جمادات تک کو متاثر کر رہے
ہیں۔ یا بسائط و مرکبات اور مقولات عشر کی گرہ کھولوں اور بتاؤں
کہ ہیولیٰ کیا ہے۔ اجرام علوی و سفلی کے قوام میں اس کا کیا دخل
ہے۔ یا یہ بیان کروں کہ کیونکر قدمائے ہند نے انسان کے نام
اور سماوی اجرام میں پیوند لگایا۔ میکھ۔ برکھ۔ متھن۔ کرک۔ سنگھ۔
کنیا۔ تلا۔ برچھک۔ دھن۔ مکر۔ کنبھ۔ مین۔ بارہ راشیوں کا
بیان کروں یا نکشتر۔ اسونی۔ بھرنی۔ کرتکا۔ روہنی۔ مرگسرا۔ ادرا۔
پونربس۔ پوکھ۔ اشلیکھا۔ مگھا۔ پوربا۔ اوترا۔ ہست۔ چترا۔
سواتی۔ بسیاکھا۔ انورادھا۔ جیشٹھا۔ مول۔ پورباکھاڑ۔ اتراکھاڑ۔
سرون۔ دھنشٹا۔ ست بکھا۔ پوربا بھدرا۔ اوترا بھدرا۔ ریوتی
کا حال سناؤں۔ یا حال کی اسٹرانومی کی طرف توجہ کروں کہ حکمائے
یورپ اور ہندسہ دانان گرینچ۔ ڈنک سوٹینا وغیرہ بڑی بڑی

رصدگاہوں میں کیا کیا باتیں نکال رہے ہیں۔ آسمان ہوا ہوکر اڑ گئے۔ زمین چپٹی سے گول ہوگئی۔ آلات رصد نے آسمانی دنیا میں عجیب وغریب انکشاف کئے اور کن کن پرانے دقیانوسی خیالات کا قلع قمع ہوچکا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

مجبورا چونکہ اِس ۱۵-۲۰ منٹ کے لئے کچھ نہ کچھ آپ حضرات کے سامنے عرض کرنا ہے۔ لہذا صرف چند ایسی باتیں جو موجودہ تحقیق سے ثابت ہوچکی ہیں اور جن پر ایک زمانہ ایمان لاچکا ہے۔ عام فہم طریقہ پر پیش کرونگا تاکہ اردو دان پبلک کچھ نہ کچھ سمجھ سکے۔ لیکن جس قدر اب بیان ہوگا وہ تمہید سے بڑھکر قدر وقیمت نہیں رکھتا۔ اسی مضمون پر بندہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔ آج صرف نظام شمسی کے مدار آفتاب شرربار کے متعلق دو تین باتیں عرض کرنے پر اکتفا کرونگا۔ اگر آپ نے اسے پسند فرمایا تو آئندہ اسی طریق پر قمر عطارد زہرہ مریخ مشتری زحل یورینس اور نیپٹیون کے متعلق بھی گذارش سے دریغ نہ ہوگا۔ افسوس ہے اگر میجک لنٹرن (جادو کی لالٹین) کا انتظام ہوسکتا تو نقشہ جات وغیرہ دکھا کر وہ باتیں بھی عرض کرسکتا جن سے اب قاصر ہوں۔

آفتاب عالمتاب

[illegible] کیا روشن نام ہے سحر خوبی اور کاسۂ تدین کی طرح غم خشک [illegible] تیر طلب کی شعاعوں کا ہاتھ بڑھا کر جہان کو اپنے سیال زر سے [illegible]مال کرنے لگا - فیاضی و زر نوازی اسے کہتے ہیں جدھر دیکھو اس فیاض کا ہاتھ ہر در و دیوار شجر و حجر دشت و جبل کو طلائی جامہ پہنا رہا ہے - نہر زرافشاں بن گئی جس پہ چناب کے رنگا رنگ موتی اپنی گوہر کاریاں دکھا رہے ہیں قدرت آسمان نے بھی جو صبح کے بادلوں کا دوشالا کندھے پر لئے ہے اس نووارد کی حالت سے حریر و پرنیان کے لباس پہن لئے - آفتاب کا مسافر نہ فقط سونے کا امڈتا ہوا دریا اپنی گرہ میں لایا ہے - بلکہ آب حیات کا سرچشمہ اسی کے انگشت شعاع سے رواں ہوتا ہے -

آفتاب کی قدر ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا ہو سکتی ہے - ہمارے جسم کا بال بال اس کے احسان سے بندھا ہوا ہے - وہ کونسا وقت ہے جب ہم اس سرچشمۂ حیات سے فیضیاب نہیں ہوتے ؟ آپ میرے اس فقرہ کو مبالغہ پر محمول نہ کریں - اس کا حرف حرف قانون قدرت کی کتاب میں درج ہے - انسان کا دارومدار کارپردازان قضا و قدر نے سورج پر ہی رکھا ہے - آپ پوچھینگے - خیر مان لیا کہ دن کو ہم حرارت آفتاب اور اس کی ضو سے کام لیتے ہیں - مگر سورج فقط دن کا بادشاہ ہے - رات کو ہمیں اس سے کیا فائدہ پہنچتا ہے ؟ اس کا جواب اول تو یہ کہ

رات کی چاندنی اسی آفتاب کی وجہ سے ہے۔ سورج کی روشنی گو وہ افق سے بہت
نیچے ہوتا ہے اور ہم اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ قمر پر پڑتی ہے اور اس کا انعکاس
پھر زمین پر آتا ہے۔ اور یہی چاندنی ہے۔ مگر اس کو بھی جانے دیجیے۔ فرض
کر لیجیے۔ موسم سرما کی لمبی ٹھنڈی راتیں ہیں۔ شب تار شب دیجور ہے۔ آسمان
پر بادل گھرے ہیں اور آپ دوشالا اوڑھے۔ کواڑ بند کئے۔ انگیٹھی کے
سامنے بال بچوں سمیت سردی کا بھوت اتارنے کی فکر میں ہیں۔ دسترخوان
پر گرم گرم چائے اور نان خطائی دھری ہے اور آپ بچوں کی پیاری پیاری
بھولی بھولی باتیں سن سن کر جی کو خوش کر رہے ہیں۔ آپ فرمائینگے کہ تبلائے
اب حضرت آفتاب علیہ الرحمۃ کہاں ہیں اور سا ری فت اس بند کمرے اور اس
شب تار میں ہمیں ان کی ذات با صفات سے کیا فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔
ہاں یاد رہے اب بھی گو شب تار اور موسم سرما ہے مگر آپ ان کے احاطۂ کرم سے
باہر نہیں نکلے۔ سنیے ہم ثابت کئے دیتے ہیں۔

ذرا آگ کو روشن کیجیے اور ملاحظہ فرمائیے کیا گرم گرم دلخوش کن لو نکلتی
ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لو کوئلوں سے آتی اور یہ پتھر کے کوئلے کان سے نکل کر
آئے ہیں۔ جہاں سینکڑوں فیٹ زمین کے نیچے بہادر کان کنوں نے
جن کا دن شب تیرہ و تار سے کم نہیں۔ ان کو کھود کر ڈھیر کیا اور سٹیم انجن کی
محنت نے سطح زمین پر ابھارا اور ریل گاڑیوں نے کشاں کشاں آپ کے
مکان تک پہنچایا۔ آپ پوچھینگے کہ کوئلوں کو آفتاب سے کیا تعلق؟ سنئے
حضرت! آنکھوں پر خوردبین لگائیے اور ان کوئلوں کو ملاحظہ کیجیے معلوم ہوگا
کہ ان کی بناوٹ پتھر کی سی نہیں بلکہ یہ کوئلے بھی درختوں اور پودوں سے
بنے ہیں۔ ان کے رگ و ریشے صاف ظاہر کرتے ہیں کہ یہ کسی نرم نرم تازہ پھول

دیکھئے کیسی نرم نرم تھی آغازِ بہار کی کونپل کیسی سایہ دار درخت کے پتوں۔
کی زیبائش بخشنے والی شاخوں دیودار اور پیپل کے سے درختوں کی جو کہ
یعنی جن ایسی یادگار رہے ہیں۔ جو کئی ہزار برس پہلے زمانہ ماضی میں کسی آبادی یا
جنگل میں جو زمانوں کے لئے فردوسِ نظر تھے۔ میری طرف حیرت سے نہ دیکھیے
میرے خیال سے۔ طبقات الارض یوں رقمطراز ہیں:-
اس جگہ جہاں کوئلہ کی کان موجود ہے یہاں کسی زمانے میں ایک وسیع
جنگل آباد تھا۔ تو وہاں بہت سے درخت آفتاب اس کے پتوں کی حرارت سے تواضع
کیا کرتے تھے حشرات الارض و دیگر جانوران جنگل کی غربا نوازی سے مستفید
ہوا کرتے تھے۔

اپنے وقت پر یہ بھی گر گئے اور دوسرے درخت ان کی جگہ پیدا
ہو گئے۔ ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اسی طرح کئی قرن گزر گئے اور پتوں پھولوں
اور میووں کے ڈھیر لگ گئے۔ پاس ہی سمندر تھا اور تب ایک انقلاب
عظیم واقع ہوا۔

آپ کو یاد رہے کہ زمین ہماری کی ساری ایسی ہی ٹھوس نہیں جیسی کہ یہ
معلوم ہوتی ہے بلکہ علمائے طبقات الارض (جیالوجی) نے ثابت کیا ہے
کہ نیچے سیال مادے کے طبقات ہیں۔ جن پر یہ ہماری خشک زمین اور
سمندر بعینہ ایسے ہیں جیسے اُبلتے ہوئے دودھ پر بالائی اسی اندرونی
سیال مادے کی وجہ سے یہ بھونچال آیا کرتے ہیں۔ کوہ آتش فشاں پھٹا
کرتے ہیں۔ زمین کہیں نیچے ہو جاتی ہے کہیں اوپر۔ اور زمانے کے ہر حصہ
میں یہ انقلاب جاری رہتا ہے۔ غرض اسی انقلاب کی وجہ سے وہی زمین
جس پر جنگل آباد تھا آہستہ آہستہ نیچے ہوتی گئی اور سمندر اس پر آتا گیا تا آنکہ

تمام جنگل پر پانی پھر گیا اور یہ گلی سڑی نباتات سمندر کی تہ میں جا لگی - اب دوسرا دور شروع ہوا -

سمندر میں دریا اور ندی نالے گر گر اپنے ساتھ کیچڑ لانے لگے اور کیچڑ سمندر کی تہ پر جہاں یہ نباتاتی ذخائر پڑے ہوئے تھے تہ در تہ جمتا گیا - صدیاں گذر گئیں اور یہ تہیں سخت ہو گئیں اور چٹان بن گئیں جن کے بوجھ سے نیچے کے نباتی ذخائر دب کر سخت ہو گئے اور ان کی رنگت سیاہ ہو گئی - اب تیسرا دور شروع ہوا -

خدا کی قدرت ہے - ہر زوال را کمال - سمندر کی تہ کو آہستہ آہستہ نیچے جاتے سینکڑوں سال گذر گئے پرانے جنگل پر اب چٹان بن چکے ہیں اور ان پر سمندر کی لہریں موجیں مار رہی ہیں لیکن اب صعود کا زمانہ شروع ہوا - تا آنکہ اوپر کا حصہ پھر سطحِ آب سے باہر نکل آیا - اب وہی پرانے جنگلات کے ذخائر گڑوں نیچے ہیں - ان پر چٹان اور ان پر اور ہی سرزمین ہے - جس پر اب نئے پھل پھول نکلے ہیں - آدمی بھی اس کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر وہیں آباد ہو گیا اور اس کے قدموں کے نیچے وہی ہزاروں سال کی نباتی باقیات کوئلوں کی صورت میں مدفون ہیں جنکو وہ اپنی جانفشانی سے کھودتا اور استعمال کرتا ہے -

یہ جنگل جسکو ہزاروں برس کی گردشِ روزگار نے کیا سے کیا بنا دیا جس وقت شروع شروع میں سرسبزی اور شادابی کی لہریں لیتا تھا - اس وقت تمازت و حدتِ آفتاب ہی سے اس کے رگ و ریشے میں خون دوڑتا تھا - اور گرمی اور روشنی اس کے ذرہ ذرہ میں سرایت کر گئی تھی - یہی گرمی اور روشنی اس ابنِ قدرت نے حضرتِ انسان کے لئے اپنے اندر جمع رکھی ہے اور

سمندر انقلابات بھی اس سے چھین سکے۔ آج جب آپ اس کوئلے کو پھر آگ پہ رکھتے ہیں۔ تو یہ کوئلہ وہی پہلی حرارت اور روشنی جو اس میں حضرتِ آفتاب نے ودیعت رکھی تھی۔ آپ کے ٹھنڈے اور اندھیرے کمرے میں پیش کرتا ہے۔ تاکہ آپ اپنے سرد ہاتھوں کو سینکیں۔ گرم کھانے تیار کریں اور شکرِ حق بجا لائیں۔ غرض اس آگ کو آگ نہ کہئے۔ یہ سالوں کی دھوپ ہے جس کا منبع اور سرچشمہ چشمۂ آفتاب ہی ہے۔

آفتاب نے نہ فقط آگ آپ کے گرمانے کے لئے پیش کی۔ بلکہ چائے سے بھی آپ کی تواضع کی ہے۔ آپ تو چائے اب پکا رہے ہیں حضرتِ آفتاب اسی چائے کو آپ سے پہلے چین میں پکاتے رہے ہیں یعنی اس وقت جب اس کا پودا زمین سے نکلا تھا انہوں نے اپنی کرنوں سے اس میں حرارت ڈال ڈال کر یہی خواص جن سے اب آپ مستفیض ہو رہے ہیں اس میں پیدا کر دیئے تھے۔

پھر نہ فقط یہ چائے کے پتے آپ کے لئے آفتاب نے پکائے بلکہ اُن جہازوں کو بھی یہی حضرت آفتاب کھینچ کر لائے۔ جن میں یہ چائے دیگر ممالک کو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ جہاز کچھ تو سٹیم کی مدد سے چلتے ہیں اور کچھ بادبانوں کی ناخدائی سے۔ آپ فرمائینگے۔ ان بادبانوں کو تو ہوا کے جھونکوں نے دھکیلا آفتاب کا ہاتھ کہاں سے آیا؟ میں تسلیم کرتا ہوں لیکن یہ تو فرمائیے۔ ہوا میں حرکت پیدا ہوئی تو کیونکر؟ سُنئے۔

زمین حرارتِ آفتاب سے گرم ہوئی اور اس لئے وہ ہوا جو اس کے اوپر تھی وہ گرم ہو کر اوپر کو اٹھی۔ اب خلا تو رہ نہیں سکتا۔ اِدھر اُدھر کی ہوا بڑھ بڑھ کر اس کی جگہ لینے کے لئے تیار ہو گئی۔ جو خلا اِدھر اُدھر کی ہوائیں آگئے

بڑھنے سے پیدا ہوا۔ اس کی جگہ پوری کرنے کے لئے اور ہوائیں بڑھیں۔ غرضکہ اسی طرح ایک سلسلہ اور دَور شروع ہو گیا۔ جس کو آپ آندھی کہیں یا بادِ شمال کہیں۔ بادِ سموم کہیں۔ بادِ بہاری کہیں۔ یا جیسا فائدہ یا نقصان آپکو اس سے ہوتا ہو ویسا اس کا نام رکھ لیں۔ غرضکہ جہازوں کی آمدورفت کا مدار بھی اسی سورج پر ہی رہا۔

اور لیجئے گرم پانی کا بھی سورج ہی سے تعلق ہے۔ پانی گرم ہوا کیتلی میں۔ کیتلی گرم ہوئی۔ آگ پر۔ آگ میں حرارت آئی کوئلوں سے۔ کوئلوں میں آفتاب عالمتاب ہے۔

خود پانی ہی کو لیجئے۔ آپ کہینگے یہ تو پائپ سے ہی آیا ہے لیکن پائپ میں کہاں سے آیا؟ پائپ میں واٹر ورکس سے۔ واٹر ورکس میں دریا سے۔ دریا میں پہاڑوں کی برف پگھلنے سے۔ جنکو حضرت آفتاب نے پگھلایا۔ ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے کہ دریا میں پانی بارش کا آیا۔ بارش کا پانی بادلوں سے۔ لیکن بادل بھی تو بخارے ہیں جو سمندر سے اُٹھے اور کیونکر اُٹھے؟ صاف ہے کہ سورج کی گرمی سے اب یہی پانی جو پہلے سمندر میں تھا پھر سمندر ہی کو جا رہا ہے اور رستہ میں کچھ تھوڑا سا آپ کی کیتلی میں جانے کے کام بھی آگیا۔ قدرت کے کارندے یوں کام کر رہے ہیں آپ کہینگے خیر چلئے کی تواضع تو آفتاب نے کی۔ اب رہی نان خطائی یہ تو آٹے کی بنی ہوئی۔ شکر ہے حضرت آفتاب کی کرنوں کی تو نہیں۔ مگر ذرا صبر کیجئے آپ ابھی پورے پورے حضرت آفتاب ہی کے مہمان ثابت ہوئے جاتے ہیں۔

پھر وہی دَور شروع ہوتا ہے۔ نان خطائی تو آگ پر پکی اور آگ میں حرارت کوئلوں سے آئی اور کوئلوں میں آفتاب سے۔ مگر صرف اسی قدر نہیں گندم کو

بھی سورج ہی نے پکایا اور یہ آٹا بھی سورج ہی نے پیسا۔ آپ فرمائینگے یہ کیونکر؟
جواب یہ ہے کہ آخر پسنہاری نے کہاں پیسا؟ پن چکی میں۔ ہوائی چکی
میں مشین فلاور مل میں؟ یا اور نہیں تو اسی پرانی دقیانوسی دو پاٹ
کی چکی میں جسے ہاتھ سے چلاتے ہیں۔ پن چکی کے لئے جیسا بیان ہو چکا
دریا یا نہر میں پانی آفتاب نے چلایا۔ ہوائی چکی کے لئے ہوا کو حرکت
آفتاب نے دی۔ مشین میں کوئلوں کی گرمی آفتاب کی وجہ سے آئی اور
لیجے۔ اگر آپ ہاتھ ہی سے چکی چلاتے ہیں۔ تو آپ کے بازو میں سکت
کہاں سے آئی۔ ظاہر ہے کہ روٹی کھانے سے اب اناج کو کس نے پکایا
ظاہر ہے کہ اسی آفتاب نے۔ غرض حضرت آفتاب کا کرم اس قدر وسیع
ہے کہ آپ کہیں بھی اس کے احاطۂ کرم سے باہر نکل نہیں سکتے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرطِ انصاف نہ باشد کہ تو فرمان نبری

اب ایسے بڑے سخی کا گھر دریافت کرنا چاہیئے۔ کہ ہم سے کس قدر فاصلہ
پر ہے؟ اس کے متعلق سُنئے سورج کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ
ہے کہ اس کا پورا اندازہ لگانا ذرا مشکل کام ہے۔ یہاں سے کھڑے
ہو کر اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ سامنے سڑک پر کا درخت ہم سے کس قدر
دور ہے تو اندازہ یوں لگائینگے۔ کہ محمڈن ہال اتنے فیٹ لمبا ہے اس کے
آگے پلیٹ فارم اس قدر چوڑا ہے اور اس کے آگے سڑک اس قدر
لہٰذا درخت کا فاصلہ ہم سے اس قدر ہوا۔ لیکن آفتاب کی طرف نظر
اُٹھایئے تو راستہ میں کوئی شے حائل معلوم نہیں دیتی۔ نہ نظر کو کچھ
منازل طے کرنے پڑتے ہیں۔ پس بداہتاً آفتاب کا فاصلہ دریافت

کرنا محال معلوم ہوتا ہے۔ مگر آجکل کے ریاضی دان ایسی مشکل کو مشکل سمجھتے ہی نہیں۔ انہوں نے ایسے طریق نکالے ہیں کہ یہیں سے بیٹھے بیٹھے تمام جائزہ لے آتے ہیں۔ اور ایسے صحیح نتائج نکالے ہیں گویا جریب سے پیمائش کی ہے۔ وہ اس طرح کہ علم مثلث (Trigonometry) کے اصول کے مطابق اگر ایک مثلث کا قاعدہ اور دو زاویہ معلوم ہو جائیں تو باقی اضلاع دریافت کرنا کوئی مشکل بات نہیں

اب فرض کیجئے ایک شخص شاہی مسجد کے مینار پر کھڑا ہے اور ہم دو شخص پریڈ میں ٹہل رہے ہیں۔ تو ہیں سے کھڑے کھڑے ہم اس کا فاصلہ اور مینار کی بلندی دریافت کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح پر کہ ہم دُور دُور کھڑے ہو کر آپس میں کا فاصلہ ناپ لیتے ہیں اور پھر وہ زاویئے ناپ لیتے ہیں۔ جو اس فاصلے کے ساتھ ہماری پتلی اور مینار کی چوٹی کا خط بناتے ہیں بس ایک قاعدہ اور دو زاویئے معلوم ہو گئے۔ اب سب کچھ نکل سکتا ہے۔ یہ زاویئے معلوم کرنے بھی مشکل نہیں۔ اور نہیں تو معمولی موٹے کاغذ سے قینچی کے ساتھ ذرا ہوشیاری سے کاٹے جا سکتے ہیں۔ غرضکہ اسی قسم کی تدابیر سے مغربی نجومیوں نے سورج کا فاصلہ دریافت کر لیا ہے دو نجومی مل گئے اور زمین کے مختلف حصص پر سے ایک ہی وقت حساب لگایا اور سوال حل ہو گیا۔ اور نہ فقط ایک طریق سے بلکہ ہزاروں مختلف صورتوں سے وہی نتائج مترتب ہوئے۔ پس صحت کا یقین لازمی امر ہے۔

سورج کا فاصلہ زمین سے کم و بیش ۹ کروڑ تیس لاکھ میل کا ثابت ہوا ہے۔ اس عدد کو دیکھئے۔ کتنا بڑا ہے مگر پورا اندازہ لگانے کے لئے اس گھڑی کو ملاحظہ کیجئے۔ کوئی آئے کوئی جائے یہ اپنی ٹِک ٹِک برابر کئے

جا رہی ہے۔ ایک دو تین چار۔ پانچ چھ..... ایک منٹ میں ساٹھ دفعہ آواز دیگی۔ دیکھئے کیسے جلدی جلدی آواز دے رہی ہے۔ ایک گھنٹہ میں ۳۶۰۰ دفعہ ایک دن رات میں ۲۴×۳۶۰۰ دفعہ غرض اسی طرح حساب کرتے جائیے ۹ کروڑ تیس لاکھ بار صرف ٹک ٹک کرنے کے لیئے ۳ سال سے زیادہ چاہئیں۔ گویا اب سے آپ گننے بیٹھ جائیے اور دن رات تین سال کے دراز عرصہ تک نہیں بیٹھے گنتے جائیے جتنی دفعہ یہ گھڑی اتنے عرصہ میں ٹک ٹک کرے گی۔ حضرت آفتاب آپ سے اتنے ہی میلوں کے فاصلہ پر ہیں۔ یا یوں سمجھئے آپ روز بمبئی میل اور کلکتہ میل پہ سوار ہوتے ہیں اور کس قدر تیزی کے ساتھ سفر کرسکتے ہیں۔ آپ بعض دفعہ ۶۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے راستہ طے کرتے ہیں۔ فرض کر لیجئے ایک آفتاب میل تیار ہوتی ہے اور آپ بجائے بمبئی اور کلکتہ کے چشمۂ آفتاب کی طرف جانے کو ۶۰ میل فی گھنٹہ کے حساب سے جانا شروع کرتے ہیں۔ اگر یہ ریل دن رات چلتی رہے اور کہیں نہ ٹھہرے تو آپ سال بھر میں ۵،۲۵،۶۰۰ لاکھ میل طے کرینگے۔ اب ۹ کروڑ تیس لاکھ میل طے کرنے کے لئے آپ کو ۱۷۶ سال سے زیادہ سفر کرنا چاہیئے تب آپ کہیں آفتاب کے کنارے کو چھو سکتے ہیں۔ محمد شاہ رنگیلا اگر نادر شاہ سے بھاگ کر ایسی ریل میں سوار ہوجاتا اور ۶۰ میل فی گھنٹہ سفر کرتا رہتا تو شاید آج آفتاب تک پہنچ جاتا۔

اب خیال فرمایئے کہ اگر بادشاہی مسجد لاہور کے مینار پر آدمی کھڑے ہوں تو نیچے سے بالکل بالشتیے نظر آتے ہیں۔ وہ پہاڑ جس کے دامن میں کھڑے ہونے سے اُن کی چوٹیاں فلک سے لگی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر انہیں

تین چار میل سے دیکھا جائے تو بمشکل کنارہ افق کو ڈھانپ سکینگے۔ لہذا کوئی چیز جتنی دور ہو اُسی قدر وہ چھوٹی معلوم دیتی ہے۔ پس آفتاب جو ہم سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل کے فاصلہ پر ایک طاس کے برابر نظر آتا ہے اس کا حجم کس قدر ہوگا؟ جب اسٹرانومر (نجومی) حساب لگاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سُورج بہت بڑی چیز ہے۔ معلوم تو ایک چپاتی جتنا ہوتا ہے لیکن سارے محمڈن ہال سے بڑا ہے بلکہ سارے لاہور سے نہیں۔ سارے پنجاب سے نہیں سارے ہندوستان سے۔ بلکہ ساری دُنیا سے۔ ہماری زمین کا گولہ جب اس کا سورج سے مقابلہ کیا جائے تو یہ مقدار میں ہیچ نکلتا ہے۔ آپ حیران ہونگے اگر آپ کو بتایا جاتے کہ سورج اس قدر بڑا ہے کہ اگر ایک لاکھ کرے زمین کے کرے کی مانند ایک جا رکھے جائیں تب بھی وہ سب مل کر سورج کے کرے سے حجم میں کم ہی رہینگے۔ اگر سورج کا کرہ ایک فٹ بال کے برابر سمجھا جائے تو زمین بندوق کے چھرے کے ایک دانے کے بمشکل مطابق ہوسکتی ہے۔ فَسُبحانَ اللہِ عَمّا یَصِفُونَ ہ

اَے نادان انسان! ذرا ایک منٹ کے لئے سوچ تو کیا ناچیز ہستی ہے۔ بمقابلہ اُن قدرت کی مصنوعات کے کہ جن سے تو گھرا ہے۔ پہاڑوں کا ایک ایک پتھر تیری ہستی کو نابود کرنے کے لئے کافی ووافی ہے۔ پھر سوچ کہ تیری ہستی اس کرہ زمین کے سامنے محض صفر کے برابر ہے اور جب یہ سوچ چکے تو خیال کر کہ یہ دُنیا اُن اجرام سماوی کے سامنے پاسنگ کے برابر بھی نہیں جو تیرے سامنے لڑھکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تجھ جیسی لاکھوں جانیں تلف ہو جائیں تو جہان کو پرواہ نہ ہو اور تیری دُنیا جیسے لاکھوں اور کروڑوں گنتی دُنیائیں نابود ہو جائیں تو نظام عالم

ہیں کوئی تغیر معلوم نہ ہو۔ اس پر سوچ کر تیرا کبر تیرا غرور تیرا ہمچو من دیگرے نیست کس قدر ہے گویا معاذ اللہ تو اپنے تئیں خدا جانتا ہے۔ ہاں بیشک تو نہ اہی ہے لیکن تو اپنی خدائی کو فریب ہستی کے ہاتھوں لٹا چکا ہے۔ تجھے دنیاوی تعلقات اور حاجتوں کے ساتھ جھگڑے اور تنازعے ہی اتنی فرصت نہیں دیتے کہ تو اس وسیع برادری کی طرف توجہ کرے جو سماوی برادری ہے اور ان عجائبات کو دیکھے جو دن رات تیرے سامنے اپنے فرائض کے گیت گاتے ہوئے اچھلتے کودتے انکو انجام دیتے ہیں۔

خواجہ دل محمد صاحب دل ایم اے
پروفیسر اسلامیہ کالج۔ لاہور

نشترِ سخن علامہ ابو الفضل محمد احسان اللہ العباسی گورکھپوری۔ دنیائے تصنیف و تالیف میں اس قدر نامور بزرگ ہیں کہ ہمیں انکی تعریف سے استغنا ہے۔ اور انکا نام ہی کتاب کی خوبی کیلئے کافی ضمانت ہے۔ حال میں آپنے ایک ضخیم کتاب ۲۷۴ صفحوں کی نشتر سخن کے نام سے تالیف کی ہے۔ اس میں زبان اُردو کے نامور شعرا یا بانیوں کے کلام کا بہت ہی عمدہ انتخاب دیکر یہ دکھا دیا اور ثابت کر دکھایا ہے کہ عربی اور سنسکرت کی ایشیائی شاعری بہترین شاعری ہے۔ اور اُردو شاعری ان دونوں کے خرمن سے خوشہ چین بننے کی وجہ سے کمال اور حسن کے معراج پر پہنچ گئی ہے۔ دیباچہ میں زبانِ اُردو کی تاریخ پر نہایت محققانہ بحث کی ہے جو اس بات کے موافقین و مخالفین کی کشمکش کو دور کرنے میں بنہایت مفید ہو سکتی ہے۔ قیمت فی جلد دو روپیہ ہے۔ اور منشی سیتلا بخش صاحب شاکی لکھنوی گورکھپور۔ ممالک متحدہ سے درخواست کرنے پر مل سکتی ہے۔ **مینجر عباسی برادران**

کھیل

یہ مضمون ہمارے محترم قلمی معاون خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں صاحب ممبر مال۔ کونسل آف ریجنسی ریاست بہاولپور کے دماغ نکتہ آفرین اور قلم ندرت رقم کا نچیدہ ہے۔ اور ایسے ہی مضامین کی ملک کو ضرورت بھی ہے جن سے نئی نئی اُمنگوں کا اُبھار ہوتا اور دماغوں میں جدت کا نور پرتو فگن ہو سکتا ہے۔

قدرت نے مختلف اقسام کی اشیاء اور چیزیں پیدا کیں اور مختلف الوان او صور سے انہیں ترتیب دیا۔ تو کیوں؟ اس لئے کہ انسان جو مخلوقات عالم میں سب سے اشرف اور عجیب الخلقت ہے۔ اُن مصنوعات باری تعالیٰ سے عملی رنگ میں ہر نوع کے ذہنی۔ جسمانی اور روحانی۔ بلکہ ہر قسم کے حسی فوائد تک حاصل کرے اور اپنی ظاہری اور معنوی دونوں زندگیوں کے خوش آئند اور مفید بنانے میں کوشاں ہو۔

اگر ہم چشم غور سے دیکھیں تو جو کچھ ہمارے ارد گرد سجا سجایا سامان پایا جاتا ہے۔ یہ ہمارے واسطے ایک بہت بڑا دلچسپ سامان ہے۔ سرخ۔ سفید۔ زرد ارغوانی اور آسمانی رنگ کی مختلف الالوان چیزیں۔ حیوانات۔ نباتات۔ جمادات یہ ایک ایسا خوش آئند سامان ہے جس سے ہم مختلف صورتوں میں بشاشت اور فرحت حاصل کرتے ہیں۔ سماعت۔ بصارت۔ دماغ۔ ذہن۔ احساس اور دل اس سارے سامان سے ساعت بساعت بلا کسی معاوضہ کے جو حظ جو سرور اور فرحت حاصل کرتے یا پاتے ہیں۔ اگر اس کی قیمت اور معاوضہ لگایا جائے تو ایک بڑی بھاری رقم ہو سکتی ہے اور تسیر

بھی اس آسانی سے ان کا مہیا ہونا مشکل ہے۔

قدرت نے یہ کیوں کیا اور کیوں اس سامان کو ضروری سمجھا؟ اس واسطے کہ انسان کی زندگی اس کے بغیر کسی حد تک رائگاں اور دو بھر ہے۔ انسان خود بھی ایک مشغلہ ہے اور مشغلہ کا خواہاں بھی ہے۔ انسان کی زندگی شروع سے مشغلہ پسند ہے اور سلطان بھی۔ جاہل بھی اور ایک فلاسفر بھی۔ ایک رئیس بھی اور ایک زمیندار بھی۔ یہ کہا جائیگا کہ مشغلوں میں فرق ہے۔ لیکن نہیں یہ کہا جائیگا کہ کوئی ہستی مشغلہ سے خالی ہے۔ قدرت نے کس مقصد و مرکز پر یہ بنا رکھی ہے؟ صرف اس پر کہ سوائے ان مشاغل کے انسان کی زندگی محض بے لطف ہی نہ رہ جاتی۔ بلکہ اسباب صحت میں بھی گونہ کمی رہتی اور اس کی قوتوں اور جذبات میں وہ جدت نہ پیدا ہوتی۔ جس کی ضرورت ہے اور جس کے واسطے انسانی زندگی اور انسانی ہستی رشک مخلوقات بن رہی ہے

بچہ پیدا ہوتے ہی کوئی نہ کوئی مشغلہ چاہتا ہے۔ کبھی یہ مشغلہ خوشی اور فرحت سے پورا کرتا ہے اور کبھی کھیل اور ہنسی میں اور کبھی رو دھو کر اس منزل سے گذرتا ہے۔

کہتے ہیں جب کوئی بچہ کسی نہ کسی مشغلہ میں نہ ہو اور خاموشی سے وقت گذارے تو اس کے طبعی جذبات یا اس کی فطری حالت کی چلتی گاڑی میں ضرور کوئی نہ کوئی روڑا اٹک جاتا ہے۔ اس کا خاموش ہونا یا لا مشغلہ رہنا علامت ہے اس بات کی کہ اس کی طبیعت کسی نہ کسی وجہ سے کند ہوگئی ہے۔ اور اس میں کوئی نہ کوئی نقص آگیا ہے۔ بچہ بچپن میں جو حرکتیں کرتا ہے اور جن صورتوں میں اس کی الہڑ زندگی کے دن گذرتے ہیں وہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ انسان کہاں تک خوشی اور فرحت کا خواہاں ہے۔

اگرچہ انسانی زندگی کے ساتھ غم اور کلفت لازمی ہے۔ لیکن بایں ہمہ انسان ہمیشہ سرور اور خوشی کا خواہاں ہے۔ قدرت کی رعایات اور عنایت دیکھ کر انسان نے خود بھی اپنے واسطے سرور۔ خوشی۔ فرصت اور مسرت کے سامان پیدا کرنے میں کمی نہیں کی۔ یہاں تک کہ اس بیابان جنون میں وہ بہت کچھ دور تک چلا گیا ہے اور اس نے ان باتوں سے بجائے فوائد کے نقصان بھی اٹھائے ہیں۔ اس دھن میں بد قسمی سے ایسی ایسی منزلوں سے گذرا ہے کہ اصل منزل ہی بھول گیا یا پیچھے چھوڑ گیا۔

تمام قوموں اور سارے ملکوں میں کسی نہ کسی رنگ میں کھیلوں کا وجود ضرور پایا جاتا ہے اور لوگ کسی نہ کسی حد تک ان کے عادی ہیں۔ کوئی کسی رنگ میں اور کوئی کسی رنگ میں۔ جس سرزمین میں انسان گیا اور جہاں اس ہستی کے قدم پڑے وہاں ہی کوئی نہ کوئی کھیل یا تماشا مہیا کیا گیا۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ انسان طبعاً اس کا عادی اور خواہشمند ہے اور وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ اس کی خواہش مصنوعی یا عارضی نہیں ہے بلکہ یہ ایک طبعی خواہش ہے اور اس سے اس کی زندگی پر ایک خاص اثر پڑتا ہے اور اگر وہ اس سے تمام عمر خالی رہتا ہے تو اپنی زندگی کے واسطے ایک قسم کی برائی اور خرابی خود پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ کھیلوں اور تماشوں میں بہت کچھ خرابیاں اور اخلاقی برائیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن ہمیں بالذات اور نفس کھیل سے کبھی انکار نہیں کرنا چاہئے۔

بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ کھیل صرف ایک کھیل ہی۔ یعنی کھیل سے ایک فضول اور عبث حرکت یا حرکات مراد ہیں۔ یہ ایک برا پہلو لیا گیا ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض شخصوں نے کھیل کی صحیح فلسفی پر غور نہیں کیا۔
[illegible] سوچا نہیں کہ یہ ہے کیا! اور اس کی کیا ضرورت ہے۔ کھیل یعنی
کھیل یعنی فضول حرکات کے نہیں ہے بلکہ کھیل سے مراد وہ تفریح اور
[illegible] وہ فعل ہے جس سے انسانی زندگی کے کل اور پرزوں
[illegible] ایک قسم کی صحیح حرکت اور صحیح زور پیدا ہوتا ہے اور
انسان [illegible] اپنے دماغ اور دل میں ایک قسم کا تفریح کی مواد
جمع ہوتا یا مہیا کیا کرتا ہے۔ انسان کیوں اور کب کھیلنا چاہتا ہے۔
جب اس کی طبیعت پر کسی قسم کی اداسی۔ تردد۔ کاہلی، سستی
یا کلفت وغیرہ اور غالب ہو۔ جب وہ ایک لگاتار مصروفیت اور کام سے
تھک گیا ہو ... جب اس کا دماغ اور دل کام کرتے کرتے آرام کا خواہاں ہو
جب وہ ایک [illegible] حالت یا طاری کیفیت سے ایک دوسری قسم
کی آزادانہ کیفیت کا ضرورتاً متلاشی ہو۔

ان حالات میں کھیل کا نام دوسرے الفاظ میں ایک ایسا مشغلہ ہوا
ہو بجائے خود ایک کام بھی ہے لیکن اس میں بجائے تکان اور کلفت
کے ایک قسم کی آزادی اور سیر ہے اور دل و دماغ ایک خاص وقت
تک اسے پسند کرنے پر مجبور رہیں۔ کھیل سے بھی جب دل و دماغ اکتا
جاتے ہیں تو وہ بھی ایک کام اور پابندی ہو جاتا ہے اور اصل کام اور
مصروفیت سے جب انسان اکتا جاتا ہے اور کوئی کھیل چاہتا ہے تو
وہ کام بھی وبالِ جان ہو جاتا ہے۔ اس کی کلفت دور کرنے کے لئے
کوئی نہ کوئی کھیل تلاش ہوتا ہے۔ لگاتار کام اور مصروفیت میں
بدن ماندہ ہوتا اور تھک جاتا ہے اور بدن میں ہی نہیں بلکہ قوتوں

اور جذبات میں بھی ایک قسم کی ناتوانی اور کمزوری پیدا ہونے لگتی ہے لیکن مناسب حد تک کھیل سے بدن میں توانائی اور رونق آیا کرتی ہے اور قوتوں اور جذبات میں ایک قسم کی جدت ۔ صفائی مضبوطی ۔ روشنی اور طاقت پیدا ہوتی ہے ۔

جب کبھی انسان صبح سے شام تک کام کرتے کرتے انگڑائی یا جمائی لیکر اُٹھتا اور اِدھر اُدھر پھرتا چلتا ہے تو اس کی جان یا اس کی طبیعت ایک قسم کی طمانیت میں آجاتی ہے اور جب وہ کوئی خوش نما یا خوش آیند سماں دیکھتا ہے تو اس کو اور بھی آسائش ملتی اور اس کی کلفت دور ہوتی جاتی ہے ۔ کھیل کیا ہے ؟ یہ بدن کی جسمانی اور روحانی قوتوں اور بڑھنے اور گھٹنے والے جذبات کو سماعی ۔ بصری اور عملی نظاروں اور تصورات ، مشاہدات اور حرکات سے مستفید کر کے انہیں اپنے مرکز اور مواقع پر ٹھہرانے والا ہے اور وہ غذا ہے جو قدرت نے عملی رنگ میں انسان کے جذبات اور اعصاب کے واسطے خود اسی کی طبع میں ودیعت کر رکھی ہے ۔

ہر انسان اپنی ہی ذاتی نظر سے یہ معما ۔ آسانی سے حل کر سکتا ہے ۔ روزمرہ ورنہ ہفتہ میں ایک یا دو بار ضرور ہر انسان ایسے مشاہدات کرتا ہے کبھی کبھی ایک متردد اور پریشان انسان خوش آواز سنکر یکایک اپنی جان اپنے بدن اور اپنے خیالات کے سمندر میں ایک قسم کی ایسی خاص کیفیت اور تموج پاتا ہے کہ وہ اس کے غم زدہ اور افسردہ جذبات کے واسطے ایک مخصوص مشغلہ کی صورت میں کمال فرحت بخش اور آسائش دہ یا سرور انگیز ہوتا ہے ۔ بدن کے اعصاب میں ایک گرم جوشی اور امید آمیز حرکت پیدا ہوتی ہے اور انسان اپنے تئیں کسی اور ہی رنگ اور صورت میں پاتا ہے اس قسم کی تمام صورتیں اور واقعات ثابت کرتے ہیں کہ

اور یہ ورثہ ہمارے ملک یا ہماری قوموں میں صرف نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو ہی دیا گیا ہے۔ اس واسطے ان کی بابت کوئی صحیح مجموعہ ہماری زبانوں میں نہیں مل سکتا۔ یہ ایک عملی اور علمی نقص ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک کے کھیلوں میں کبھی کوئی ترمیم اور تجدید نہیں ہوتی اور دن بدن اُن کا مشغلہ موقوف اور ان کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے

صرف صوبہ پنجاب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے کوئی ۶۰ - ۷۰ کھیل ہونگے۔ اور اُن میں سے بعض کھیلوں نے نظام بدنی کے متعلق ایک ایک حکمت اور مفید کیفیت رکھی گئی ہے لیکن اُن کی صحیح تفصیل ایک مجموعہ میں بہت مشکل سے ملیگی - پنجاب میں جس قدر پُرانے کھیل پائے جاتے ہیں۔ وُہ مردوں اور عورتوں میں ایک نہایت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ تقسیم شدہ ہیں۔ یہاں جو کھیل مرد کھیلتے ہیں وُہ عورتیں نہیں کھیلتیں اور جو کھیل عورتیں کھیلتی ہیں انہیں مرد پسند نہیں کرتے یا وُہ اُن کے مناسب حال نہیں ہیں۔ مردوں کے کھیلوں میں طاقت - مزدور اور دوڑ دھوپ زیادہ ہے۔ جسے عورتیں پسند نہیں کرتی ہیں یا اُن میں پُوری نہیں اُتر سکتیں مرد عورتوں کے خاص کھیل اس واسطے بھی نہیں کھیلتے کہ اُن میں واقعی ایک قسم زنانہ پن پایا جاتا ہے اور بعض کھیل ایسے بھی ہیں۔ جو مشترکہ کھیے جا سکتے ہیں۔ کھیلوں کی کیفیتی تقسیم اور اس کی قسمیں حسب ذیل ہو سکتی ہیں:-

(الف) دماغی کھیل۔

(ب) جسمانی کھیل۔

(ج) عملی کھیل۔

(د) علمی کھیل۔

دماغی صرف وہ کھیل ہیں جن سے دماغ کو خاص تعلق ہو اور سوائے دماغ سوزی کے ان کی تکمیل نہ ہو سکے جسمانی کھیلوں میں دماغ سوزی کم ہوتی ہے لیکن دوڑ اور طاقت یا حرکات کا زیادہ خرچ ہوتا ہے۔

دماغی کھیلوں میں کفایت اور حکمت پر بحث ہوتی ہے۔

عملی کھیلوں میں عمل اور پابندی واجبات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ غرضیکہ چاہے کسی قسم کا کھیل ہو۔ ہر کھیل ایک تفریح اور ایک نتیجہ ضرور رکھتا ہے۔ تفریح کے لحاظ سے وہ دل و دماغ پر اثر کرتا ہے اور نتیجہ کے اعتبار سے جسم اور ضروریات جسمانی پر موثر ہوتا ہے۔ کوئی کھیل ان دونوں مواد سے خالی نہیں۔ اور اگر کوئی کھیل ان امور سے خالی ہے تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ وہ ابھی تکمیل طلب ہے۔ یا اس کی کیفیت تدریجیہ اور ضرورت پر کامل غور نہیں کیا گیا۔

کھیلوں کی بابت ہماری قوموں اور ہمارے ملکوں میں ایک ایسی بڑی عملی یا ترتیبی غلطی پائی جاتی ہے جسکی وجہ سے اُنکی حقیقت مستتر اور اُنکا فائدہ مشکوک ہو گیا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کھیل صرف نوعمر یا نوخیز نسلیں ہی کھیل سکتی ہیں اور لہو و لعب محض انہیں کا حصہ ہے۔ یہ ایک غلطی ہے۔ بہ نسبت نوخیزوں اور نوعمروں کے بڑی عمر والوں کو تفریح اور ورزش کی زیادہ تر ضرورت ہے۔ نوعمروں کے جذبات اور اعصاب خود بخود نشو و نما کے گرد میں پرورش پلتے رہتے ہیں اور وہ سوائے اس کے کہ کوئی روک ہو جائے خود بخود ہی بڑھتے جائینگے۔ لیکن عمر رسیدہ لوگوں کے جذبات خصوصیت سے ارتقار اور مواد محبیہ اور اسباب نشوئیہ کے خواستگار ہیں اُنہیں تفریح

اور ورزش کی زیادہ ضرورت ہے - جو شخص ایسی عمر میں کوئی مہذب اور مفید ورزش کرسکتا ہے اور کوئی کھیل کھیل سکتا ہے - تو یہ اس کا طبعی حق ہے -

ہمارے ملک میں جب کوئی بڑا بوڑھا آدمی ایسا کرتا ہے تو اُسے خواہ مخواہ مسخرہ بنایا جاتا ہے - جاپان میں بوڑھے آدمی بعض ایسے خاص کھیل کھیلتے ہیں کہ لڑکے اور نوجوان اُن کی صرف سیر دیکھتے ہیں - یہاں جب کوئی صاحب مرکز و مرتبہ یا صاحب عزت و مرتبہ کوئی ورزش کرتا یا کھیل کھیلتا ہے تو لوگ اس پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں - گویا اُنکی نگاہوں میں ایسے لوگ تفریح اور ضروریات زندگی سے فارغ خطی لے چکے ہوتے ہیں - اور اُنکی زندگی صرف اپنے مرتبہ کے رکھ رکھاؤ کے خیال ہی پر بسر ہو سکتی ہے -

یورپ میں رات کے کھانے کے بعد کوئی نہ کوئی کھیل یا مہذب مشغلہ ضرور ہوتا ہے - اور یہاں رات کے کھانے پر ہی سب قسم کی کلفتوں کا باب کھلتا ہے - اب ہمارے ملک میں بعض انگریزی کھیل بھی آگئے ہیں - بیشک اُن میں سے بعض کھیل بہت مفید ہیں - ضروری ہے کہ اُن کا جربہ بھی اُتارا جائے - اور وہ بھی کام میں لائے جائیں - لیکن اس کا یہ اثر نہیں ہونا چاہیے کہ اُنکی اور گھر کے کھیل بالکل ہی ترک کر دیئے جائیں -

جدید بیٹی سے کوئی حرج نہیں لیکن کمی موجب نقص ہے ہاں غیر مہذب مضر صحت اور رذیل ناموس کھیل بیشک قابل ترک ہیں - اس میں بحث ہے کہ ہمارے ملک میں جس قدر کھیل پائے جاتے ہیں - اُن سب کو کھیل کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے یا نہیں ؟ پنجاب میں جس قدر کھیل پائے جاتے ہیں وہ سب ہمیں یاد نہیں ہیں - مگر اُن میں سے چند کا ہم کچھ بیان لکھتے ہیں - ان کھیلوں کے نام پنجاب کے مختلف حصوں میں مختلف بھی ہونگے

(۱۹) لاٹو۔

(۲۰) اک مسکی چک لے دوجی تیار۔

(۲۱) اپنی گھوڑی یا اپتہ کھودانہ۔

(۲۲) بستہ۔

(۲۳) چھکڑی۔

(۲۴) چکڑ لوہا۔

(۲۵) لوکن چھپی۔

(۲۶) فیتہ۔

(۲۷) پینک۔

(۲۸) تاش۔

(۲۹) شطرنج۔

(۳۰) سودی یا گیلی۔

(۳۱) کنکوا یا پتنگ بازی۔

(۳۲) مگدر۔

(۳۳) منگلیاں یا موگریاں۔

(۳۴) نو بر۔

(۳۵) لون پٹنا۔

(۳۶) چھلہ

(۳۷) کوڈیاں۔

(۳۸) چھٹی چھپیا۔

(۳۹) لال یا دودا۔

عورتوں کے کھیل

(۴۰) کھینوں۔

(۴۱) گوٹیں۔

(۴۲) کلکیاں۔

(۴۳) کھدو کھیلے تھال ہاسے۔

(۴۴) کانٹڑ۔

(۴۵) جال جھیال۔

متفرق کھیل مذہب متعلق کھیل ماٹ نمبر ۲۵ + ۲۸ + ۴۹ میں۔ پنجابی کھیلوں کی تاریخی حیثیت ابھی تک خفا میں ہے۔ ممکن ہے کہ بعض کھیل اسی زمانہ سے ملک سے تعلق رکھتے ہوں +

خان بہادر مرزا **سلطان احمد** صاحب ممبر مال

کونسل ریاست بہاولپور (پنجاب)

روزنامچہ نواب سر بلند جنگ بہادر

(چیف جسٹس حیدرآباد دکن)

۱۱۔ جنوری شنبہ | قریب ڈھائی بجے کے میں محمد علی صاحب روگھی سے ملا اور اُنکو بیگم موریس صاحب کے خاندان کے لوگوں سے جو پارک لین میں رہتے ہیں ملنے گیا۔ بعد ازاں روگھی صاحب کے مکان پر کھانا کھایا اور ۱۰ بجے تک وہاں ٹھہرا۔ بانڈ اسٹریٹ میں میں نے دیکھا کہ بعض دوکانوں میں شہزادہ البرٹ وکٹر کی تقریب سالگرہ میں روشنی کی گئی ہے۔ میں سرکس تک اور تھوڑی دور ریجنٹ اسٹریٹ میں گیا لیکن اس کے آگے روشنی نہ ہونے سے ویگو اسٹریٹ کی طرف پلٹا۔ اور بانڈ اسٹریٹ ہوکر میں اپنے کمرہ واقع گانڈویٹ اسٹریٹ نمبر ۴۱ کو چلا گیا۔ بانڈ اسٹریٹ میں بہت سی دوکانوں میں روشنی کی گئی تھی۔ اور بیکنٹوں میں اور کانڈویٹ اسٹریٹ کی دو ایک دوکانوں میں اچھی روشنی تھی۔

۱۲۔ جنوری | آج تیسرے پہر مسٹر و مسز موم شم کاکس حسب وعدہ مجھ سے ملنے آئے اور چائے نوشی کے وقت تک ٹھہرے۔ میں اُن کے آنے سے بہت خوش ہوا

۱۳۔ جنوری | آج کا دن اچھا نہیں ہے۔ برف باری ہو رہی ہے۔ قریب چار بجے کے میں اوپرا ہیٹ (کلاہ) خریدنے اور شمپو کرانے (یعنی صابن لگا کر سر دھلوانے) کے لئے باہر نکلا۔

۷۔ ساعت ۱۰ دقیقہ پر میں روگھی صاحب کے یہاں گیا اور اُس کے بعد ہم سب ملکر نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کے جلسہ میں گئے۔ یہ کمرے کینڈاس

سٹریٹ نمبر ۱۱ میں واقع ہیں اور یہ وہ مکان نہیں ہے جہاں سابق میں جلسے ہوا کرتے تھے۔ موجودہ کمرے بہ نسبت اُن کے بہت اچھے ہیں۔

بہت سے ہندوستانی احباب سے مُلاقات ہوئی۔ لیڈی لسڈن اور مسز مچلاٹ اور ان کی بھتیجی سے مجھ سے تعارف کرایا گیا۔ لیڈی لسڈن ہندوستان ہو آئی ہیں۔ مس موریس اور مجھ سے ایک عرصہ دراز تک تھیو سافی (علم صوفیہ) اور قدیم مصری عمارتوں کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ ان مضامین پر ہم دونوں میں ہمیشہ بحث ہوتی رہتی ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی تازہ بحث نکل آتا ہے اور ہر وقت علیحدگی ہم دونوں سمجھتے ہیں کہ ہماری رائیں متفق نہیں ہو سکتیں گو ہم دونوں میں باہم یکساں ہمدردی ہے۔ ہم باتوں میں ایسے مصروف ہوئے کہ بہت ہی تھوڑے مہمان باقی رہ گئے۔ میں اپنے کمرے (مسکن) کو قریب ½۱۱ بجے کے واپس ہوا جو کیونڈش اسکوائر سے بہت دور نہ تھا۔ اور کتاب دی پرائم منسٹر کے چند صفحے دیکھ کر میں نے آرام کیا۔

۱۴۔ جنوری | میں کالج کو واپس گیا۔ اور میں نے اپنے اُستاد کو جو کیمبرج میں تھے لکھا کہ میں اُن سے کل ملنا چاہتا ہوں۔ دفعتاً میرا ارادہ پھر کیمبرج جانے کا ہوا۔

۱۵۔ جنوری | کنگس کراس سے ½۱۱ بجے روانہ ہو کر ½۱۲ بجے کیمبرج پہنچا اور مسٹر کارٹ مل سے ملاقات ہوئی۔ مختلف امور پر اُن سے باتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر پل جو محبتہ جانی کہے جاتے ہیں۔ کیمبرج میں نہ تھے۔ مسٹر کارٹ مل نے مجھے ان کا لندن کا پتہ دیا اس لئے میں ½۴ بجے کی گاڑی میں واپس ہوا اور ان سے ٹرلینڈ ہوٹل میں ملا۔

۱۶۔ جنوری | آج میں نے ہندوستان کو خطوط لکھے جن میں مختصر طور پر امتحان بیرسٹری

کے نتیجہ کا ذکر درج کیا۔ لیکن کیمبرج واپس جانے کے ارادہ کا کچھ ان میں ذکر نہیں لکھا۔ میں نے لنکلن ان میں کھانا کھایا اور بار میل پر دوبارہ پیش کیا گیا۔ ہمارے ان کا یہ ایک خاص طریقہ ہے۔ ایک مرتبہ میں اپنے تیسرے اور چوتھے ٹرم میں پیش کیا گیا تھا اور اب اپنے بارھویں ٹرم میں پیش کیا گیا۔ میں مسٹر برڈ سے ملا۔ جو صرف اسی ٹرم میں ان میں شریک ہوئے ہیں۔ میں اپنے مقام سکونت پر واپس گیا اور انٹونی ٹرالوپ کی کتاب پرائم منسٹر کو ختم کرنے کی غرض سے ایک بجے کے بعد تک جاگتا رہا۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بہت تفریح ہوتی ہے لیکن غیر معمولی طور پر یہ کتاب عمدہ نہیں ہے اور تمام کتاب بلحاظ اپنی عمدگی کے یکساں ہے۔

۱۷۔ جنوری | کیمبرج کی روانگی سے پہلے میں مسٹر روکبی کے پاس رخصت ہونے کے لئے گیا۔ اس کے بعد ماس صاحب کے خاندان کے لوگوں کے پاس گیا۔ مسز راس کا مزاج اچھا نہ تھا۔ مس راس سے ملاقات ہوئی اس کے بعد کلب کو واپس گیا۔ اور لیونل ٹینی سن سے کلب کے باہر ہی ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کے نام ایک چھٹی پورٹر کو دیکر آیا ہوں جس میں میں نے آپ کو کل ۱۰ بجے شب کو پارٹی میں (دعوت میں) بلایا ہے۔ لنکلن ان میں پھر کھانا کھایا اور جے کارٹرل سے ملا جنہوں نے مجھ سے رخصت نہ ہونے کے متعلق بہت سے عذرات کئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ٹرم کے واسطے کیمبرج آیا ہوں۔

۱۸۔ جنوری | آج تیسرے پہر کو میں مس پننگ سے ملنے گیا۔ اور دس بجے شب کو مسٹر ٹینی سن کے مکان پر گیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ امریکن جنرل گرانٹ کی بیٹی بھی وہاں تھیں جن سے مجھ سے پہلی کھانے کی دعوت میں ملاقات

ہوئی تھی۔ پروفیسر سیلی بھی معہ مسٹر و مسز بارنٹ کے وہاں تھے۔ مسز پراتھرو۔ اور مس پوچہرس بیٹیاں اور بہت سے قابل اشخاص وہاں موجود تھے۔ مسز ایل نیٹیس جو عمدہ میزبان تھیں خود بھی بہت قابل ہیں۔ کئی مردوں اور عورتوں نے گانا بجایا۔ سب سے عمدہ پیانو بجانے والی مس وہائٹ تھیں۔

میں نے طے کر لیا ہے اور اپنے اُستاد سے آئندہ چہارشنبہ کو کیمبرج جانیکی اجازت مانگی ہے۔

۱۹ جنوری | راس صاحب کے یہاں میں نے دعوت کا کھانا کھایا۔ وہ لوگ حسب دستور بہت مہربانی سے پیش آئے۔ مسز راس کا مزاج زکام اور کھانسی سے کسی قدر ناساز تھا۔ کھانے میں اور کئی آدمی شریک تھے۔ مسز ڈودی جن سے میں کئی مرتبہ پہلے بھی مل چکا تھا اُسی مکان میں قیام پذیر تھیں اُن کی دو بھتیجیاں مع اپنے بھائی کے کھانے میں شریک تھیں۔ کرنل راس کے فرزند ماسٹر سانڈی بھی دعوت میں آئے تھے۔ میں نے جو انکو پچھلی مرتبہ دیکھا تھا اُسوقت سے وُہ بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ کھانے کے بعد مس راس نے گانا گایا ان کی آواز بہت اچھی ہے۔ ۲½ بجے میں برخاست کر کے کلب گیا اور شب کو ڈنر کھایا۔ پھر واپس ہوا۔

۲۰ جنوری | دس پونڈ یعنی اشرفیوں میں ایک پورٹ مینٹو میں نے خرید کیا جو فرمائش پر بنایا گیا تھا۔ مجھ سے غریب آدمی کے لئے یہ بہت زیادہ ہے لیکن اچھا وقت بھی آنے والا ہے۔ لنکلن ان میں جہاں میں کھانے کو بیس منٹ قبل پہنچ گیا تھا۔ کھانا کھایا اور خوش قسمتی سے لٹن اوریشین سُننے کا موقع ملا جو ایک طالب علم نے حاضرین کو سُنایا۔

اگرچہ میرے والد مجھے جلد ہندوستان واپس بُلانا چاہتے ہیں۔ اور مجھے

بیرسٹری کا صرف ایک ہی مضمون میں امتحان پاس کرنا باقی رہ گیا ہے ۔ جو میں بآسانی پاس کر سکتا ہوں ۔ لیکن میری خواہش ہے کہ کیمبرج کی ڈگری کے بغیر واپس نہ ہوں اس لئے میں چپ چاپ لندن سے کیمبرج جاتا ہوں ۔

۲۲ جنوری | کیمبرج پہنچ گیا ۔ داس کے ساتھ صبح کا کھانا اور فاکس کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا ۔ ٹرنٹی اسٹریٹ اور کنگز پریڈ میں تھوڑی دیر پھرنے کے بعد نمبر ۱۶ کنگز پریڈ پر نہایت عمدہ کمرے اول منزل پر سوا اشرفی (پونڈ) فی ٹرم پر کرائے لئے ۔

سہ پہر میں بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوئی جن سے میں سال گزشتہ رخصت ہو گیا تھا ۔ کیونکہ کیمبرج واپسی کا خیال اس وقت نہیں تھا ۔ سب مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے ۔

۲۳ جنوری | آج میں نے ہندوستان کو خطوط لکھے ۔ میں نے دفعتًا خبر دینا مناسب نہیں خیال کیا ۔ اس لئے میں نے مختصر طور پر کیمبرج واپس جانے کے متعلق لکھا تاکہ وہ لوگ آنے والے نازک واقعہ کے واسطے تیار ہو جائیں ۔ آئندہ ڈاک کو میں مفصل لکھونگا ۔ کہ مجھ کو بلانے سے کیا کیا نقصانات ہونگے ۔

میں کاکس صاحب اور وارا کر صاحب کے مکان پر گیا اور پروفیسر سلی کے پاس اس خیال سے گیا کہ وہ ایک کنورسیشنل کلاس قائم کیا کرتے ہیں ۔ لیکن معلوم ہوا کہ ایسا نہیں کیا گیا ۔ مجھے خیال ہے کہ انہوں نے دن یا وقت کو تبدیل کر دیا ۔ بہرحال مجھے دریافت کرنا چاہئے ۔

میں یونین میں گیا اور کئی اخبارات و تار پڑھے ۔ جن میں یہ تعجب خیز خبر تھی کہ لندن میں تین ڈائنامیٹ پھوٹ گئے ۔ شام کو مباحثہ کالج یعنی کالج ڈبیٹ میں شریک ہوا ۔ کام کے بعد عہدہ داروں کا انتخاب کیا گیا ۔

اسے اسی شیپلی سے ملاقات کی جن کا مزاج کسی قدر ناساز ہے۔

۵ جنوری | آج پیلیٹو ریپبلک کو میں نے پڑھا جس کا انگریزی ترجمہ ڈیوس اور وآن نے کیا ہے

مسٹر وائیا مجھ سے ملنے آئے اور قریب ۴ ساعت ۱۵ دقیقہ کے میں مسٹر و سنہ لیہ سی سے ملنے کو گیا اور چائے نوشی تک وہاں ٹھہرا۔ مسٹر بسٹر ف نیوٹن جنکو میں مسٹر آئرس جانتا تھا اور جو فطرتاً سائنٹسٹ (علوم طبیعات دان) ہیں اور ایک اور شخص اس مدرسہ کے وہاں موجود تھے۔ اور بعد چائے نوشی کے کچھ تجربے ہم نے کئے جن میں سے دو میں کامیابی ہوئی۔ لیکن وہ آسانی سے بیان کئے جا سکتے ہیں۔ میں اپنا ڈنر ہال کا وقت بھول گیا اور اس وجہ سے مجھے کھانے کے لئے بروؤٹ کے ہوٹل جانا پڑا۔ اس کا نتیجہ کسی قدر زیادہ بیٹھنے و شلنگ ہوا۔

۲۵ جنوری | ۸ ساعت ۱۵ دقیقہ پر مسٹر عنایت اللہ کے مکان پر مجلس میں گیا اور تقریباً ۱۰ ساعت ۴۵ دقیقہ تک وہاں رہا۔ اس کے بعد اپنے مکان واپس آیا۔ ایک جدید ممبر ہوٹا بھائی منتخب کئے گئے جو بلحاظ قومیت کے پارسی ہیں اور فی الحال کونس کالج کے ممبر ہیں وہ کاونڈیش سے جہاں وہ گذشتہ ٹرم میں داخل ہوئے تھے چلے آئے ہیں۔

۲۶ جنوری | آج میں سر رولینڈ ولسن کا لیکچر سننے کے لئے گیا جو قانون فوجداری ہند کے متعلق تھا اور جس کا وقت ۹ سے ۱۱ بجے تک تھا۔ بعد ازاں واپس لائبریری کو گیا اور گوڈیوس ولڈ پراپرٹی کے کچھ اجزاء دیکھے۔ ولیم کی جو کتاب اسی مضمون پر ہے اس سے یہ بہت عمدہ ہے۔ سہ پہر کو مسز پرو تھرو کے مکان پر گیا۔ خوش قسمتی سے وہ مکان پر ملیں اور ان سے چائے نوشی کے وقت تک خوب باتیں ہوتی رہیں۔

۲۷ جنوری | آج شام کو یونین میں کریمینشن پر مباحثہ ہوا جو کریمیشن کے موافق تھا۔ لیکن تقریریں بہت عمدہ نہیں کی گئیں۔

۲۸ جنوری | آج میں سر آر۔ کے ولسن کا لکچر سننے گیا۔ بعد ازاں کتب خانہ کو گیا۔ گوڈیو کو پڑھا اور قانون فوجداری ہند پر بہت اچھی اچھی کتابیں دیکھنے میں آئیں جنکو وقتاً فوقتاً میں دیکھا کرونگا۔

پروفیسر سیلی صاحب کا لکچر سننے کو گیا جو انگلینڈ اس فارین پالیسی ان دی ایٹینتھ سنچری پر لکچر بہت اچھا تھا۔ وہاں سے گارڈنر صاحب کا لکچر سننے گیا جو یونانیوں کی خانگی زندگی پر تھا۔ لکچر بہت اچھا تھا۔ لیکن لکچرار صاحب بہت افسردہ معلوم ہوتے تھے۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے مذاق کا لطف خود نہیں اُٹھا سکتے۔

۲۹ جنوری | آج شام کو میں سر آر۔ کے۔ ولسن کے مکان پر کون کا ایک مضمون سننے کے لئے گیا۔ یہ میرے اس زمانے کے ملاقاتی ہیں۔ جبکہ ہم برن اور گرنی کے ہاں بھرتی تھے۔ وہ کاغذ انڈین سول سروس ڈیبیٹنگ کلب کے ہفتہ وار جلسہ میں پڑھا گیا تھا جس میں مجھے سر آر ولسن نے ازراہ مہربانی بلایا تھا۔ اس پرچہ کا مضمون "وارن ہیسٹنگ کا جرم" تھا۔ اُس پرچہ کے پڑھنے والے اور درحقیقت تمام سول سروس کے لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ہیسٹنگ کا رویہ درست تھا۔ سر رولینڈ نے ایک عمدہ اسپیچ دی جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا کہ ہیسٹنگ کا رویہ قابلِ ملامت تھا۔ مجھے اس کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سر رولینڈ کی تقریر کا کچھ اچھا اثر ان لوگوں پر ہوا ہوگا۔ میں ۱۲ بجے واپس آیا۔

۳۰ جنوری | وطن کو خطوط روانہ کئے۔ اور اب کے مرتبہ اپنے منشا سے جو کچھ

تنہائی

تنہائی! تیرے احسانات دنیا اور اہلِ دنیا پر بے شمار ہیں۔ تو ہی نے منطق۔ فلسفہ اور علوم سائنس کو ترقی دی۔ تیری ہی صحبت میں شاعروں نے شاعری سیکھی۔ تیرے ہی گوشہ میں بیٹھکر انہوں نے خامہ فرسائی کی اور زورِ قلم کی داد دی۔ تیرے ہی کان سے انہوں نے دُرہائے مضامین عوام کی پسندیدگی کے لئے منتخب کئے۔ تو ہی نے انگریزی میں شیکسپیر۔ ملٹن۔ ٹینیسن فارسی میں فردوسی۔ سعدی۔ حافظ۔ اردو میں انیس۔ دبیر۔ غالب جیسے شعرائے نامدار کو پیدا کیا جن میں سے ہر ایک کا نہ مٹنے والا نام تاقیامت قدرشناسوں کی نظر میں آفتاب کی طرح روشن رہیگا۔ یہ تیری ہی تعلیم کا کرشمہ ہے کہ نیچر پرستوں نے ایک ایک پتی ایک ایک درخت سے ہزاروں پند سیکھے۔ چنانچہ شیخ سعدی کہتے ہیں ؎

برگِ درختِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

جب کبھی کسی کو کوئی بہت ہی مشکل مقدمہ حل کرنا ہوتا ہے تو وہ تجھی سے مشورہ لینے آتا ہے۔ ہر جگہ سے مایوس ہوکر وہ تیرے ہی دروازہ پر سر رگڑتا ہے اور آخرالامر صرف تیری ہی مدد سے اپنے مقصد کو پہنچتا ہے۔ کوئی زمانہ کا ستایا مصیبت کا مارا عاشق ناکام و نامراد جب حد سے زیادہ بےچین و مضطر ہوجاتا ہے اور ناصح کے پند و نصیحت۔ اغیار کے طعنوں ہمنشینوں کی چھیڑ چھاڑ سے دق ہوجاتا ہے تو تیرے گوشہ میں آکر پناہ

لیتا ہے۔ اور تیری ہی صحبت میں اُسے کچھ تسکین حاصل ہوتی ہے۔ تو ہی اس کے حالِ زار پر مہربان ہو کر تصویر جاناں اس کے خیال کے سامنے کھینچ دیتی ہے جس کے نظارہ سے اُس کے دل کو کچھ چین آجاتا ہے۔ تیری ہی نوازش سے عالمِ خیال میں وہ اپنے محبوب اور آرامِ جاں سے دو چار باتیں کر کے اپنے دلِ ناشاد کو خوش کر لیا کرتا ہے اور جب کبھی نہایت ہی بیتاب و بیقرار ہو جاتا ہے۔ تو تیرے ہی پردہ میں عوام کی نظروں سے پوشیدہ اپنی بدقسمتی پر چار آنسو بہا کر دل کی کچھ بھڑاس نکال بیٹھتا ہے۔

شہر اور آبادی کی زندگی کا کوئی لمحہ خطرے سے خالی نہیں لیکن تنہائی! تیری صحبت کی زندگی ہر قسم کے خطرات و تفکرات سے مبرا ہے۔ نہ چور کا ڈر۔ نہ ڈاکو کا خوف۔ بھلا درویش کے پاس دھرا ہی کیا ہے۔ جو کوئی لیگا۔ اپنی جان۔ اُس کے تن جلنے کا غم ہی نہیں۔ کیا خوب مصرع ہے ع

بہیچ آفت نرسد گوشۂ تنہائی را

وہ تارک الدنیا درویش جنکی طبیعت دُنیائے فانی اور اس کی عیاریوں سے ہٹ جاتی ہے اور جو اس کے چند روزہ عیش و عشرت سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ تیرے ہی گوشہ میں آرام پاتے ہیں اور تجھی میں ابدی راحت محسوس کرتے ہیں۔ تیری ہی پاک صحبت میں اُن کا آئینۂ دل ہر قسم کی کدورت سے صاف ہو جاتا ہے جس میں وہ جلوہ حقیقی دیکھتے ہیں۔ تیرے ہی گوشہ میں اور تیری ہی نصیحتوں سے متاثر ہو کر کوئی گنہگار اپنے گناہوں سے تائب اور اپنے جرائم پر پشیمان ہوتا ہے۔

تیری ساری خوبیوں کو بیان کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ تجھ میں پند و نصائح کوٹ کوٹ کر قدرت نے بھر دیئے ہیں۔ اگرچہ تو خاموش ہے

لیکن تیری خموشی میں اخلاقی تقریریں بھری ہیں۔ تو بے زبان ہے لیکن زبانِ حال سے عجیب غریب داستانیں بیان کرتی ہے جنہیں صرف روشن ضمیر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ تجھ میں عجیب عجیب راگ ہیں جو عوام کو سنائی نہیں دیتے۔ تیرے دلکش ترانوں کو وہی سن سکتا ہے جو گوشِ حقیقت نیوش رکھتا ہے۔ تیری خوبیوں اور دلفریبیوں کا وہی نظارہ کر سکتا ہے جو چشمِ بصیرت رکھتا ہے۔ تیرے مخفی رازوں کو وہی سمجھ سکتا ہے جو حقیقت نما ہے۔ تجھ میں جس نے جو تلاش کیا پایا۔ تو درویشوں کے لئے آرام، گنہگاروں کے لئے راہِ نجات، شاعروں کے لئے بحرِ معنی اور عاشقانِ نامراد کے لئے تسلی ہے۔

عبدالحی خاں تپش کایست اسکول

آئینہ شوق۔ منشی جگناتھ پرشاد صاحب شوق نگم دہلوی زبانِ اردو کے ان قدردانوں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے خونِ دل اور جلائے دماغ سے زبان کی کھیتی کو سینچا اور لہلہایا ہے۔ حال میں آپ نے اپنے نتائجِ افکارِ منظومہ کا مجموعہ "آئینہ شوق" کے نام سے ادارہ وداں پبلک میں پیش کیا ہے اور اس کی ایک جلد ہم کو ریویو کے لئے ارسال فرمائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس دیوان میں ایک فطری شاعر کے دلنشین کلام کا بہت ہی بیش بہا مجموعہ موجود ہے اور مذاقِ سخن رکھنے والے اصحاب اس سے چاشنی گیر ہو سکتے ہیں۔ زیادہ خوشی یہ ہے کہ مصنف چھپوانے والے، چھاپنے والے اور چھاپنے کی تحریک کرنے والے یہ تمام اصحاب ہمارے ہندو بھائی ہیں جن کو آج بہت زیادہ ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کی ترقی دینے کا خیال ہے اور وہ ہمارے مسلمانوں کے مخالف تصور کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہم نے اور دیگر منصف مزاج مسلمان اہلِ قلم نے بہت مرتبہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوؤں میں بھی اکثر بلکہ بیشتر اصحاب زبانِ اردو کے سچے حامی اور دلدادہ پڑے ہوئے ہیں اور رہیں گے۔ وہ اس کو خاص اپنی ملکی زبان جانتے اور مانتے ہیں اور اس کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ شوق نگم بھی انہیں بزرگوں میں سے ہیں۔ اور آپ نے

آفتاب کے سیاہ دھبے

عرب کے حکما و علماء آفتاب کا راصد اول حکیم اندلس ابن رشد کو
بتاتے ہیں کہ اس نے سنہ ۱۱۹ء میں آفتاب پر سیاہ داغ دیکھا۔ عجب امر ثابت
کا ہوتا ہے کہ کہیں عربی کتابوں میں یہ ذکر نہیں دیکھنے میں آیا۔ شرح مواقف
میں اتنا اشارہ ہے کہ قد زعم بعض الناس ان فی وجہ الشمس نقطۃ
سوداء فوق مرکزہ بالقلیل۔ ابن رشد و شارح مواقف کا زمانہ دوربین
کے ایجاد ہونے سے بہت پیشتر ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض
داغ آفتاب کے اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ بغیر دوربین کے دکھائی دیتے ہیں
شرح مواقف میں ایک قول یہ بھی دیکھنے میں آیا ومنہم من ادعی انہ رای
الزهرة وعطارد کشامتین علی صفحۃ الشمس یعنی بعض
متاخرین نے ادعا کیا ہے کہ اس نے زہرہ و عطارد کو آفتاب پر اس طرح
سے دیکھا جیسے کسی رخسار پر دو تل ہوتے مگر حسب تحقیق جدیدہ یہ امر ممکن الوقوع
نہیں کہ زہرہ و عطارد ایک ہی وقت میں آفتاب پر سے گذریں۔ مسٹر چیمبرس
نے کتاب الہیئۃ جلد اول میں اس کی تصریح کر دی ہے۔ کہ زہرہ کا مرور آفتاب
پر جون یا دسمبر کے سوا کسی دوسرے مہینہ میں نہیں ہوتا۔ اور عطارد کا مرور
نومبر اور مئی کے سوا کسی اور مہینہ میں نہیں واقع ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ
دونوں ایک وقت میں آفتاب پر سے مرور نہیں کر سکتے۔ اس شخص نے بھی
آفتاب کے داغ کو دیکھا تھا جس کو زہرہ یا عطارد سمجھا۔ عطارد بہت کم
دکھائی دیتا ہے اور اکثر آفتاب کے قریب ہی رہتا ہے۔ لوگ اس کے مشتاق

رہتے ہیں۔ اِس سبب سے مسٹر چیمبرس کی کتاب سے اُنیسویں صدی میں جس ترتیب سے
عطارد نے آفتاب پر سے مرور کیا ہے میں پہلے اس کی تفصیل نقل کر دیتا ہوں۔ تا اُسی
ترتیب سے اس بیسویں صدی کی زیج بھی ہم بنا سکیں۔ اور عطارد کو آفتاب
پر سے گذرتے ہوئے دیکھ سکیں۔

انیسویں صدی میں پہلی دفعہ نومبر ۱۸۰۲ میں عطارد نے آفتاب پر سے مرور کیا
اس کے تیرہ برس بعد نومبر ۱۸۱۵ " "
اس کے سات برس بعد نومبر ۱۸۲۲ " "
اس کے دس برس بعد مئی ۱۸۳۲ " "
اس کے تین برس بعد نومبر ۱۸۳۵ " "
اس کے دس برس بعد مئی ۱۸۴۵ " "

یعنی تینتالیس سال کا دورہ ختم ہونے کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہوا۔ یعنی
اس کے تین برس کے بعد نومبر ۱۸۴۸ میں مرور عطارد آفتاب پر سے ہوا
اس کے تیرہ برس کے بعد نومبر ۱۸۶۱ " "
اس کے سات برس کے بعد نومبر ۱۸۶۸ " "
اس کے دس برس کے بعد مئی ۱۸۷۸ " "
اس کے تین برس کے بعد نومبر ۱۸۸۱ " "
اس کے دس برس کے بعد مئی ۱۸۹۱ " "

غرض ہر ۴۳ سال میں چھ دفعہ اسی ترتیب سے مرور ہوا کرتا ہے۔ یعنی
نومبر نومبر نومبر مئی نومبر مئی اسی ترتیب کے بموجب انیسویں صدی
کا آخری مرور۔

اس کے تین برس بعد نومبر ۱۸۹۴ میں ہوا اور

[illegible] کا چھٹا مرور۔

اس کے تیرہ برس بعد نومبر ۱۹۰۷ء میں ہوا۔

اور اب اس کے سات برس بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوگا۔

و ختم شد۔

غرض کہ زہرہ و آفتاب کے اجتماع کے جیسے عطارد و آفتاب کے اجتماع کے علاوہ ہیں۔ بعض متاخرین کا یہ قول کہ ہمیں نے زہرہ و عطارد کو آفتاب پر سے ساتھ ہی گزرتے دیکھا ہے جیسا کہ شارح مواقف سید علامہ نقل فرماتے ہیں کسی طرح ممکن الوقوع نہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دو سیاہ تل رخسارۂ آفتاب پر جو اسے دکھائی دیتے ان میں سے ایک ستارہ تھا اور ایک داغ آفتاب کا تھا۔ اس سبب سے کہ دونوں ستارے تو جمع نہیں ہو سکتے۔ جس کی دلیل بیان ہوئی۔ دونوں داغ بھی نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے کہ ہیئت جدیدہ کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ہی آدھ داغ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ بغیر دوربین کے دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کے دیکھنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی شیشہ کے پرکالہ پر کاجل پار کر اس میں سے آفتاب کو دیکھیں۔ دوسری یہ کہ اندھیری کوٹھری میں کسی روزن سے شعاع آفتاب کی جو مدوّر ہو کر دیوار پر پڑے اس عکس میں بھی وہ دھبہ دکھائی دے سکتا ہے مگر اُلٹا دکھائی دیگا۔ یعنی اگر آفتاب کے مشرقی جرم میں ہے تو مغربی حصہ میں نظر آئیگا۔ جس کی وجہ علم مناظر کے جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔

جب سے دوربین ایجاد ہوئی آفتاب میں متعدد داغ نظر آنے لگے کہ مشرقی کنارہ سے نکل کر مغربی کنارہ کی طرف حرکت کر رہے ہیں۔ یہ حرکت جب صعودی یا نزولی ہوتی ہے تو صاحب رصد کو بطی معلوم ہوتی ہے۔ جب ذروۂ آفتاب کے

قریب وہ داغ پہنچتا ہے تو اُس کی اصلی حرکت معلوم ہوتی ہے۔ جو بہ نسبت حرکت
صعودی و نزولی کے سریع ہے۔ اور تقریباً تین دن میں ایک داغ شرقی کنارہ
سے مغربی کنارہ تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اتنے ہی زمانہ تک آفتاب کے دوسرے
رُخ پر ہماری نظر سے غائب رہ کر شرقی کنارہ سے دوبارہ نمودار ہوتا ہے۔

اہل رصد کو پہلے یہ اشتباہ رہا کہ یہ داغ جرم آفتاب سے خارج کوئی جسم
ہے جو اس کے گرد گردش کر رہا ہے۔ مگر جب کئی داغ ساتھ ہی دیکھے اور یہ
دیکھا کہ اُن کی حرکت میں اور باہمی فاصلوں میں تناسب باقی رہتا ہے۔
تو یہ اشتباہ رفع ہوگیا۔ اور یہ امر ثابت ہوا کہ یہ سب داغ خود جرم آفتاب
پر ہیں اور اس کی حرکت علیٰ نفسہا کرنے کی دلیل بنتے ہیں جس کا زمانہ
۲۵ دن کا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ حرکت وضعی آفتاب کی جو داغوں
کے مرصود کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ جس رُخ پر اور جس سطح پر پائی جاتی ہے
تمام سیارات کی حرکت سالانہ تقریباً اسی رُخ پر اور اسی سطح میں نظر آتی ہے۔
کانٹ جو مشاہیر اہل رصد میں سے ہے اُس نے اس سے قیاس کیا ہے
کہ کسی زمانہ میں آفتاب و سیارات سب مل کر ایک جسم واحد تھے اور اُسی زمانہ
سے میل مستدیر ان سیارات میں ایک ہی معین رُخ پر اور ایک ہی معین
سطح میں حرکت کرنے کا موجود ہے۔

آفتاب و سیارات کے ایک جسم متصل واحد ہونے کی تائید ایک جدید
مسئلہ کے انکشاف سے بھی ہوئی۔ جسے واشنگٹن کے ایک حکیم مسٹر ہومر لین
نے ۱۸۷۰ء میں مشتہر کیا۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ جتنے اجسام بشکل دخان پائے
جاتے ہیں۔ جوں جوں اُن کی حرارت کم ہوتی جاتی ہے اُسی قدر بلا مدت
سمٹ کر گھٹتی جاتی ہے۔ لیکن جسم کے سمٹ جانے سے حرارت پہلے سے بھی زیادہ

پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب جسم سیال یا منجمد ہو جاتے تو یہ خاصہ زائل
ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ کے امکانات کے بعد یہ استدلال کیا گیا کہ آفتاب چھوٹا ہوتا
چلا جاتا ہے اس کے جرم میں تکاثف واقع ہوتا ہے۔ حرارت اس کی بڑھتی
جاتی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداً میں اس کا جرم بہت بڑا تھا۔
یہاں تک کہ نظام شمسی کی ساری فضا اس سے بھری ہوئی تھی۔ اور آفتاب
و سیارات یہ سب مل کر بشکل لطخہ سحابیہ ایک جسم متصل واحد تھے۔

ان داغوں کی حرکت کا رُخ بکثرت ہم کو بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن
داغوں کی حرکت میں دراصل یہ تغیر نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے دیکھنے کا رُخ
بدلتا رہتا ہے۔ یعنی زمین اپنی گردش سالانہ میں کبھی آفتاب کے اس رُخ
پر آجاتی ہے۔ کبھی اس رُخ پر۔

گو کسی زمانہ میں آفتاب پر متعدد داغ دکھائی دیتے ہیں۔ اور کبھی
مہینوں ایک بھی نظر نہیں آتا۔ اس کی لم دریافت کرنے میں اہل رصد کو
ڈھائی سو برس سے زیادہ ہوئے۔ اکثر لوگوں نے داغوں کی روزانہ رصد
لینے میں اپنی عمریں صرف کیں۔ اور ہنوز قابلِ وثوق کوئی ضابطہ نہ ہاتھ آیا۔
یہ معلوم ہوتا ہے کہ گیارہ برس اکتالیس دن میں داغہائے آفتاب کا سلسلہ ختم
ہو کر نئے سرے سے پھر شروع ہوتا ہے۔ اور یہی مدت قطب نما کی سوئی
کے انحرافات کی ہے۔ یعنی نقطۂ قطب سے سوئی کا انحراف جہت مشرق
و مغرب میں ایک خاص ترتیب سے ہوا کرتا ہے۔ اس کا سلسلہ بھی اتنے ہی
زمانہ میں ختم ہو کر پھر نئے سرے سے شروع ہوتا ہے۔ جس زمانہ میں آفتاب کے
داغوں میں کمی ہوتی ہے۔ اس زمانہ میں سوئی میں انحرافات کم ہوتے ہیں لیکن
ان دونوں میں کیا تعلق ہے۔ ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

علی حیدر طباطبائی

کلامِ اکبر

ہم کمال امتنان کے ساتھ اپنے مخدوم جناب خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر کا مندرجہ ذیل تازہ کلام چھاپتے ہیں۔ جو انہوں نے ایک تازہ عنایت نامہ کے ہمراہ ارسال فرمایا ہے:-

مشرقی کو ہے ذوقِ روحانی — مغربی میں ہے میلِ جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں — ڈارون بولا بوزنہ ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست — فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

جہاں اُنکی نظر نافذ ہوا قانون فطرت کا — نظر نیچی رہے یہ وعظ اصلی ہی شریعت کا
فرشتے پوچھتے ہیں تو نے کیوں لکھا ادھر اکبر — نہیں کہتے کہ کیوں عاشق ہوا اس بت کی صورت کا
میں کہتا ہوں انہیں نے غل مچا کر آنکھ اٹھوائی — مرا سودا نتیجہ ہے فقط ارشادِ حضرت کا

کیا کام ہمیں اوولیوشن سے نیچر سے ہمیں کیا حاصل ہے
بندر کی ترقی آساں ہے بیٹو کی ترقی مشکل ہے

اتنی سرپوشی تیری اے مشرقی غنیمت ہے — دے جا چندہ بس تعلیم کی غرقی غنیمت ہے

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر ذکر کرتے ہیں خدا کا اس زمانے میں
ہوگئے ہیں مشاغل حضرتِ اکبر کے اک دو ہی — الم تر کیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیلخانے میں

اگر دانستم از روز ازل داغ جدائی را
نمیکردم بدل روشن چراغ آشنائی را

سمجھا کرتے تھے ہم باوفا - اور بیوفا تجھ کو
مگر ہے ہے نہ کچھ بھی پاس الفت کا رہا تجھ کو
رقیبوں سے رہا کرتی تھی نفرت بیحد تجھ کو
خیال ان کی محبت کا ہوا اب حد سے سوا تجھ کو

اگر دانستم از روز ازل داغ جدائی را
نمیکردم بدل روشن چراغ آشنائی را

چھٹی صحبت وہ تیری دم میں یوں اے گلعذار آخر
کہ آئی بھی نہ تھی اور ہو چکی فصل بہار آخر
ہماری خواہش دل کا نہ پھولا لالہ زار آخر
نہ تھا معلوم ہوگا ہائے کیا انجام کار آخر

اگر دانستم از روز ازل داغ جدائی را
نمیکردم بدل روشن چراغ آشنائی را

نہ ہونے ہم تجھے دیتے تھے نظروں سے جدا دم بھر
رحیم شیفتہ کی تھی فدا جان حزیں تجھ پر
مگر اب سوزش فرقت نے کر رکھا ہے دل میں گھر
بنا ہے حلقہ زنجیر پا تقدیر کا چکر

اگر دانستم از روز ازل داغ جدائی را
نمیکردم بدل روشن چراغ آشنائی را

بتائیں کیا کہ وہ گل ہم کو کیا سمجھا تھا اور کیا نکلا
غضب کا سنگدل - بیمہر - ظالم - بیدغا نکلا
سمجھتے تھے جسے ہم آشنا - نا آشنا نکلا
وفا کی جس سے ہم کو تھی توقع بیوفا نکلا

اگر دانستم از روز ازل داغ جدائی را
نمیکردم بدل روشن چراغ آشنائی را

محمد عبدالرحیم رحیم (دلاور گنج) حیدرآباد دکن

کلامِ عزیز

دُنیا کی ایک مثال

(مقتبس از خیالاتِ سُقراط)

کیا ہے یہ دُنیائے دُوں؟ اک آتشِ افروختہ
اے مردِ حبِ عزت اس سے سرک اے دل سوختہ

شعلۂ جانسوز روشن ہیں میانِ شاہراہ
غیر ممکن ہے کہ قربت میں ملے تجھ کو پناہ

جانتا ہوں میں کہ اس دُنیا سے تجھ کو لاگ ہے
ہوشیار اے جانور لے یہ دہکتی آگ ہے

تیرا ہے جب تشنگی تجھ کو تا بہ حدِ فنا
اس کے ہر شعلے میں تو پائیگا تصویرِ فنا

اس کی قربت سے [illegible]
بعد مہلت تو بھی ہوگا شعلۂ پُر پیچ و تاب

نقش بر آب آہ اس دُنیا کے ہیں نقش و نگار
جلتی پھرتی چھاؤنی ہے یہ ہستی بے اعتبار

گرمیِ بازار اس دُنیا کی بس کچھ روز ہے
دوزخ آشام اس کا ہر اک شعلۂ جانسوز ہے

جل رہے ہیں جلنے والے زندگی بیکار ہے
عشق میں دُنیا کے دل پر داغ آتشزار ہے

راستہ چلنے کو جتنی روشنی درکار ہے
فائدہ حاصل کر اتنا ورنہ تو فی النار ہے

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی

جونپوری خربزہ

سردے کابل کے کھاکے دیکھے
چتلے بھی لکھنؤ کے چکھے

پر وہ لونے جونپور کے پھل
ہر طرح ہیں ذائقے میں افضل

کھائے اِک قاش تو ہوں لب بند
پہنچے گا نہ اس مٹھاس کو قند

سبزے کی وہ قاشوں میں نمائش
دیکھا کرو آنکھ کی یہ خواہش

قاشیں میں سفیدے کی وہ شفاف
کوزے مصری کے جس طرح صاف

بھینی بھینی وہ میٹھی خوشبو
ہو تازہ دماغ ایسی خوشبو

دولت کی چاٹ کہہ رہی ہے
لذّت کی زبان جو ہری ہے

اس کھیت کا ہے عجیب پانی
جذب اس میں ہے آبِ زندگانی

مرکز ہے بشیر پور[1] مشہور
ہے شہر سے یہ مقام کچھ دور

اس کاشت کو یہ نہیں ہے اکسیر
کیا آب و ہوا کی کہئے تاثیر

کھیت اور بھی یوں تو جا بجا ہیں
شکل ایک گو مزے جدا ہیں

صورت کو نہ دیکھئے پھلوں کی
سیرت کی ملاحظہ ہو خوبی

صورت تو نہیں ہے خوبصورت
سیرت کی فقط ہے قدر و قیمت

جو لطف مزے میں کہتے کس سے
چکھے جو کوئی تو یاد رکھے

حفیظ جونپوری

کوچۂ یار

قطعہ

اے شوق سے بھیجتا ہوں میں قاصد
رہیگی نظر راہ پر دیکھ لینا

تیرے سے پھر کے آنے پا جب تک
نہ ٹھہرے گا دل نے جگر دیکھ لینا

[1] اس موضع جہاں خربوزے کی زیادہ کاشت ہوتی ہے ۔

ترے قاتل کا پتا دوں تجھ کو — جو کہتا ہوں میں ڈھونڈھ کر دیکھ لینا

[illegible] — تڑپتے ہیں دل خاک پر دیکھ لینا

کہیں خاک اڑاتے ہیں گیسو کے الجھے — کسی کا ہے دم ہونٹوں پر دیکھ لینا

کوئی ہوگا [illegible] زمیں پر — کسی کا عدم کو سفر دیکھ لینا

کہیں چاک دامن کئے ہیں ہزاروں — کھڑے ہیں کہیں بخیہ گر دیکھ لینا

کوئی شاد غم میں گرفتار الفت — کسی لب پہ آہ سحر دیکھ لینا

[illegible] سے سینہ گلستاں کسی کا — کوئی گل ہے داغ جگر دیکھ لینا

بلا دیتے دل تیرا نالے کسی کے — کسی کی فغاں بے اثر دیکھ لینا

کوئی ہوگا دھونی رمائے وہاں پہ — کسی کو کھڑے ننگے سر دیکھ لینا

کھانے کی [illegible] — خدا سب کی خون جگر دیکھ لینا

کہیں ہڈیاں طائر نامہ بر کی — کسی جا کبوتر کے پر دیکھ لینا

یہ ساماں [illegible] وہ کوٹھے پہ ہونگے — پھری ہوگی سب سے نظر دیکھ لینا

لحد ایک حسرت بھری [illegible] — لکھا شعر یہ لوح پر دیکھ لینا

تجھے اپنی آنکھوں کی سوگند قاتل
مری قبر پر اک نظر دیکھ لینا

صفیر بلگرامی

رباعی

اب ذکر شباب ہے کہانی افسوس — آگے قدر اس کی کچھ نہ جانی افسوس

تا نقش قدم تک نہیں ملتی ہے صفیر — کن پاؤں چلی گئی جوانی افسوس

اس نظم کا ہے مآل کیا خوب — طالب نے بڑی دی مثال کیا خوب

ہیں ہند میں ہندو اور مسلمان — چولی۔ دامن۔ ہیں دونوں برابر

دونوں مصباحِ ہند کے ہیں — دونوں یہ جناحِ ہند کے ہیں

دونوں مل کر رہیں جو یکذات

دن عید ہو شبرات ہو رات!

طالب بنارسی ایڈیٹر

مُلحِد اور صُوفی

ملحد تھا کل اک محفلِ احباب میں بیٹھا — باتوں میں جو کچھ آگیا واں ذکر خدا کا

بولا کہ ذرا سنئے جی دیکھئے یہ کہانی — بیفائدہ جھگڑا یہ دنیا میں بپا کب کا

ہے ذات سزاوارِ اطاعت بھی کوئی یاں — سچ پوچھئے تو وہم ہے انسان کا خاصا

پہلے تو ہی لگ کرنے یہ اوہام پرستی — پیپل کبھی پوجا کبھی برگد کو سراہا

دنیا کی پرستش کی کبھی کوہ کی تعظیم — طاعت میں بتوں کی کبھی گردن کو جھکایا

سورج کو سمجھ مسکنِ ارواحِ بزرگاں — برسوں یہ سرِ سجدے سے رگڑا کیا ماتھا

آخر ہوئی معلوم اُسے اپنی حماقت — جب فطرتِ عالی نے کیا اپنا تقاضا

سمجھا کہ بہت بھول تھی اصنام پرستی — سر ایسوں کی طاعت میں جھکانا تھا نہ زیبا

تب وہم نے ایجاد کیا پیکرِ موہوم — ہستی کا پتہ جسکی نہ رہنے کا ٹھکانا

لاہوت میں گاہے اُسے قائم کیا بالذات — پیہ آیشِ دنیا میں گہے محو دکھایا

دکھلایا گہے عرش پہ مصروفِ کتابت — گہ عالمِ بالا سے سرِ طور اُتارا

ف چراغ ۔ ع بفتح جیم ۔ بازو ۔ که یعنی یکدل ۔

جب آپ ہی کچھ دیکھا نہیں کیا شکوۂ تقدیر
یہ حضرت انسان کا خود ساختہ قصہ

ہستی ہی نہیں جب کوئی احساس کے قابل
چھپ جائے کہ مٹ جائے اسے معبود کا رتبہ

باتیں بھی جنہیں کہنے کو تو باقی ہیں جب تک
سے مجھ کو مگر تم نظر آئیں اچھا

لکھتے ہی یہ کرتا ہوں کفایت کہ تنہا
کرنا کبھی اس طرح کے ایمان کا دعویٰ

تقریر تو آخر ہوئی فلسفی کی بارے
سنّاٹا سا چہروں در و دیوار پہ چھایا

محفل میں تھے بیٹھے ہوئے اک حضرت صوفی
چہرے سے تھے آثار ریاضت کے ہویدا

ملحد کو کیا آپ نے نرمی سے مخاطب
اک شانِ فقیری سے لگے کہنے کہ بابا

ہم مانتے ہیں آپ کے یہ سلسلۂ [illegible]
کیا وجہ کہ خود ہم نے بھی یہ بھید نہ پایا

پر مجھ کو ذرا [illegible] ہے اتنا بتا دو
کچھ درکِ خدائی ہے بھی ہے آپ کو ملکہ

ملحد نے تبسم سے کہا واہ بہت خوب
حضرت کبھی ان باتوں سے ہیں یار و کہیں قائل

ہے غیر حواسِ خمسہ اور کوئی حس
دانا اسے ہرگز کوئی باور نہ کریگا

صوفی نے کہا منکر خورشید ہو گر بوم
کیا قابلِ تسلیم ہو پھر بوم کا دعویٰ

اچھا نہ سہی یہ بھی ہے اتنا تو مسلّم
کامل نہیں ادراک حواسِ خمسہ کا

ایسی بھی تو اشیا ہیں کہ ہیں اصل میں موجود
پر ظاہری حسّوں سے نہ احساس ہو انکا

ہیں دورِ فلک میں بہت اس طرح کے اجرام
کچھ جنکا پتہ آپ کی ہیئت نے نہ پایا

کیا اس سے یہ لازم ہے کہ محسوس نہ ہو جو شے
ہم اس پہ سرے سے کریں اطلاق نفی کا

سچ بات تو یہ ہے کہ خدا گر نہ بھی ہوتا
مشکل تھا بہت اس کی نفی آپ سے کرنا

حالانکہ خلاف اس کے یہ جلوہ گہِ قدرت
ہے صاف گواہِ صفتِ ہستیٔ اعلیٰ

اتنا تو بدیہی ہے کہ حرکت میں ہے جو چیز
لازم ہے کہ حرکت بھی اسے ہو کوئی دیتا

تو آنکھ اٹھا دیکھ ذرا منکرِ خلّاق
کس طرح سے گردش میں ہے ہر ذرّۂ دنیا

حرکت میں ہے تا سے یہ پتوں کو ہر اک شاخ — اشجار کو جنبش سی ہے بہا جاتا ہے دریا

اٹکھیلیوں میں باد نسیم سحری ہے — ہے ابر سرمست ہوا کھیت اچھالتا

کیا دیکھ کے یہ سب تجھے ہوتی نہیں حسرت — کیا اس سے بھی دل میں ترے نہیں آتا

حرکت کے لئے جان کا ہونا ہے ضروری — بیجان کوئی جسم نہیں آپ سے ہلتا

دکھلائی نہیں دیتی اگر جان بظاہر — تو جسم کی حرکت سے سمجھ جان کا ہونا

ملحد نے کہا یہ تو ہے سب بات پہ قبلہ — اس سے تو ہوا کچھ بھی نہ اثبات خدا کا

اجسام کی حرکت تو ہے قوت کے سبب سے — گر آپ نے حرکت سے پتہ جان کا پایا

اس سے ہوا قوت ہی کا اثبات نہ کچھ اور — ہے یوں بھی یہاں مادہ و قوت کے سوا کیا؟

جب تک کہ نہ ثابت ہو کوئی تیسری ہستی — کس طرح بھلا مان لیں ہم آپ کا کہنا!

صوفی نے کہا خیر بھلا یہ تو بتاؤ — کس طرح یہ سمجھیں کہ فلاں شخص ہے دانا

ملحد نے کہا یہ تو بہت دور کی رہ ہے — اے حضرت من اس میں ہے مشکل ہی بھلا کیا؟

جس شخص کی حرکات پسندیدہ نظر آئیں — بس سمجھو کہ رکھتا ہے وہ کچھ عقل سے حصہ

صوفی نے کہا ہائے صد افسوس کہ تم نے — با اینہمہ نقش قدم یار نہ پایا

گر عقل کا حرکات پسندیدہ ہیں معیار — پھر تیسری ہستی کا یہ انکار ہے کیا؟

کیا حرکت اجسام میں ترتیب نہیں ہے؟ — کیا عالم اسباب ہے بے واسطہ چلتا؟

کیا دہر یہ موجود ہے خود ذات سے اپنی؟ — کیا عقل نہیں مادہ و قوت کے علاوہ؟

تو دیکھ ذرا غور سے اے مدعی دہر — گر عقل نہ ہو جائے بگڑ دہر کا نقشا

اک پل پہ اگر جو نظام اس کا بدل جائے — دم بھر میں ہو سب مادہ و قوت تہ و بالا

اور ظاہری حالت کی اگر پوچھتے ہو تو — اتنا ہے عالم کی اسی طرح سے برپا

جتنی کوئی شے اشرف و اعلیٰ ہے جہاں میں — اتنی ہی وہ اسباب بدیہی سے ہے بالا

جس طرح ہے روغن کی نہاں دوغ میں ہستی — یا جیسے کہ چقماق میں آتش کا شرارا

ساقی نامہ

ہاں وہ ساغر دے ابھی ساقی کہ نوش آئے مجھے
حبِ قومی کے سوا سب ہو فراموش مجھے

قوم پہ اپنے فدا کر دے میرا جوش مجھے
اور آجائے عوض نشہ کے اک ہوش مجھے

مے پرستوں کا دل اے ساقی گلفام بڑھا
دیکھ وہ آئی گھٹا اس طرف ایک جام بڑھا

یاد ہے تجھ کو ہمارا وہ زمانہ ساقی
خم کا خم غیروں کی خاطر وہ لنڈھانا ساقی

عبرت انگیز ہے اب میرا فسانہ ساقی
پھر میں ہو جاؤں وہی مے وہ پلانا ساقی

ہے دعا ساقی ہمیشہ تیرا دل شاد رہے
تیرا میخانہ علیگڈھ کا وہ آباد رہے

مے وہ دے مست کہ پیدا ہو حمیت دل میں
اور آجائے عوض نشہ کے غیرت دل میں

جب کہ آجائے وہی پہلی سی ہمت دل میں
پھر وہی ہم ہوں وہی قوم کی الفت دل میں

پیدا ہو جائے سر نو سے میری شان وہی
تب یہ ثابت ہو کہ ہم بھی ہوں مسلمان وہی

اور اک جام کوئی ایسا پلا دے مجھ کو
یعنی اس قوم کا دیوانہ بنا دے مجھ کو

سو رہا ہوں میں زمانے سے جگا دے مجھ کو
مژدہ قومی کوئی آج سنا دے مجھ کو

آج رندوں میں صبا جا کے پکار آئی ہے
سنتے ہیں پھر میرے گلشن میں بہار آئی ہے

ولولے پھر یہ ہوئے ہیں وہی پیدا دل میں
شوق کا امڈا چلا آتا ہے دریا دل میں

آرزو سیکڑوں لاکھوں ہیں تمنا دل میں
کیا کہوں تجھ سے میں ساقی کہ ہے کیا کیا دل میں

ہے ارادہ کہ لگاؤں گل مقصد کا چمن
رشکِ گلزار جناں یعنی ہو سید کا چمن

دیکھیں اس کام میں کس طرح سے کد کرتے ہو
کس قدر آج تم آپ اپنی مدد کرتے ہو

اب تو یہ رکتا ہوا کام نہیں آتا نظر — اب یونیورسٹی بے شبہ رہیگی ہو کر
چاہے ٹل گیا تم کو خیال اس کا مگر — قومی الزام نہ رہجائے کہیں گردن پر

سر فدا کردو اگر پاس اک حبہ نہ رہے
ہاں مگر دامنِ غیرت پہ یہ دھبہ نہ رہے

انجم از گیا

فغانِ سخن

مرحبا اوجِ بے نشانِ سخن — لامکاں بن گیا مکانِ سخن
لوحش اللہ ترقی معکوس — ہیں تہِ خاک آسمانِ سخن
تو نے لب بند کر دیے سب کے — حبذا لذتِ بیانِ سخن
ہو گئے اک جہاں کے دل ٹھنڈے — تجھ سے اے باغ بخزانِ سخن
کر دیا تو نے آج صُمٌّ بُکمٌ — نالۂ صور بفغانِ سخن
رفتہ رفتہ بنی زمانے میں — خواب گونگے کا داستانِ سخن
بن گئے آئینۂ سرِ دیوار — طوطیانِ شکر لبانِ سخن
دم بخود مثلِ پیکرِ تصویر — بلبلانِ غزلستانِ سخن
لحنِ داؤد سے ترے دم خشک — ہو گیا بحرِ بیکرانِ سخن
تیرے اعجازِ موسوی سے ہوئے — تہ نشیں گنجِ شایگانِ سخن

قول کے ٹھیک بات کے پورے　　اور سچ تیغ کے راز دانِ سخن
گرچہ اس وقت میں بھی جتا تھا　　ایک سے ایک ہمعنانِ سخن
لڑتے بھڑتے گذار دیتے تھے　　عمر کی عمر پہلوانِ سخن
چھینوں سے بیٹھتے نہ تھے دم بھر　　ہم نبردان و ہمنفسانِ سخن
صلح پر تھی بنائے جنگ مگر　　پاک باطن تھے کاملانِ سخن
لوٹتے جاتے تھے جیتے جاتے تھے　　دانۂ سبحہ تھے یلانِ سخن
چھپتی جاتی تھی گھستی جاتی تھی　　تھی زبانِ قلم زبانِ سخن
قطعہ پہ قطعہ سینکڑوں لکھتے تھے　　ماتمی اس پہ کاتبانِ سخن
جانتے تھے ودیعتِ عظمیٰ　　تھے دل و جاں سے پاسبانِ سخن
بے طلب انکے روبرو زر و مال　　پیش کرتے تھے طالبانِ سخن
سب کے دامانِ دولت و اقبال　　سر پہ تھا سب کے سائبانِ سخن
فارغ البال خوش گذر خوشحال　　کھاتے پیتے تھے آب و نانِ سخن
اہلِ عالم تھے قدردان انکے　　اور وہ آپ قدردانِ سخن
خود مناتے تھے قوم کے سلطان　　روٹھ جاتے تھے گر شہانِ سخن
ملک گیری میں فوج کے آگے　　طبل و قرنائے افسرانِ سخن
کود پڑتے تھے یا علی کہکر　　رزم میں شیر بیشگانِ سخن
زنگ آلودہ تیغ بے صیقل　　صاف کر دیتی تھی فسانِ سخن
فوج کو مردہ دل جو پاتے تھے　　پھونک دیتے تھے بڑھ کے جانِ سخن
کارنامے گئے زمانے کے　　چھیڑ دیتے تھے ناقلانِ سخن
ہر طبیعت میں جوش ہو پیدا　　یوں سناتے تھے داستانِ سخن
باتوں باتوں میں دل بڑھاتے تھے　　سحر پیشہ تھے حاکیانِ سخن

یا مجاز امسیح مرسل تھے سب رجز خوان و وادیانِ سخن
اُن کا ہر نعت تیغ جوہر دار اور ہر لفظ اک سنانِ سخن
حامیِ فوج ہادیِ اسلام افسرِ قوم رہبرانِ سخن
محفلیں رات دن سجاتے تھے اوستادان و پیروانِ سخن
ہوتے رہتے تھے روز گھر بیٹھے صاف طینت سے امتحانِ سخن
آج ڈیرے کہیں کل اور کہیں تھے جہاں گشت رہبرانِ سخن
جمع ہوتے تھے منزلوں چل کر جوق در جوق کاروانِ سخن
میہمانوں کی پیشوائی کو گھر سے بڑھتے تھے میزبانِ سخن
تھی ہر اک بزم میں جگہ انکی میرِ محفل تھے قدردانِ سخن
عرش پر کیوں نہ ہو دماغ ترا مرحبا اوجِ آسمانِ سخن
زیبِ منبر ہوں صاحبِ معراج اور منبر ہو نردبانِ سخن
تھی خدا کے حبیب کو محبوب اَیُّھَا القَوْمُ عزّ و شانِ سخن
سب کو پیارے کی ہر ادا پیاری ایک تم مدعیِ جانِ سخن
ہے غنیمت دمِ درود پڑھو تازہ ہو جب ایتگی روانِ سخن
پڑھتے آتے ہیں عطر و گل پہ درود اہلِ بستان باغبانِ سخن
غنچے غنچے کو دل میں رکھتے ہیں عندلیبانِ نغمہ خوانِ سخن
یا ہوا سے سجاتے ہیں دامن خود ہوا خواہ بوستانِ سخن
ذلیلوں کو ہے آئینے سے گریز سرو سے ٹیڑھی قمریانِ سخن
نت خسانے نکالتی ہیں ہزار آن گلشن میں لولیانِ سخن
وقت بے وقت کی اڑاتے ہیں ساقیانِ و مغنیانِ سخن
شاخ سے مثل برگِ خشک الگ نونہالانِ خوشقدانِ سخن

دہلی و لکھنؤ جو باقی تھے — جانِ اہلِ زبان و کانِ سخن
خاتمِ شان و شوکتِ اسلام — آخری نوبتِ شہانِ سخن
جنکے دیوانِ خاص و عام میں تھے — میر منشی تھے منشیانِ سخن
جنکے دربار گرم رکھتے تھے — ناثر و ناظمِ جہانِ سخن
آجتک جنکے بام و در پہ ہیں — نام و القابِ صاحبانِ سخن
آجتک جنکے پھوٹے کھنڈروں میں — دفن ہے دولتِ نہانِ سخن
آجتک جنکے نام سے رائج — سکۂ نقدِ رائگانِ سخن
آجتک جنکی گلی گلیوں میں — کچھ مسلم بھی ہیں مکانِ سخن
جوہری جنکے چوک میں اب تک — ہیں سجائے ہوئے دکانِ سخن
دو زیادہ کہیں تو چار کہیں — حسبِ قدرِ ناقدانِ سخن
جنکے باغوں کے اجڑے تختوں میں — ہیں ابھی چند باغبانِ سخن
جنکی پایاب ندیوں میں ابھی — تیرتے ہیں شناورانِ سخن
جنکی روندی ہوئی کچھاروں میں — ہیں نہاں شیر بیشگانِ سخن
جنکی پامال مرغزاروں میں — چلتے پھرتے ہیں اعیانِ سخن

(ثاقب بدایونی)

تازہ غزلیں

(از جناب میر حسن صاحب جعفری نسیل)

زہے تو یاد آ وہ دوستی کا گزرا ہے — کبھی کچھ ہم سے تجھ سے بھی تو تھی بیداد گر پہلے

تم نے بہت ... آنکھوں کی تمنا ایک جھلک تو ہے — لی تھی مجھ سے جو صبر آزما نیچی نظر پہلے
گیا دل اور اثر بھی ساتھ ہی لیتا گیا ظالم — نہیں معلوم ہم تشنہ تھے ہم بے اثر پہلے
ترے قربان ساقی مجھ کو مستغنی کیا تو نے — لئے پھرتی تھی میری تشنہ کامی در بدر پہلے
نگاہوں میں تو اب آئی ہے بیباکی و عریانی — بہت ہی بھولے بھالے تھے ترے تیر نظر پہلے
ترے قدموں پہ آنسو ٹوٹ کر گرنے نے پہنچایا — جھکا تھا ورنہ کب کس کے لئے بسمل یہ سر پہلے

امین الحسن رضوی بسمل

آشنا جب کہ ترے نام سے لب ہوتا ہے — بات کا آخری حصہ وہ غضب ہوتا ہے
ہاتھ پر دل میں ہیں تیرے نذر کے سب موجود — بے نیازی میں عجب حسن طلب ہوتا ہے
مہربانی بھی رلاتی ہے لہو اب جاناں — آپ کا لطف بھی گریہ کا سبب ہوتا ہے
نامہ بر ان کو جو راضی نہ کیا کچھ نہ کیا — بات کرنے کا بھی کہتے ہیں کہ ڈھب ہوتا ہے
آنکھ کھل جائے اگر دیکھ لیں سونے والے — وہ دل آویز سماں آخر شب ہوتا ہے
مہر و مہ میں بھی تو اک جلوہ گری ہے لیکن — دل کے کھنچنے کا کوئی اور سبب ہوتا ہے
بے نیازی کا ہے الزام جو چپ رہتا ہوں — اور کہتا ہوں جو کچھ ترکِ ادب ہوتا ہے
وہ زباں سے تو چکے ہیں مگر ایفا کا خیال — دیکھنا یہ ہے کہاں اور یہ کب ہوتا ہے
ہر بگولے نے کیا تربتِ مجنوں کا طواف — ادب آموز محبت کا ادب ہوتا ہے
یوں سمجھ لیجئے ہر کام کی علت ہے ضرور — کچھ نہ کچھ شکر و شکایت کا سبب ہوتا ہے

میری غزلوں کی ہوئی قدر مرے بعد حفیظ
کوئی ہر شعر پہ اب داد طلب ہوتا ہے

حفیظ جونپوری

(از جناب یاس عظیم آبادی تلمیذ جناب شاد)

[illegible] فانی کا کچھ ہوش رہا
چار دن تک تو جوانی کا عجب جوش رہا

میں قفس میں بھی [illegible] خاموش رہا
کشمکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا

نشۂ الفت ساقی کا عجب جوش رہا
[illegible] صحرائے قیامت بھی فراموش رہا

محو سنتے رہے اب [illegible]
حشر میں یوں ہی کھولے ہوئے آغوش رہا

[illegible]
فصل گل کا جو تلطف تھا یہ ہی جوش رہا

[illegible]
یہ تو کروٹ بھی بدلنے کا نہ کچھ ہوش رہا

رحمت حق رہی ہم [illegible] پہ سایہ فگن
سر پہ چھایا ہوا اک ابر خطا پوش رہا

جبر قسمت ہے بہت ہو کہ [illegible] ظلم برپا
تجھکو اے اشک ندامت جو یہی جوش رہا

کیا خطا مجھ سے ہوئی کون سی عالم میں [illegible]
عمر بھر کس لئے محروم یہ آغوش رہا

نال دل ہو گیا حسرت کی نگاہوں سے خیال
ٹکٹکی باندھے ہوئے میں یوں ہی خاموش رہا

اٹھتے اٹھتے تھی وہی بزم کی مستانہ روش
چلتے چلتے بھی خم مے کو وہی جوش رہا

دو قدم ہی گئی منزل مقصود مگر
رہرو عشق کی ہمت کا وہی جوش رہا

پھر گئیں آنکھیں مری کوچۂ جاناں کی طرف
شکر ہے مرتے دم اتنا تو مجھے ہوش رہا

یاس نے ساتھ نہ چھوڑا کبھی مرتے مرتے
تیرے قدموں سے لگا صورت پاپوش رہا

(از جناب بیتاب عظیم آبادی)

شادمانی کا کبھی غم کا کبھی جوش رہا
ایک سودا رہا جب تک کہ مجھے ہوش رہا

غرق دریائے محبت دل پر جوش رہا
اے خوشا قطرہ جو قلزم سے ہم آغوش رہا

رخ پر نور سے بس انکا اٹھا تھا نقاب
کون کمبخت تھا ایسا کہ جسے ہوش رہا

روح پرور وہ صدا اور وہ تسلی جاں بخش
ہمہ تن چشم رہا میں ہمہ تن گوش رہا

لے سحر آتی ہے دم توڑ رہے ہیں عاشق — تو کہاں شام سے او وعدہ فراموش رہا

ڈگمگاتے ہی رہے ہم تا لبِ کوثر پہنچے — بعد مرنے کے بھی ساقی کا ہمیں ہوش رہا

کیا اثر رکھتی ہے مستانہ نظر ساقی کی — جس کو مدہوش کیا اس نے وہ مدہوش رہا

خود سفینہ مرا پہنچے گا لبِ ساحل تک — بحرِ امواجِ بقا کو جو یونہی جوش رہا

تیر بسمل تو تڑپنے کو سمجھتا ہے حرام — نہ اڑیں خون کی چھینٹیں یہ وفا کوش رہا

کیا برا حال ہے بلبل کا قفس میں صیاد — گو بہار آئی تو وہ خاموش کا خاموش رہا

نظر آتا رہا ساقی رخِ نورانی دوست — جب تلک ہاتھ میں جام مئے سرجوش رہا

دل ہو یا جان ہو یا چشمِ تماشائی ہو — جو ترا محرمِ اسرار تھا خاموش رہا

ساقیا بزم میں یہ فرقِ مدارج کیسا — کوئی مدہوش ہے پی کر کوئی بے ہوش رہا

بے دھڑک بھیڑ میں محشر کی وہ آیا تیرا — دیکھ لینا جو کسی ایک کو بھی ہوش رہا

مطمئن قلب ہوا راحتِ روحانی ہو — اب نہ وہ شوق کی تکلیف نہ وہ جوش رہا

درد اٹھتے ہی تڑپنے لگا وہ محرمِ راز — جو ادا سے تیری واقف تھا وہ خاموش رہا

بجھنے والا نہیں اے روح کبھی تیرا چراغ — نہ رہے گا نہ کسی وقت وہ خاموش رہا

اک شبِ ہجر پہ موقوف نہیں اے بیتاب
جب پڑی سخت مصیبت تو میں خاموش رہا

کتنی مے دی مرے ساقی نے مجھے [illegible] — جام میرا تو ہمیشہ تہِ سرپوش رہا

نہیں معلوم مرا زخمِ جگر کیسا ہے — چارہ گر دیر تلک دیکھ کے خاموش رہا

(اکبر عظیم آبادی)

وصل کی رات کوئی بات بھی منہ سے نکلی؟ — یوں تو کہنے کو میں کہدوں کہ مجھے ہوش رہا

میری بالیں پہ وہ اغیار کے ساتھ آئے تھے — یہ سبب تھا کہ میں بیہوش کا بیہوش رہا

سید محمد محی الدین تمنا

شائقین کتب ملاحظہ فرمائیں

(سنگلاخ کتابوں کا حل!)

مندرجہ ذیل کتابیں کوئی حل نہ کر سکا اور نہ کوئی انشاء اللہ حل کر سکتا ہے
یعنی پتھروں کو پانی کر کے بہا دیا۔ دیکھنا شرط ہے۔

حل قصائد خاقانی۔ مخذ کورس منشی فاضل ایم اے حصہ اول ۱۲ر
حصہ دوم زیر طبع ہے۔

یہ واقعہ اس لئے کہ ہم کو پتھروں سے پناہ نہیں جو گھاٹ میں لگ رہتے ہیں۔ اگر کوئی مرد میدان آئے تو دوسرا حصہ حل کرے۔ مشکل قصائد میں نے حل کر دئے آسان باقی ہیں

حل کلیات اردو۔ مرزا غالب مرحوم ۱۰ر
حل قصائد خاقانی۔ کورس منشی عالم ۹ر
حل نکات۔ مولانا مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ در تصوف ۱۲ر
شوکت التجدید۔ میر کلیات جو قصائد و غزلیات و رباعیات و سلام اور اردو اور بھاشا وغیرہ کی نظم سے مرصع ہے اور شاعری کی دنیا جس کی منتظر ہے پیشگی قیمت آتی ہے زیر طبع ہے پیشگی عہ اور بعد طبع عہ

اعلان عام۔ جو صاحب کامل شاعر بننا چاہیں میری جانب رجوع لائیں۔ جیسا کہ کلام ہوگا اسی درجے کی اصلاح ہوگی۔ کلام بھیجکر آزمالیں۔ جو صاحب کسی کتاب اردو۔ فارسی۔ عربی میں اصلاح لینا چاہیں فیس کے بارہ میں مراسلت کریں
اکثر کتابوں کا لٹریچر بلکہ املا تک صحیح نہیں ہے تا غلطیوں کو مجدد ہی خوب جانتا ہے

مجدد السنۂ مشرقیہ۔ احمد حسن شوکت شہر میرٹھ

ہاف ٹون عکسی تصاویر

(شائقین جلد منگوائیں)

علمی و ادبی دنیا کے جن مشاہیر کی تصویریں وقتاً فوقتاً رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہی ہیں
ان میں بعض ایسی ہیں جنہیں کثر صاحبان علیحدہ علیحدہ اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں۔ اس لئے
ان کی کچھ زائد کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ جو اب برائے فروخت پیش کی جاتی ہیں۔ قیمتیں حسب ذیل ہیں :-

۱۔ حضرت داغ دہلوی مرحوم قیمت ۲ر
۲۔ شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی مرحوم ۲ر
۳۔ پروفیسر میکس میولر (مع نمونہ دستخط انگریزی و بخط فارسی) ... ۲ر
۴۔ گروپ امیر مینائی مع مرحوم و منشی میر تسلیم و احسان و آسی ... ۲ر
۵۔ منشی درگا پرشاد صاحب نادر بنارسی ۲ر
۶۔ حضرت جلال لکھنوی (مرحوم) ... ۲ر

تصاویر مصر و روم

ہز ہائی نس عباس حلمی پاشا (خدیو مصر) ۴ر
والی بروسہ کے ساتھ تین مہمان (جلال انسی بے شیخ حسین قدوسی و شیخ عبد القادر) ... ۴ر
جامع سلطان احمد (استانبول) ۴ر
ان تینوں تصویروں کی فقط چند کاپیاں موجود ہیں۔

چشمۂ سلطان و قیصر ولیم (استانبول) ۱۰ر
قصر یلدز (جس میں جلوس سلطانی کی بھی تصویر ہے) ۱۰ر
غلطہ کا بڑا پل (استانبول) ۱۰ر
خزینۂ ہمایوں کا دروازہ ۱۰ر
کارخانہ ابریشم (بروصہ) ۱۰ر
درویشان طریقت مولانا روم ۲ر

متفرق

فرانسیسی پیم کاتنے کا چرخہ (بچوں کے لئے) ار
قصر مصنوعات زمانہ (نمائش لندن) ار

درخواستیں بنام مینیجر مخزن میکلگن روڈ۔ لاہور آنی چاہئیں

ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا ریویو

ہندوستان کی اسلامی تاریخ مصنفہ مولوی کرم الٰہی صوفی پر

مخدوم و مکرم جناب مولوی کرم الٰہی صاحب السلام علیکم۔ میں نے آپکی کتاب اسلامی تاریخ عہد افغانیہ شروع سے لیکر آخر تک پڑھی۔ یہ کتاب نہایت مکمل لکھی گئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے مسلم اسکی بہت قدر کرینگے۔ تاریخی تحقیق کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اکثر مقامات اس کتاب کے قابل داد ہیں اور آپ کی قوت استدلال اور درایت تاریخی کو ثابت کرنے کے علاوہ اس بات پر نہایت قوی حجت ہے کہ ہندوستانی مسلموں میں مذاق تاریخ نویسی ابتک زندہ ہے اور ابھی قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنی تاریخ کو غیر اقوام کے حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی تاریخ کے واقعات کو مورخانہ نگاہ سے دیکھنے والے لوگ اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ عام پڑھنے والے لوگ بالخصوص مسلم جنکی قومی روایات کی یہ کتاب ایک نہایت روشن اور صحیح تصویر ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اخلاق کا فلسفہ کے وہ گرانقدر اصول سیکھ سکتے ہیں۔ جو انکی قوم کے باامتیاز رہے ہیں اور جنپر عمل کرنے سے حجاز کے صحرا نشین تھوڑے ہی سال کے اندر شتربانی سے جہانبانی تک پہنچکر اقوام قدیمہ کی تہذیب کے وارث اور تہذیب جدید کے بانی ہو گئے۔ تاریخ کا مقصد اگر اخلاقی ہے اور میرے خیال میں تاریخ کا یہی مقصد ہونا چاہیئے) تو آپکی تصنیف اس مقصد کو بدرجہ اتم پورا کرتی ہے اور میں بحیثیت ایک مسلم ہونے کے آپکا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ کتاب عین ضرورت کے موقع پر لکھکر اپنی قوم پر احسان کیا۔ قومیت کا احساس جسکو بالفاظ دیگر قومی خودداری کہنا چاہیئے۔ قومی زندگی کے لئے ضروری ہے اور جن وسائل سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے وہ بھی قومی حیات کے لئے ضروریات میں سے ہیں۔ پس اس اعتبار سے آپکی کتاب کا مطالعہ ہر مسلم پر واجب ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں ہر مسلم خاندان اس کتاب کے پڑھنے سے مستفیض ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی محنت اور جانکاہی کا اجر دے اور اس کا انعام آپکو اس مقدس رسول کی بارگاہ سے ملے جسکے کام سے بنی نوع انسان کی نجات اور جس کے نام سے ہماری قومیت وابستہ ہے۔ والسلام

آپکا خادم **محمد اقبال** بیرسٹر ایٹ لا لاہور

نوٹ :۔ یہ کتاب مولوی کرم الٰہی صاحب صوفی۔ ڈنگہ ضلع گجرات سے مل سکتی ہے۔

ح

شائقین علم و ادب اس نادر موقع سے فائدہ اٹھائیں

خاص رعایت

مخزن کے گذشتہ پرچوں میں

صرف جنوری سنہ ۱۹۱۲ء تک

اکثر احباب مخزن کی گذشتہ جلدوں کی نسبت دریافت فرماتے ہیں۔ شائع میں شروع اجراء ۱۹۰۱ء تک کے مختلف پرچے بہت تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ انکی کوئی جلد مکمل نہیں ہوسکتی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں دو پرچے جنوری اور فروری کے بالکل نہیں۔ باقی پرچے موجود ہیں۔ یہ قسم اول اور دوم دونوں کی جلدیں ہیں۔ قسم دوم کی بعض جلدیں مکمل بھی ہیں +

سنہ ۱۹۱۱ء کے پرچے تمام دکمال موجود ہیں۔ ہر دو قسم کے جو احباب ہم سے گذشتہ متفرق پرچے منگانا چاہیں۔ انکے ساتھ ہم یہ رعایت کرینگے کہ فیصدی ۲۵ کمیشن دینگے۔ یعنی ایک روپیہ کے ۱۲ کے لیے جا ئینگے۔ یہ رعایت ۱۵۔ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ء سے آخر جنوری سنہ ۱۹۱۲ء تک دربار تاجپوشی ملک معظم دام ملکہٗ کی خوشی میں دکھائی ہے

نوٹ:۔ مخزن سنہ ۱۹۱۰ء کے پرچہ ہائے جنوری و فروری۔ قسم اول اگر کوئی خریدار صاحب فروخت کرنا چاہیں تو براہ کرم مینجر مخزن سے خط و کتابت کریں + سنہ ۱۹۰۹ء اور اس سے قبل کے سنین کے پرچوں کی بھی خریداری کی جاسکتی ہے۔ متفرق ہوں۔ یا مکمل جلدیں نیز مناسب کمیشن پر مخزن کی گذشتہ مکمل جلدوں کے بکوا دینے کا اہتمام ہوسکتا ہے +

المشتہر:۔ مینجر مخزن لاہور۔

نقشہ پر بڑے بڑے قطعے برطانیہ کے رنگ سے رنگے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان
سب پر انگلستان کا علم "یونین جیک" لہرا رہا ہے۔ یونین جیک اسوقت لفظاً
ومعناً اتفاق و اتحاد کا پھریرا۔ امن و آزادی کا جھنڈا اور فتح و نصرت کا نشان
ہے۔ جہاں کہیں یہ پہنچتا ہے۔ امن و آزادی کی برکتیں صنعت و تجارت۔ اور ترقیِ
دولت کی صورت میں اس کے ساتھ ساتھ جاتی ہیں۔ جنگل سرسبز اور ویرانے از سرِ نو آباد
ہوتے ہیں۔ اور لوگ خوشحال ہو کر تاجِ برطانیہ کے منت پذیر اور شکرگذار بن جاتے
ہیں۔ عروج و اقبال کی انتہا ہے کہ یورپ کے اس چھوٹے سے جزیرے میں بیٹھے
ہوئے جسے انگلستان کہتے ہیں۔ وہاں کا فرمانروا اور اس کے وزرا اطرافِ عالم
پر حکومت کریں۔ اور سات سمندر پار ان کا سکہ اسی سہولت سے رواں ہو جیسا
کہ خود پایہ تخت لندن میں۔ اور یہ انتہائی اقبال خدائے لایزال نے اسوقت
برطانیہ و شاہ برطانیہ قیصر ہند کو عطا کیا ہے اور یہ وہ اقبال ہے جو اس مبارک
سال میں بنفسِ نفیس ہند اور اہلِ ہند کے سروں پر سایہ فگن ہوا۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جہانتک تاریخ سے پتا چلتا ہے۔ شاید یہ پہلا موقعہ
ہے کہ کسی بادشاہ نے ایک ملک سے دوسرے ملک میں آ کر جس میں بحر و بر کے ہزاروں
میل حائل ہوں۔ اس جاہ و حشم کے ساتھ جشنِ تاج پوشی منایا ہو۔ اور کم از کم یہ تو مسلم
ہے کہ تاریخِ انگلستان میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا واقعہ ہے اور ہندوستان کی تاریخ
بھی باوجود اپنی گوناگونی کے اس قسم کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ شہنشاہ
جارج پنجم کا یہ خاص احسان رعایائے ہند کو کبھی نہ بھولے گا۔ کہ انہوں نے اور ملکہ
معظمہ نے ایسے دور دراز سفر کی تکلیف صرف اس لئے برداشت فرمائی کہ اہل
انگلستان کو اور دیگر ممالک محروسہ برطانیہ کے اہل کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی
نگاہ میں مملکتِ ہند خاص قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اور وہ اسے اپنے عظیم الشان وراثہ کا

جو انہیں اپنی نیکدل دادی ملکہ وکٹوریہ آنجہانی اور اپنے والد بزرگوار شہنشاہ
ایڈورڈ ہفتم سے ملا ہے۔ ایک اصلی جزو سمجھتے ہیں۔ اس الطافِ شاہانہ سے
یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ وزرائے سلطنت شہنشاہ کی طرف سے یہ اشارہ پاکر
امورِ ہند کو محض ایک ضمیمہ امورِ سلطنت کا نہ سمجھیں گے۔ بلکہ ایسی توجہ کرینگے
جو اس کی اہمیت کے شایانِ شان ہو۔ خاص کر یہ توقع بیجا نہیں کہ اس
موقعہ پر وزرا میں سے جناب وزیر ہند بہادر کا ہمرکاب ہونا غالباً ہندوستان
کے لئے نہایت منفعت کا باعث ہوگا۔ اور ذاتی تجربے اور مشاہدے
کے جو خزانے وہ یہاں سے ان چند دنوں میں بھی اپنے ساتھ لیجائینگے۔ وہ
آئندہ نظم و نسق سلطنت ہند میں انکے بہت کام آئینگے۔

تیسری خصوصیت جو قابلِ ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ شہنشاہ کے سفر و حضر میں
بیسویں صدی کی تازہ ترین ترقیاں سب کی سب مدد و معاون ہوئی ہیں اور
اُن کے یہاں تشریف لانے کا ہر ایک مرحلہ سائنس کا ایک کرشمہ تھا اور
دربار کے سین کا چھوٹے پیمانے پر ملک کے ہر حصہ میں دہرایا جانا اس زمانے
کے معجزوں میں سے ایک اعجاز تھا۔ جنگی جہازوں نے سمندر کے سفر میں شاہی
جہاز کی پاسبانی کی۔ اور بے تار تار برقی نے جہاز پر خبر رسانی کی۔ جو چیزیں
آج کل سائنس نے ممکن کر دکھائے ہیں کسی زمانے میں معجزے سمجھے جاتے۔
جہاز سمندر میں جا رہا ہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے۔ سوائے پانی اور حدِ نگاہ کے
کچھ نظر نہیں آتا۔ شاہِ عالم پناہ جہاز پر سوار جا رہے ہیں اور خبر آتی ہے کہ
"انگلستان میں حضور کے اقبال سے ہر طرح خیر و عافیت ہے"۔ یہ اس زمانہ کا
اعجاز نہیں تو کیا ہے۔ راہ میں جو اظہار دبدبہ برطانیہ کے اثر کا جابجا ہوا ہے وہ
بھی غیر معمولی ہے۔ اٹلی اور ٹرکی کی لڑائی جہاں ہو رہی ہے اس راہ سے شہنشاہ

جارج پنجم کی بحری سواری گزری ہے۔ مگر اللہ رے اثر۔ کہ اہلِ اٹلی نے
چند روز اپنے جنگی جہازوں کی حرکت موقعۂ حرب کی طرف ملتوی کر دی کہ
شاہِ جمجاہ کی سواری امن و آسائش سے گذر جائے۔ اٹلی اور ٹرکی آپس
میں حریف ہیں مگر برطانیہ کی صلح پسندی اور حکمت دیکھئے۔ کہ برطانیہ کے
دونوں دوست ہیں۔ سُلطان المعظم کا سب سے بڑا شہزادہ ٹرکی کی جانب
سے تحفۂ سلام و پیام لیکر شہنشاہِ جارج پنجم سے مصر کے قریب ملتا ہوا ۔
اس تقریبِ سعید پر سلطان المعظم اور نیز اپنے ملک کی طرف سے شہنشاہ کو
مبارکباد دیتا ہے۔ یہ خیرِ مقدم جو جابجا چلا آیا ہے: بمبئی آکر اس کی حد
ہوجاتی ہے۔ جس سرگرمی جس جوش اور جس خلوص کے ساتھ رعایائے
ہند نے بمبئی میں بہ سرکردگی حضور وائسرائے و گورنر جنرل کشورِ ہند
اپنے بادشاہ اور ملکہ معظمہ کو خوش آمدید کہا ہے۔ اس کی خوشگوار
یاد امید ہے کہ خود قیصرِ ہند و قیصرۂ ہند کے دلوں پر گہرا نقش چھوڑیگی۔
اور پھر دہلی میں تو رعایا کی وفاداری کا جوش اور ریاستہائے ہند کے
والیانِ ریاست کی صداقت اپنے انتہائی نقطہ پر پہنچ گئی۔ دہلی دربار
کے موقعہ پر ہر شہر اور ہر قریہ میں جو جلسے ہوئے۔ اُن سے نہ صرف
یہ ثابت ہوا کہ انتظامِ برطانیہ کا تار و پود مکمل ہے اور اس میں کہیں
ایک تار بھی ٹوٹا ہوا نہیں۔ بلکہ یہ بھی واضح ہوگیا۔ کہ ملک کے ہر حصے
میں اور رعایا کے ہر طبقے میں گہرا جوشِ محبت اور ارادت کا تاج
برطانیہ و خاندانِ شاہی کے ساتھ ہے۔ جو صرف ایسے موقعہ کا منتظر
تھا۔ ۱۲۔ دسمبر کی رات کے چراغان نے تمام قلمروِ ہند کو بُقعۂ نُور بنا دیا
تھا۔ اور لوگوں نے اس قدر خوشی منائی کہ کسی کا یہ قول بالکل درست

معلوم ہوتا ہے کہ دن کو عید کا اور رات کو دیوالی کا سماں تھا۔ فقط
بیان تشبیہ میں یہ کمی رہ گئی کہ عید کے دن فقط مسلمانوں میں چہل پہل
ہوتی ہے۔ مگر اس دفعہ عید کے دن ہندو و مسلمان عیسائی سب یکساں
اور یکجا خوشیاں مناتے تھے۔ اور دیوالی کی رات کو صرف
ہندو چراغاں کرتے ہیں اور ۱۲۔ دسمبر کی رات کو ہندو مسلمان عیسائی
سب اپنے اپنے مکانوں کو جگمگا رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے
کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خوشی کے کئی تیوہار ایک تیوہار کے اندر جمع
کر دیئے گئے ہیں۔ اور جوش وفاداری کا سارے ملک میں ایک سیل
امڈ آیا ہے جس کی لہریں یقین ہے کہ بغاوت و فساد کے خس و خاشاک
کو بہالے جائینگی اور ملک کو فتنہ سے پاک کر دیں گی۔ اگر اس عالیشان
دربار سے یہ نتیجہ مترتب ہوا۔ تو جو تکلیف ہمارے شہنشاہ نے فرمائی ہے
اور جو مصارف کثیر اس تقریب پر ہوئے ہیں سب کا بدل مل جائیگا
خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اور خدا شہنشاہ جارج پنجم اور انکی ملکہ معظمہ
کو باین ہمہ الطاف و کرم تا دیر سلامت رکھے +

ایڈیٹر

شہنشاہ اور مسلمان رعایا

ہرچند کہ جشنِ دربارِ تاجپوشی کی خوشی میں ہر قوم گرمجوشی سے شریک ہے
مگر مسلمان رعایائے ہند کو جو خاص تعلقات تاج برطانیہ اور خاندانِ شاہی کے
ساتھ ہیں۔ اُن کی بنا پر گروہ اوروں سے کسی قدر زیادہ گرمجوشی دکھائے تو
وہ حق بجانب ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ذمہ شکر واجب بھی زیادہ ہے۔ اُنکی
حالت اس وقت ملک میں بلحاظِ تعداد و دولت نسبتاً کمزور ہے۔ اور وہ بغیر
گورنمنٹ کی خاص توجہ اور مہربانی کے ترقی نہیں کرسکتے۔ گذشتہ
نیم صدی میں گورنمنٹ کی طرف سے کئی طرح کی توجہات اُن کے حال
پر ہوتی رہیں۔ جن کی بدولت اُنہوں نے تعلیم میں اور اثر و اقتدار
میں بہت سی کمی پوری کی اور بہت سی کھوئی ہوئی چیزیں پھر پائیں
گورنمنٹ نے اُن کی امتیازی ہستی کی اہمیت کو تسلیم کرکے اُن کی
حوصلہ افزائی فرمائی اور اُن کے حقوق کا اعتراف کیا۔ یہ سب
امور اُن سے دلی تشکر کے مستحق ہیں۔ اُن کے علاوہ یہ بات ظاہر
ہے اور بارہا کہی جاچکی ہے۔ لیکن پھر دُہرائے جانے سے اسکی
خوبی اور دلچسپی میں کچھ کمی نہیں آسکتی کہ دُنیا بھر میں سب سے زیادہ
تعداد مسلمانوں کی تاج برطانیہ کے زیرِ سایہ امن و آرام سے زندگی
بسر کر رہی ہے۔ اور یہ خاص تعلق مسلمانوں اور انگریزوں کے اغراض
کو ایک دوسرے سے ایسا وابستہ کرتا ہے کہ ایک کی بھلائی

دوسرے کی بھلائی سے مربوط اور اس پر منحصر ہو جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً گورنمنٹ انگریزی نے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کا لحاظ اس خوبی سے کیا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں کو اس نے تسخیر کر لیا ہے۔ اور یہ خاندان شاہی جس کے رکن رکین اس وقت شہنشاہ جارج پنجم قیصر ہند ہیں۔ اس قسم کی تسخیر میں ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ چنانچہ مسلمان نہایت ہی صداقت سے اس امر کے قائل ہیں کہ اس دربار کی تقریب پر جبکہ شہنشاہی پروگرام اور دربار کی تاریخیں اس لئے بدل کر پیشتر کر دی گئیں۔ کہ اگر بڑے دنوں کی تعطیلوں میں دربار ہوگا تو ماہ محرم کا اور مسلمانوں کے ایک کثیر جماعت میں شہیدان کربلا کی عزا داری کا آغاز ہو جائے گا۔ اس تغیر تاریخ سے جو کچھ ہرج ہوا یا جو سہولتیں بڑے دنوں میں ممکن تھیں وہ چھوڑنی پڑیں۔ جو تعطیل دربار کے لئے خاص دینی پڑی۔ ان سب کا احسان مسلمانوں پر ہے اور وہ دل سے اس عنایت اور توجہ کے معترف ہیں۔ اتفاقات حسنہ کو دیکھئے کہ جو جہاز شہنشاہ کی سواری کے لئے انتخاب ہوا۔ اس کا نام وہ نام ہے جو مسلمانوں کو دل سے عزیز ہے یعنی مدینہ۔ اور جس دن شہنشاہ نے سرزمین ہندوستان پر قدم رکھا وہ عید کا دن ہوا۔ یہ علامات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی شہنشاہ و برطانیہ اور انکی مسلمان رعایا کے باہمی رشتہ کو مضبوط کر رہی ہے اور بہتر بھی یہی ہے کہ یہ رشتہ روز بروز مضبوط ہوتا چلا جائے۔ کیونکہ اسکی مضبوطی میں دونوں طرف کا نفع ہے +

عبد القادر

مدینۃ السعادہ

ذیل کا مضمون سنہ ۱۹۱۱ء کے ایک جلسہ میں "بزم اُردو" لاہور کا عام جلسہ تھا پڑھا گیا۔ چونکہ یہ ایک دلچسپ اخلاقی مضمون ہے۔ لہٰذا اس کو ناظرین مخزن کی نذر کرنا مناسب ہوگا (ایڈیٹر)

دن بھر دفتر کے کام اور رات کو بعض کتابوں کے مطالعہ سے تھکا ہوا دماغ آخر بارہ بجے آرام پر راغب ہوا۔ تکان نے بستر پر لیٹتے ہی مدہوش بنا دیا۔ نیند آئی یا نہیں؛ میں اس کی بابت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں یہ جانتا ہوں کہ میں اس عالم سے باہر کسی اور جہان میں پہنچ گیا تھا۔

خبر نہیں خواب تھا۔ یا بیداری تھی۔ کیونکہ مجھ پر اس وقت عجیب کیفیت طاری تھی۔ کوسوں کی منزلوں تک کفِ دست چٹیل میدان تھا۔ اور میں اس میں رواں تھا۔ آدمی تو کیا چرند و پرند بلکہ درخت اور گھاس تک کا کسی طرف نام و نشان بھی نہ تھا۔ بس یہ حالت تھی ؎

پتے کو پتا نہ تھا شجر کا
عنقا تھا نام جانور کا

ریگستان کی ریگ ہوا کے جھونکوں سے اُڑ اُڑ کر یوں لہرا رہی تھی کہ گویا

بحرِ محیط کی شفاف اور ہموار سطح تموّج کے سبب درہم و برہم ہو گئی ہو یا کسی صبیح دشمن بر محبوب کی چین آلود پیشانی ہے جو دلدادگان و طالب کو ہیں دلربا کے جوش غضب سے ڈرا رہی ہے۔

مگر ایسے سنسان بیابان اور ہُو کے میدان میں جہاں طائرِ اندیشہ بھی پر مارنے کی جرأت نہ کر سکے، اور تمندِ خیال وہاں پہنچکر تمام تیزیاں اور طرّاریاں بھول جاتے۔ اگر کوئی بات مجھ وحشت زدہ کی تسکینِ خاطر کا سبب تھی تو وُہ یہ تھی کہ خدا کی مہربانی سے جھلاتی ہُوئی دوپہر کی دھوپ نہ تھی۔ بلکہ شام کا سُہانا وقت تھا اور خوفِ غروب سے زرد شدہ سورج۔ نہاں خانۂ مغرب میں روپوش ہونے کے لئے جلد جلد نیچے اُتر رہا تھا۔ اس کی پیلی پیلی کرنیں اپنا آخری لُطف خیز سُنہرا نُور ریت کے ذرّوں پر جگمگاہٹ طاری کرنے کی صُورت میں نمایاں کر رہی تھیں۔ اس تمام میدان میں آدمی تو کیا اُس کا باسی دُوسری چیز کا سایہ بھی بجز میرے اپنے سایہ کے نظر آتا تھا۔ اور وُہ بھی یُوں کہ نقاشِ شعاع نے اس کی تصویر کشی کرتے ہُوئے غلطی کھا کر گویا مجھے ابوالبشر آدمؑ سمجھ لیا اور میرا طُول حد سے بڑھا کے مجھے عَین مَین ایک لاٹ بنا دیا تھا۔

مَیں شام کا وقت نزدیک پا کر ایک ایسے صحرا میں جس کا نہ اَور تھا نہ چھور۔ پریشان و حیران مارا مارا چلا جاتا تھا۔ اس کا کچھ پتا نہ تھا کہ کہاں جاؤنگا اور کب منزل کا نشان پاؤنگا۔ کہ اسی اثنا میں آفتاب اپنے آرامگاہِ غرب میں جا چھپا اور رات کا سیاہ پردہ اس کے رُخِ انور پر لٹک پڑا ؎

چاروں اَور اندھیرا چھایا پنچھی لَوٹ بسیرے آیا

حال کہوں کیا دلِ مضطر کا دھوبی کا کُتا گھاٹ نہ گھر کا

منزل کا واں پتا کہاں تھا　　رات اندھیری ہُو کا سماں تھا
لغزش پاؤں میں قلب طپاں تھا　　سوجھتا کب بیٹا کا نشاں تھا
ظلمت وہ کہ الٰہی توبہ　　توبہ توبہ توبہ توبہ

بس میری وہ حالت تھی کہ تنتہ دُود سے نکلنے کا نہ نگلنے کا۔ جاؤں تو کدھر! اور رہوں تو کہاں؟ میں چشمِ عشاق کا وہ قطرۂ اشک بنا تھا جسے سوزِ محبت باہر دھکیلے اور حیا آگا روک کر نکلنے سے مانع آئے۔ کچھ سُرت نہ تھی کہ کیا ہوں اور کیسا؟ پردۂ ظلمات کا رازِ مخفی ہوں یا گہرے پانی میں تڑپتی ہوئی مچھلی۔ جسے نہ خود اپنی خبر ہوتی ہے اور نہ کسی اَور کو اس کی۔ کبھی خیال آتا کہ کسی کوئلہ کی تاریک کان میں چل رہا ہوں۔ ہاتھ بڑھا کر سرنگوں کی دیواریں ٹٹولنے کا قصد کرتا۔ کہ کسی چٹان سے ٹکرا نہ جاؤں۔ مگر وہاں نامتناہی خلا کے سوا کیا تھا۔ بہرحال قدم بڑھ اور ایک بیخودی کا نشہ سا چڑھ رہا تھا اور اُٹھتا گرتا چلا ہی جاتا تھا کہ یکایک تاریکی کا پردہ پاش پاش ہونے لگا۔ تو بتحرِ چمکا اور میں نے اپنے تئیں ایک سرِ بفلک پہاڑ کی تیسٹی میں پایا۔ پہاڑ کیا تھا ایک دیوار تھی جو فضا سے آسمان کو بند کر لینے کا دعوٰی کر رہی تھی۔ یا سقف آسمان کو ٹیک دیکر زمین پر گرنے سے بچا رہی تھی۔ یا ایک پُرشوکت وہیبت بادشاہ تھا جس نے قرصِ آفتاب کا آتشیں تاج اور اس کی کرنوں کی زرین قبا پہن لی تھی۔

پُوچھئے نہیں کہ اُس وقت میری کیا کیفیت ہُوئی۔ میدانِ بلا کٹا تو اب اس کوہِ فلک شکوہ کی چڑھائی کا مرحلہ پیش آیا۔ پھر پہاڑ بھی کیسا آہنی چڑھنے کی آرزو سے آسمان پر صعود کرنے کی تمنا زیادہ سہل نظر آتی تھی۔ حیران تھا کہ کیا کروں۔ اس پر چڑھوں یا اپنی جگہ ہی پر کھڑا رہوں۔ ناچار۔

تن بتقدیر ہو بیٹھا اور نظر دوڑا کر ہر طرف نگراں تھا۔ پہاڑ کے دامن میں
ایک چٹان اپنی بہنوں سے کچھ صاف و شفاف چکنی اور ہموار نظر آئی۔
تھکان سر پر سوار تھا۔ اور جھنڈ جھنڈ بے قرار ہو کے اس پر پڑ رہا۔ اور بقول
کسے ع یہ مثل سچ ہے کہ سُولی پر بھی آجاتی ہے نیند۔ فوراً خواب
راحت سے ہم آغوش ہو گیا۔

پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ میرا چھپر کھٹ یعنی وہ چٹان ذرا ذرا سرکتی
معلوم ہوئی۔ ہلی ڈُلی۔ اور پھر بلند ہو کر اُڑن کھٹولا بن گئی۔ میں سمجھا کہ
یہ کوئی روح ہے اور مجھے ملاءِ اعلیٰ پر لئے جاتی ہے۔ لیکن آنکھ کھول کر
دیکھتا ہوں تو وہ بستر جسے میں چٹان خیال کر رہا تھا۔ ایک پرندہ ہے
جس کی ساخت عقاب سے ملتی جلتی ہے۔ تو ڈیل ڈول گنبد نما گول مٹول ہے

یہ پرندہ مجھے اپنی پشت پر لئے اُڑتا ہوا پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا اور
اس کو عبور کر کے ہوا سے اُترا۔ میں جھٹ پٹ اس پر سے اُتر کے الگ
ہو گیا۔ کیونکہ میری مشکل آسان ہو چکی تھی۔ اور اب امید کی دل خوش
کن ٹھنڈک میرے دل کی لگی بجھانے میں اپنا جاں بخش اثر دکھا
رہی تھی۔ پہاڑ کی چڑھائی جس پر جانا امکان کے دائرہ سے باہر تھا
بلا منتِ غیرے طے اور یہ کٹھن منزل سپے ہو گئی تھی میں پہاڑ کی دوسری تلہٹی
میں پہنچ گیا تھا اور زندگی کی مسرت اور آبادی کی رونق کا منظر میرے پیش نظر
تھا۔ دُور سے پانی کی روانی دکھاتی ہوئی جدولوں کے کنارے سبزہ نضارت
افزائے نظر کی تحریریں نمایاں ہو رہی تھیں۔ ان کے بیچ بیچ میں پست و بلند مکانات
اور عالیشان سر بفلک محلوں کا جلوہ نظر آ کر میرے دل کو مسرور اور
تھکان کو دُور بنا رہا تھا۔ آبادی کی شکل کیا نظر آئی کہ دل بے اختیار ہو کر اسی طرف

کچھ جان جسم میں آ گئی - تازہ جان آ گئی - قدم بڑھا - اور دوڑتا ہوا اس کی طرف چل نکلا - تھوڑی دیر میں ایک جزیرہ کے اندر پہنچ گیا - اس کے وسط میں ایک عمارت تھی اور اس کے دروازہ پر ایک بزرگ سن رسیدہ آدمی کھڑا تھا - اس بزرگ کی صورت و شباہت کے متعلق غالباً صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ ہمارے زمانہ کے اوہام پرست منجمین کے نو تحقیقات باشندگان مریخ کا ہمشکل تھا - وہ میری شکل دیکھ کر ایسا گھبرایا جیسے انسان جن کو دیکھ کر بوکھلا جاتا ہے - اور میرے دل میں اس کی ہیبت نے اس سے بھی زیادہ گھر کیا - لیکن مجھے بات کی دید سے مانوس اور غرائباتِ عالم کے نظارہ سے مالوف ہونے کے باعث میں بہت جلد سنبھل گیا اور اس کی طرف بڑھا - اس کے علاوہ گویا قدرتاً اس کی عجیب و غریب زبان بھی الہامی طریقہ سے مجھ کو معلوم ہو گئی اور میں نے اسی بولی میں اپنے افوکھے ملاقاتی سے بات کی - اس نے کہا :-

"میں تو سمجھتا تھا کہ میرے اس شہر کے سوا دنیا میں کوئی شہر ہی نہیں اور نہ ہمارے علاوہ کوئی اور انسان ہے"۔

پھر مجھے اپنے گھر میں لیجا کر بال بچوں سے ملایا - خوش ذائقہ کھانا کھلایا آرام کے لئے نرم نرم بستر بچھا دیا - اب پھر شام ہو گئی تھی اور یہ میرے سفر کی دوسری شب تھی - پہلی رات جس تکلیف و مصیبت سے کاٹی تھی اس کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے - مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ دوسری رات آرام و اطمینان کے خواب شیریں میں بسر ہوئی اور میں آرام سے سویا اور کوئی خوف و خطر پاس نہ پھٹکا -

پردہ پوش عاشقاں کا دورہ ختم ہوا - میں بھی شاہ خاور کے ساتھ ہی بستر سے اٹھا اور اپنے پاک سیرت و بزرگ میزبان خاندان کی نماز اور دعا خوانی کی صدا سنکر بیدار ہوا -

وہ خشوع وخضوع کے ساتھ دعا ومناجات میں مصروف تھے۔ سب ایک صف
میں ایستادہ تھے۔ پاکیزہ دعائیں پڑھتے جاتے تھے۔ اپنے مصائب کے رفع،
تکلیف آسان، دولت دریت ہونے کی دعا مانگتے تھے اور خداوند کریم
سے اس کی امداد واعانت کے طلبگار تھے۔ یہ منظر میرے دل پر بیحد موثر
ہوا [illegible] ان کی طرف جذب اور انکی صف میں شامل
ہوگیا اور خود بھی انہیں کی طرح دعاؤں اور عاجزی وزاری میں مشغول۔
مجھے سخت حیرت تھی کہ اس شہر میں نہ کوئی رسول خدائے پاک کا پیغام
ہدایت لایا۔ نہ کوئی آسمانی کتاب اتری۔ مگر یہاں کے آدمی ایسا صادق اور
خالص ایمان رکھتے ہیں کہ دیدہ ہے نہ شنیدہ۔ نماز ونیاز سے فراغت
ہوتے ہی میں نے [illegible] خاندان کے سردار سے دریافت کیا:-
"آپ کس کی عبادت کرتے اور کس سے دعا مانگتے ہیں؟"
"اس کائنات کے خالق اور اس کے مدبر کی"۔ میرے معزز میزبان نے
فرمایا اور مجھ سے اور اُس سے یہ مکالمہ ہوا:-
میں: کیا تم نے اس خالق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر پہچانا ہے"؟
میزبان: بیشک! ہم نے اس کا جلوہ۔ اس کی قدرت کے آثار اور
صنعت میں دیکھا ہے۔ وہ ہم کو آسمان اور پانی میں نظر آیا۔ ہر
گردش کرنے والے فلک اور چلنے والے تارے اس کے مظہر ہیں۔
حیوانات کے پیٹ میں پیدا ہونے والے بچے، اور نباتات کے
بیجوں کا نشوونما اس کا جلوہ گاہ ہے۔ ہم نے پروردگار برحق اور
خالق مطلق کی ذات پاک کا مشاہدہ خود اپنی ذات، روح اور عقل کے
آئینہ میں کیا ہے۔"

میں۔ مگر عبادت کرنے کی وجہ۔
میزبان۔ "ان کی نعمتوں کی شکرگذاری۔ کہ اُس نے ہم کو پیدا کیا۔ اور پھر رزق پہنچایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی دُوسرے کی کچھ بھی مدد کرتا ہے تو دوسرا اس کا شکریہ ادا کرنے میں سرگرم ہوتا ہے۔ ایک لقمہ غذا۔ اور ایک گھونٹ پانی کے لئے بہت بہت شکر کرتا ہے۔ جب معمولی سے احسان کا یہ بدلہ ہو تو محسنوں کے محسن اور منعموں کے صاحبِ توفیق بنانے والے کا شکر نہ ادا کرنا کیسی ناقابلِ عفو خطا اور کس قدر موجبِ شرم قصور ہے"۔
میں۔ (اپنے دل میں) یہ شخص صدیق اور مخلص کا مرتبہ رکھتا ہے۔ یہ اُن لوگوں میں سے ہے جو بلا اُمید ثواب اور بغیر خوفِ عذاب کے محض شوق سے قادرِ مطلق کی بندگی کرتے ہیں۔
(میزبان سے مخاطب ہو کر) آپ موت کے بعد کہاں جانے والے ہیں؟
میزبان۔ "دائمی نعمت۔ یا المناک ہمیشہ کے عذاب میں"۔
میں۔ "کیا آپ کی مُراد جنت اور دوزخ ہے"؟
میزبان۔ "میں آپ کی یہ بات کچھ بھی نہیں سمجھا۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ حکیم خدا نیکوکار کو اس کے اعمالِ نیک کا اچھا بدلہ ضرور دیگا اور بدکار کو نیکوکار کے برابر بنانا اس کے عدل کو پسند نہیں ہو سکتا"۔
میں۔ "نیکوکار کون ہے اور وُہ کب نیکوکار ہوتا ہے۔ اور بدکار کو بدکار کیوں کہتے ہیں؟
میزبان۔ "نیکوکاری نفع پہنچانے۔ اچھا کام کرنے اور بنی نوع کے حقوق اور اپنے فرائض ادا کرنے کا نام ہے۔ اور بدکاری شرارت اور ضرر رسانی کا نام ہے ہم میں سے جو شخص اپنے بھائی کو کچھ نقصان پہنچاتا یا اس کو تکلیف

کے اندر پایا جاتا ہے۔ کہ کسی کو خوشحال اور کسی کو بدحال دیکھا جاتا ہے۔ لیکن
یہاں سب آدمی ایک ساں حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ غذا، سواری،
لباس، سامان خانہ داری، اسباب زندگی، اور دولتمندی میں سب کا درجہ
بالکل برابر ہے۔ کسی میں کوئی فرق نہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا اور
میں نے اپنے محترم میزبان سے سوال کر ہی دیا:-

"کیوں جناب! کیا آپ کے یہاں دولتمند اور فقیر۔ آقا اور ماتحت کا کوئی
فرق نہیں؟"

میزبان:- نہیں صاحب! ہم میں سے ہر شخص کو ایک گھر رہنے سہنے کے لئے۔
ایک مختصر کھیت روزی کا ذریعہ حاصل کرنے کے واسطے۔ اور ایک چارپایہ
باربرداری کے کام کا بہت ہے۔ اس کے سوا وہ کچھ غرض نہیں رکھتا۔ اور
اسی سبب سے ہم میں آقا اور غلام، یا دولتمند اور فقیر کوئی نہیں ہوتا۔

میں:- گو یہ عجیب بات ہے مگر امکان سے باہر نہیں۔ لہٰذا اسکو مانے لیتا ہوں لیکن
کیا آپ کے شہر میں کوئی بیکار، کام نہ کرنے کے قابل اور سست و کاہل آدمی
بھی نہیں؟

میزبان:- سست و کاہل آدمی کا ہمارے یہاں نام بھی نہ لیجئے۔ ایسا آدمی ہمارے
ساتھ کیونکر رہ سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہمیں اس پر مطلق رحم نہ آئے گا۔
ہم اس کی اس لغزش کو کبھی معاف نہ کرینگے۔ کہ عقل اور قوت کی ایسی
خداداد نعمتوں کی۔ انہیں کام میں نہ لانے کے ذریعہ سے سخت ناقدری
کرتا ہے۔

رہا ناکارہ اور مجبور۔ ہم اس کی مدد کرتے اور اس سے اچھی طرح پیش
آتے ہیں اور اس برتاؤ کو اپنے لئے فخر کا سبب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ

ہو رہا تھا۔ اور خیال کرتا تھا کہ ہمارے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر قسم کے مدارس جن میں بہت ہی باقاعدہ اخلاقی تعلیم ہوتی ہے اور حکمت و اخلاق کی بڑائی رکھی جاتی ہے۔ ہرگز ایسے آدمی نہیں تیار کر سکتے جو ان عجیب غریب انسانوں کے اخلاق اور فضائل کا مقابلہ کر سکیں۔ مجھے خواہش پیدا ہوئی کہ اس شہر کے طریقۂ تعلیم کا علم حاصل کروں۔ میں نے اپنے بزرگ دوست سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ کے یہاں کا کوئی مدرسہ بھی دیکھوں"۔

میزبان۔ (میرے سوال سے حیران ہو کر) "مدرسہ کیا چیز ہے"؟

میں۔ (اس کی حیرت سے بھی بڑھ کر متحیر ہو کر) جناب! مدرسہ ایک مکان ہوتا ہے۔ اس میں چھوٹے بچے پڑھتے اور بڑی عمر کے آدمی اُن کو پڑھانے کے لئے جمع ہوا کرتے ہیں"۔

میزبان۔ "اور وہ بچے بڑوں سے کیا سیکھتے ہیں"؟

میں۔ "اپنی حالت سنوارنے کی تدبیریں اور معاش و معاد میں کام آنے والی باتیں"۔

میزبان۔ "ہمارے اس طرح کے شہر میں ایسے مقام کی کیا حاجت ہے۔ ہم سے بڑھ کر بیٹوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور کس کو آتا ہے۔ ہم خود انکو تعلیم دیتے ہیں۔ تہذیبِ نفس اور مفید کاموں کے اصول پر ان کی تربیت کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے مدرسے۔ دستکاری کے کارخانے اور کھیتی باڑی کے مزرعے ہیں۔ انہی مقامات میں ہم اپنی اولاد کو تعلیم دیتے ہیں کہ تخم پاشی کا کیا طریقہ ہے۔ پھر انکو اگانے کی کیا ترکیب ہے۔ آلاتِ زراعت کس طرح بناتے اور کیونکر کام میں لائے جاتے ہیں۔ یہیں ہم انکو مکانوں کی تعمیر کپڑوں کا بننا اور سینا۔

زیادہ پسند کرے گا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے
یا آسمان اس پر ٹوٹ پڑے۔ اُف! تو میں زندہ ہوتا ہر طرف سے
دور دور پھٹ پھٹ کی صدا آتی۔ ایسی زندگی سے تو موت ہزار درجہ
افضل ہے۔

ہم اپنی گفتگو اس درجہ تک پہنچا چکے تھے کہ شہر کی سیر سے بھی فراغت
ہو گئی اور پھر ہم اسی گھر میں آ گئے جہاں سے سیر کے لئے نکلے تھے۔ گھر
کے مکینوں نے خندہ پیشانی اور مرحبا کہنے کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔
اور اپنے بزرگ سردار خاندان سے بغلگیر ہوئے۔

سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے تمام شہروں اور دیہات میں مجھے تو ایک
گھرانا بھی اس خاندان سے بڑھ کر خوش نصیب، بے فکر، مطمئن، اور بشاش
و بشاش نظر نہیں آتا ہے۔ سب بھائی باہم الفت و صفائی رکھتے ہیں اور
میاں بیوی باہمی محبت اور یکجہتی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہی شہر "مدینۃ السعادۃ" یا خوشحالی کی بستی ہے۔ میں نے اسکو دیکھا
تو اس کا ایسا گرویدہ ہوا کہ یہیں کی زندگی بھا گئی اور دل میں ٹھان
لی کہ اب اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤنگا۔ مگر "سائیں کے کھیل نیارے"
اور اُس کی قدرت کے راز نامعلوم ہیں۔ اگرچہ میرا اس شہر سے نکلنے کا
ارادہ نہ تھا۔ لیکن سنت الٰہی اور مشیت ایزدی بدل نہیں سکتی۔ میرا دل
جیسا نقد ور نہ تھا۔ اور خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ رات آئی اور میں اپنے عمر رسیدہ
میزبان کے گھر میں بستر استراحت پر دراز ہو کر سو گیا۔ میں کیا سویا میرا
نصیب سو گیا اور مجھکو وہ فردوس جہان سے کھو گیا۔ آہ۔ کیا کہوں حیرت
آتی ہے اور زبان یاری نہیں کرتی۔ دل بیٹھا اور قلم کا سینہ شق ہوا جاتا ہے

کر نہیں۔ مجھ کو کہنا ہے۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس خواب شیریں سے بیدار ہو کر میں نے اپنے آپ کو خاص اپنے گھر اور بستر میں پڑا پایا۔ نہ وہ میدان جنت نشان تھا۔ نہ کوہ فلک شکوہ نہ مرغزار تھا۔ اور نہ وہ خوش نصیب گروہ مدینۃ السعادۃ کی بستی خواب و خیال سے زیادہ نہ تھی۔ اور اب اس کی جگہ بدبختی سے بھری ہوئی زندگی اور سوسائٹی کی شقاوت مجھے پیس ڈالنے کے لئے آمادہ تھی حیف صد حیف!! میں پیشتر پچھتاتا ہوا بستر سے اٹھا ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

طبیعت پر غم کا بار حد سے سوا ہوا۔ اور دل گھبرایا۔ تو خیال آیا کہ لاؤ اس عجیب خواب کا نصیحت آمیز حال حاضرین بزم اردو کا آویزہ گوش اور ناظرین مخزن کا منظور نظر بنا دوں۔ ممکن ہے کہ کوئی سعید دل اس کی منزل بنجائے۔ اور وہ بھی میری طرح مَدِیْنَةُ السَّعَادَۃ کا مشتاق ہے۔ کیونکہ اگر سب کے دل ایسی ہی خواہش سے لبریز ہوں تو ہم اس شقاوت و بدبختی کے دیار کو بھی اُن کی ہمت مردانہ کے وسیلے سے "مدینۃ السعادۃ" کا نمونہ بنا سکتے۔ اور ویسی ہی پرلطف زندگی کا حظ اٹھا سکتے ہیں۔

خالق ظلمت و نور۔ و مقلب الامور کی توفیق کا رفیق ہونا شرط ہے۔ جہل و بداخلاقی کی تاریکی اس کے ایک لمعۂ فیض کی چمک سے کافور ہوجائیگی اور علم و اخلاق کی ضیا بار شمع افراد قوم کے کاشانۂ قلوب کو منور بنائیگی۔ اور یہی حالت ہمارے "مدینۃ الشقاوت" کو مدینۃ السعادت کی شکل میں بدل دیگی۔

محمد حلیم انصاری۔ ردولوی

روزنامچہ نواب سربلند جنگ بہادر

ماہ جولائی کے روزنامچہ میں روزانہ لکچروں اور معمولی دوستوں سے ملنے جلنے کا ذکر ہے اس میں سے چند تاریخوں کا روزنامچہ بطور نمونہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے:

۱۱ یکشنبہ | حسب معمول لکچروں میں گیا۔ سہ پہر کو چند دوستوں کے ہمراہ ٹینس کھیلا۔ شروع سے مطلع صاف تھا لیکن بعد ازاں طوفان آگیا۔ چونکہ ہم کافی ورزش کر چکے تھے اسلئے کالج میں واپس آئے۔ جونہی ہم کالج میں داخل ہوئے بڑے زور سے بارش ہونے لگی۔ شام کے کھانے کے بعد ہم شپلی[1] کے ہمراہ کافی پینے گئے۔

۱۲ سہ شنبہ | حسب معمول کام کیا۔ ہائڈ[2] کو ٹینس کھیلنے بلایا۔ ڈنر کے بعد یونین کے مباحثے میں گئے۔ آج حسب معمول ہفتہ کی تعطیل تھی اسلئے دس بجے سے قبل کالج واپس آیا۔ ہندوستان سے ڈاک موصول ہوئی گھر پر سب خیریت ہے۔ گرسٹنبرگ[3] کو آئندہ پنجشنبہ ٹینس کھیلنے بلایا ہے۔

۱۴ جولائی | والد ماجد کے ۱۲ جون کے والا نامہ سے معلوم ہوا کہ دہلی میں ایک شب میں چار مرتبہ زلزلہ آیا۔

۱۵ جولائی | تمام دن کام کرتا رہا۔ سہ پہر کو مس موریس[4] سے گرٹن کالج میں ملنے گیا۔ انہوں نے ازراہ مہربانی مجھے تمام کالج کی سیر کرائی۔ یہاں چند نئے کمرے تعمیر ہو رہے ہیں۔ کالج بہت خوبصورت ہے۔ اس کے برآمدے مجھے بہت پسند ہیں۔ مطالعہ کرنے کے لئے یہ بہت اچھا مقام ہے۔ صرف یہ کہ بارش کے دنوں میں مطالعہ کرنیوالیوں کو ضرور برآمدوں میں ٹہلنے والوں کے غل شور سے تکلیف ہوتی ہوگی۔

---

[1] یہ صاحب یعنی Dr. A. E. Shipley. اب قریب عہدہ ماسٹر Master Christs College یعنی صدر معلم کرائسٹ کالج پر فائز ہیں۔

[2] Mr. Hyde جنہوں نے ڈاکٹر کا پیشہ اختیار کیا۔

[3] Mr. Gerstenberg جو ایک امیر یہودی خاندان کی تھے اور جو فوجی نوکری میں ...

[4] Miss Morris. Girton College میں تھیں۔ انکے والدین لندن کے مشہور ساکنین تھے ان کا مکان Park Lane, London میں تھا جو امیروں کے رہنے کا مقام ہے۔ آج کل Mrs. McLachlan ہیں۔

[illegible] سفرنامہ [illegible] ماہ اکتوبر ۱۸۸۴ء علیحدہ جلد [illegible] انگریزی میں
طبع ہو چکا ہے۔ اس زمانہ میں مولوی محمد حمید اللہ خاں مصر میں لارڈ
نارتھ بروک بہادر جی۔ سی۔ ایس۔ آئی کے ہمراہ رہے۔ اس لئے
ہم اُس کا ترجمہ یہاں نہیں چاہتے۔ بعد واپسی لندن کے ختم سال
تک کے حالات مختصر طور پر ڈائری سے اخذ کرتے ہیں۔

جمعہ ۷۔ نومبر ۱۸۸۴ء | الحمد للہ کہ میرا سفر تک مصر بخیریت تمام ہوا اور بعد ازاں ہم
۹۔ بجے صبح کو کینن[۵۱] اسٹریٹ اسٹیشن واقع لندن پہنچا۔ اور ایونیو ہوٹل[۵۲] ہولبرن[۵۳]
میں مقیم ہوا۔ ساڑھے ۱۱ بجے لارڈ نارتھ بروک کے مکان پر گیا اور کپتان بو[۵۴]
منٹ اُنکے سکرٹری سے ملکر اُن کے ذریعہ سے لارڈ موصوف کو اپنے آنے
کی اطلاع کرائی۔ اب میں شہر لندن میں قیام کرتا ہوں۔ تاکہ لنکنز اِن میں
اپنے ٹرم کی تکمیل کرسکوں۔

۱۰۔ نومبر ۱۸۸۴ء | گذشتہ شب کو میرا ارادہ کیمبرج روانہ ہونے کا تھا لیکن
چونکہ ڈنر سے ۱۰ بجے تک فرصت نہ ہوئی۔ اِس وجہ سے روانہ نہو سکا۔ آج
صبح کی گاڑی میں روانہ ہو کر بخیریت کیمبرج پہنچا۔ بعض دوستوں سے ملاقات
کرکے ٹرمپنگٹن[۵۵] کو پروفیسر فاسٹ[۵۶] کے جنازہ کے ساتھ قبرستان گیا۔

---

[51] Cannon Street Station.
[52] Avenue Hotel.
[53] Holborn.
[54] Capt: Beaumont, now Admiral Sir Lewis Beaumont.
[55] Trumpington.
[56] Professor Fawcett. M.P. Post master General; known as the "member for India".

ابنِ عربی

نام محمد محی الدین لقب سنہ ۵۶۰ھ سترھویں رمضان شریف یوم دوشنبہ کو شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے۔ شیخ محمد صادق شہابان مناقبِ غوثیہ میں لکھتے ہیں کہ پہلے محی الدین کے والد بزرگوار علی بن محمد کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی۔ انکو اولاد کی بہت تمنا تھی۔ جب ان کا سن پچاس برس کا ہوا تو اولاد سے نا امید ہو گئے۔ پھر بھی ایک سچے مومن کی طرح خدائے تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو کر شیخ عبدالقادر جیلانی کے پاس گئے۔ اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی۔ آپ نے دعا فرمائی۔ حق تعالیٰ نے انکو الہام کے ذریعے سے آگاہ کیا کہ بڑھاپے میں اولاد ہونا غیر ممکن ہے لیکن اگر کوئی دوسرا شخص انکو اپنی اولاد ہبہ کر دے تو ممکن ہے۔ جس پر شیخ عبدالقادر جیلانی نے فرمایا کہ میرے صلب میں ایک لڑکا ہے۔ اس کو میں نے تمہیں دیا۔ وہ اب تمہارے حصہ کا ہو گیا اور تمہارے گھر پیدا ہوگا۔ تم اس لڑکے کا نام محمد رکھنا۔ اور میں نے اُسے اپنا لقب بھی عطا کیا۔ انشاء اللہ وہ امتِ محمدیہ میں نہایت جلیل القدر ولی ہوگا۔ علی بن محمد حضرت سے رخصت ہو کر مکان پر پہنچے۔ اسی شب کو انکی بی بی حاملہ ہوئیں۔ بعد نو ماہ کے ان کے ہاں محمد ابن عربی پیدا ہوئے۔ علی بن محمد انکو لیکر حضرت کے پاس گئے۔ حضرت نے انکو گود میں لیا۔ اور دینی دنیوی دعاؤں سے انکو مالا مال کیا۔ تاریخ ولادت انکی یہ ہے :-

محی الدین پیر زندہ دل دانا ہادی سالکانِ اہلِ زمیں

ہست سالِ ولادتش نعمت صاحبِ کشف صبحی است ہمیں

بعض نے انکی تاریخ ولادت یوں لکھی ہے ؎

شیخ والاجناب ابن عربی مقتدائے روحشہ الملی
شیخ اکبر ز عارفاں بودہ در تنِ روزگار جاں بودہ
جامع نسخۂ فتوحات است صاحبِ خرقہ و کمالات است
ہفتہ ہم بود از بہ رمضان کہ در آفاق شد چو خورتاباں
بود ثانی بشیر محی الدین
سالِ مولودِ او ز ثانی بیں

اس تاریخ سے ایک سال کا فرق ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ جمہور کے خلاف ہے۔
شیخ محی الدین ابن عربی علوم ظاہری اور باطنی میں یگانہ دہر تھے۔
بعد فراغت شروع شروع آپکو علم حدیث اور تفسیر کا شوق پیدا ہوا۔ اور
زیادہ تر اسی کا مشغلہ رہا۔ جس کام کو آپ شروع کرتے تھے اس کو انتہائے
کمال کو پہنچانا آپ کا فرض تھا۔ بغداد کے ایک شیخ صاحب نے آپ کے حالات
منضبط کیے ہیں۔ اس میں آپ کی تصانیف پانچسو سے زیادہ لکھی ہیں
قرآن مجید کی آپ نے چند تفسیریں مختلف طریقوں پر لکھی ہیں۔ جس میں ایک
صرف ۱۶ پارہ کی ہے اور ۹۵ جلدوں میں ختم ہوئی تھی۔ ایک دوسری
تفسیر آٹھ جلدوں میں ہے۔ جس میں اختصار اور عام محققین کا اسلوب
مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایک تفسیر آپ کی تصوف کے ڈھنگ پر ہے۔
حدیث شریف میں بھی آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔

آپ امام مالکؒ کے مذہب کے پیرو تھے اور انہیں کے نقش قدم
پر چلنے کی کوشش کی۔ آپ شریعت کے جس قدر پابند تھے وہ آپ کی

کتاب فصوص الحکم کے خطبہ کی اس عبارت سے جس میں آپ نے اس خیال کی تائید کی ہے۔ ظاہر ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں: اَرْجُوْ اَنْ اَکُوْنَ مِمَّنْ قُیِّدَ بِالشَّرْعِ الْمُحَمَّدِیِّ فَتَقَیَّدَ وَقَیَّدَ وَحَشَرَنَا فِیْ زُمْرَتِہٖ کَمَا جَعَلَنَا فِیْ اُمَّتِہٖ۔ مجھے خدا سے اُمید ہے کہ وہ مجھے اِن لوگوں میں سے کریگا جو شرع محمدی کے پابند کئے گئے۔ پس خود بھی اس کے پابند ہوئے اور دوسروں کو اس کا پابند بنایا۔ اور میں خدا سے اُمید کرتا ہوں کہ وہ میرا حشر بھی انہیں کے زمرہ میں کرے گا جیسا مجھے اُن کی اُمت میں ہونے کا فخر عطا کیا۔
عبدالوہاب شعرانی نے شیخ محی الدین ابنِ عربی کا قول نقل کیا ہے کہ شیخ صاحب کہا کرتے تھے کہ جس کسی نے ایک لحظہ کے لئے شریعت سے باہر قدم رکھا وہ ہلاک ہوا جس کسی کے عقیدہ کا یہ حال اور پابندی شریعت کا یہ لحاظ ہو۔ اس پر ایسی بے بنیاد من گھڑت باتیں اُنکی طرف منسوب کرنا اور لوگوں کو اُنکی طرف سے بدظن کرنا کس قدر بدتر ہے۔ ایک مرتبہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے راستہ میں سرسری ملاقات ہوئی۔ یہی پہلی ملاقات تھی۔ اور بات چیت کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ مگر دونوں کے دلوں کی کشش اور صفائی قلوب نے ایک دوسرے کے حالات سے باہم آگاہ کر دیا۔ چنانچہ شیخ شہاب الدین سہروردی سے لوگوں نے ابنِ عربی کے بارہ میں دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ علم حقائق کے دریائے ذخار ہیں۔ ان کا علم و فضل ان کے بشرہ سے ظاہر ہے۔ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

قائلینِ وحدت الوجود کے آپ امام اور مقتدا ہیں۔ فقیہوں کی تھوڑی جماعت اور صوفیوں کا بہت بڑا گروہ آپ کا معتقد اور آپکی تعظیم و تکریم کرتا ہے۔

اور علمائے ظاہری ان کے سخت مخالف ہیں اور ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ لوگوں نے آپ کے خرقِ عادات اور کرامات کا بھی بہت بڑا ذخیرہ بتلایا ہے۔ مشائخ صوفیہ انکو امام المؤحدین قرار دیتے ہیں۔ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ ملک مغرب کا بادشاہ شیخ محی الدین ابنِ عربی کی بہت عزت کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ کو یک بیک خیال آیا اور خدا کی محبت دل میں پیدا ہوئی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کسی جنگل کی طرف چلے گئے۔ اور مدتوں ایک غار میں رہکر عبادت کرتے رہے۔ جب آپ وہاں سے نکل کر پلٹے تو آپ کا سینہ علوم ظاہری اور باطنی سے معمور تھا۔ اور جدھر آپ تشریف لیجاتے تھے وہاں انکے علوم کی روشنی پھیلکر لوگوں کے سینوں کو منور بناتی تھی۔ جنگل سے واپسی کے بعد آپ نے سیاحت کو پسند کیا اور آپ اس کے ذریعہ ہر شہر میں قیام کرتے ہوئے اپنی تصانیف سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے تھے اور وہاں سے روانگی کے وقت اُس کو وہیں چھوڑ دیتے تھے۔ فتوحات مکیہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ حلب کے رہنے والے تھے اور زیادہ تر قرطبہ[1] میں رہے اور وہیں انکو انبیا علیہم السلام کی زیارت نصیب ہوئی۔ اور حضرت صالح علیہ السلام سے علمی استفادہ حاصل کیا۔ "شیخ مجدالدین فیروزآبادی لکھتے ہیں کہ میری نظر میں کوئی شخص محی الدین ابن عربی کے مبلغ علم کو نہیں پہنچا۔ لوگ ان کی تصانیف لکھوانے اور تلاش کرنے میں سینکڑوں روپیہ خرچ کرتے تھے"۔ ان کے مخالفین دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وُہ لوگ ہیں جو بالکل ظاہر بین ہیں اور اِن کے کلام کو مطلق نہیں سمجھتے۔ یا سمجھتے ہیں تو غلط معنوں میں۔ وُہ لوگ ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ اور اِن کے اقوال کے مخالف ہیں۔ دوسرا

---

[1] پایۂ تخت اندلس۔

...قصہ جو ہمیشہ اور ہر زمانہ میں رہا ہے۔ وہ حاسدوں کا گروہ ہے جنکو
ہمیشہ نیک نہاد اور اُن لوگوں سے جو اُس زمانہ کے ممتاز تھے عداوت
رہی اور اُن کا یہ کام تھا کہ جھوٹی اور لغو باتیں لکھکر یا کہکر اُن کی طرف منسوب
کردیا کرتے تھے۔ تاکہ عام رجحان ادھر سے جاتا رہے اور لوگ بدظن اور
مخالف ہوجائیں۔ جیسا عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ حُسّاد نے فتوحات
مکیہ میں بہت سی جعلی اور جھوٹی باتیں بناکر محض رشک و حسد سے لکھدی تھیں
جب میں ابوطاہر مغربی سے مکہ میں ملا تو انہوں نے شیخ محی الدین ابن عربی کے
ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ فتوحاتِ مکیہ مجھے دیکر مقابلہ کیا تو وہ سب باتیں جو محض جھوٹ
اور افترا پردازی پر دال تھیں نہ نکلیں۔ جنکو میں اُن کے کلام کی طرف منسوب
ہوتے ہوئے بارہا سُن چکا تھا۔ پس وہ سب باتیں جو اصل نسخہ میں نہ تھیں۔ میں نے
اپنے نسخہ فتوحاتِ مکیہ سے نکالدیں"۔ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں۔ کہ
ایسے ہی میری کتاب بحرالمورود میں لوگوں نے جھوٹی باتیں لکھ لکھکر
کئی سال مجھے بدنام کیا اور واللہ میں ان سب سے بری تھا"۔ ایسے ہی
لوگوں نے شیخ الاسلام مجدالدین فیروزآبادی کی طرف سے امام اعظمؒ کے
بارہ میں طعن و تشنیع لکھکر ابوبکر خیاط یمنی کے پاس بھیجدیا تھا۔ انہوں نے اسے
پڑھکر فیروزآبادی کو ایک خط ملامت کا لکھا۔ جس کا فیروزآبادی نے جواب
لکھا کہ اِن باتوں کی میری طرف نسبت بالکل افترا ہے۔ آپ ایسی کتاب کو
جس میں ایسی باتیں ہیں فوراً جلا دیجئے"۔ یہ باتیں کس کے ساتھ نہیں ہوئیں
امام احمد حنبلؒ کے مرض الموت میں انکے تکیہ کے نیچے ایسے جھوٹے اور لغو
عقائد کا لکھا ہوا کاغذ پایا گیا جن کا دل میں لانا بھی گناہ ہے۔ امام غزالیؒ
کی تصانیف کے ساتھ حُسّاد نے ایسی ہی نامعقول حرکتیں کیں۔ شیخ مجدالدین

فیروزآبادی نے ابن کی مدح میں چند شعر لکھے ہیں۔ جس کا اس موقع پر نقل کرنا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

وَمَا عَلَيَّ اِذَا مَا قُلْتُ مُعْتَقَدِي	دَعِ الْجَهُولَ يَظُنُّ الْجَهْلَ عُدْوَانَا
مجھ کو یہ ضرر دار نہیں کہ میں اگر اپنے ہم عقیدہ کہوں	جاہل کو چھوڑ دے کہ وہ جہل کی وجہ سے ظلم خیال کرے
وَاللّٰهِ وَاللّٰهِ الْعَظِيمِ وَمَنْ	اَقَامَهُ حُجَّةً لِلدِّيْنِ بُرْهَانَا
قسم خدا کی قسم خدا کی بزرگ اور برتر خدا کی اور اس کی	جس نے محی الدین ابن عربی کو دین کا حجت اور دلیل بنایا
اِنَّ الَّذِي قُلْتُ بَعْضٌ مِّنْ مَنَاقِبِهِ	مَا زِدْتُ اِلَّا لَعَلِّي زِدْتُ نُقْصَانَا
بیشک جو کچھ میں نے اُن کی مدح بیان کی	اس میں ہرگز زیادتی نہیں کی بلکہ شاید میری تعریف سے کمی ہے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لوگ ابن عربی کو بُرا کہتے ہیں اور اُن کی سخت مخالفت کرتے ہیں اور اپنے مُنہ کو بُرا اور ناپاک کرتے ہیں وہ ان تمام اقوال اور حسنات کو کہاں پھینک دیتے ہیں۔ جو ان لوگوں کی زبانوں سے نکلی ہوئی ہیں جنکو وہ خود بھی اچھا اور اپنا مقتدا تسلیم کرتے ہیں۔ اِتنے جلیل القدر بزرگ کو بُرا کہنا معمولی بات نہیں جس کی شان میں لوگوں نے ایسے ایسے منقبت کے جملے لکھے ہوں۔ امام نووی سے لوگوں نے انکے بارہ میں دریافت کیا۔ فرمایا: "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ"۔ مومن کو گالی دینے سے انسان فاسق ہو جاتا ہے۔ نہ کہ اولیاء اللہ کے ساتھ بدگمانی کرنا اور اُنکو بُرا کہنا۔ اِنکے اقوال و افعال اگر سمجھ میں نہ آویں تو بھی انکی اچھی تاویل کرنا چاہیئے جب تک آدمی اُس مرتبہ کا نہ ہو لے جس کے بارہ میں کہنا چاہتا ہے اُسکے کلام کو جھوٹ نہ سمجھے۔

امام ابن اسعد یافعی۔ ابن عربی کے بڑے مدّاح ہیں اور لکھتے ہیں کہ انکو ولایت عظمیٰ حاصل تھی شیخ الاسلام ذکریا سے منقول ہے کہ امام یافعی۔ محی الدین ابن عربی کی کتابوں کے پڑھنے اور پڑھانے کی اجازت دی تھی۔ اور

کہا کرتے تھے کہ جو جہلا اہل طریق سے انکار کرتے ہیں۔ تو گویا وہ چاہتے ہیں کہ
پہاڑ کو پھونک کر اپنی جگہ سے ہٹا دیں۔ جو شخص اولیا سے عداوت رکھتا ہے وہ اللہ سے عداوت
رکھتا ہے۔" شیخ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ ابن عربی عارفوں کے ولی
ہیں۔ اور نبی عربی کے قدم بقدم چلتے ہیں۔" امام فخرالدین رازی نے
انکو بہت بڑا جلیل القدر ولی لکھا ہے۔ صلاح الدین صفدی علمائے مصر کی تاریخ میں
لکھتے ہیں کہ جس کو علم لدنی والے کا کلام دیکھنا ہو۔ پس وہ ابن عربیؒ کی تصانیف
دیکھے۔ باوجودیکہ ابوعبداللہ ذہبی اور ابن تیمیہ انکے سخت مخالف تھے۔ مگر
ایک مرتبہ ابوعبداللہ ذہبی سے لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا درحقیقت ابن عربیؒ نے
فصوص الحکم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لکھا ہے۔ انہوں
نے جواب دیا کہ ایسا عالم کبھی جھوٹ نہیں کہ سکتا۔ کمال الدین کاشی نے
انکو محقق اور صاحب کرامات اور کمالات فرمایا ہے۔ شیخ مجدالدین کا خیال
ہے کہ ان کا مکان ملک شام میں تھا اور وہیں انہوں نے تمام علوم کی تحصیل
کی۔ وہاں کے علما نے ان کی تصنیفات کو قبولیت کی نظر سے دیکھا ہے۔
جامع الترمذی میں شام کے بارہ میں ایک عبارت ہے "لَا تَسُبُّوْا اَهْلَ الشَّامِ
فَاِنَّ فِیْهِمُ الْاَبْدَالَ" جب یہ حکم مطلق اہل شام کے لئے ہے تو ابن عربیؒ
کے بارہ میں کچھ برا کہنا کیسے درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ قاضی القضاۃ
شیخ شمس الدین خویی شامی پر ایک مرتبہ شیخ محی الدین ابن عربی کی نظر پڑی۔
اسی وقت سے قضاۃ کو چھوڑ کر ان کے گرویدہ ہو گئے اور ان کے قدم
بقدم چلنے کو فرض سمجھا۔ اور اپنی صاحبزادی کو ان کے نکاح میں دیدیا۔
شیخ الاسلام مخزومی فرماتے ہیں کہ جب شیخ محی الدینؒ شام میں تھے تو وہاں کے
تمام فضلا ان سے ربط و اتحاد رکھتے تھے۔ بلکہ متبعین کا اُستاد خیال کرتے

تھے اور احترام کرتے تھے۔ حضرت کمال الدین زملکانی جو شام کے جلیل القدر عالموں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے بڑے معتقد تھے۔ حضرت قطب الدین حموی جب شام سے اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے ابن عربی کو کیسا پایا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان کو علم و زہد اور معارف میں بحر زخار پایا جس کا کنارہ نہیں۔ شیخ سراج الدین مخزومی نے ان کے مخالفین کے جوابات میں نہایت رد و قدح کے ساتھ ایک کتاب لکھی ہے اور لکھا ہے کہ ہم کو محض ناسمجھی کی وجہ سے فتوحات اور فصوص وغیرہ کا انکار نہ چاہئے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ جب یہ مکہ معظمہ میں تھے اور ان کا درس تدریس احادیث کا جاری تھا۔ اس وقت ان کے ایک شاگرد نے ایک کتاب لکھی جس کے جواب میں قلم برداشتہ انہوں نے فتوحات مکیہ لکھی۔ سراج الدین بلقینی سے لوگوں نے دریافت کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ان کے کلام سے انکار مت کرو۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اوائل عمر میں علم معرفت اور حقائق کے دریا میں غوطہ لگایا ہے۔ امام سبکی نے کہا ہے کہ شیخ محی الدین آیتہ من آیات اللہ تھے۔ اور اس زمانہ میں علم و فضل کی کنجی انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ علمائے محققین انکی ایسی عزت اور لحاظ کرتے تھے کہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ بدرالدین سبکی نے جو شام کے شیخ الاسلام تھے۔ محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم پر دو جگہ اعتراض کئے۔ جب سراج الدین بلقینی کو اس کی خبر ہوئی تو بدرالدین سبکی کے نام اس مضمون کا خط لکھا کہ اے قاضی القضاۃ اولیاء اللہ کے انکار سے بچو۔ اور ڈرو اگر یہ نہیں تمہیں رد و قدح کا شوق ہے تو ان کے منکروں کا رد لکھو۔ ورنہ باز آؤ۔ انکی غلطی

نکالنے والے خود ہی سراسر غلطی پر ہوتے ہیں۔ "مگر ہٹ دھرمی انکو سمجھنے نہیں
دیتی"۔ عماد بن کثیر کا مقولہ ہے کہ جن لوگوں نے ان کے اقوال سے انکار
کیا وہ مصیبت میں پڑ گئے ہیں۔ ہر کلام کے ہمیشہ دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔
اچھے لوگ اچھی جانب لیجاتے ہیں اور اچھا سمجھتے ہیں۔ اور بد خیال اسکو
برائی پر محمول کرتے ہیں اور اس پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ فتوحات اور فصوص
وغیرہ کو دیکھنے والے بھی ایسے ہی دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک آدھ جو خدا
کے نیک اور برگزیدہ بندے ہیں۔ اور انکو علم باطن بھی حاصل ہے۔ وہ
کبھی ابن عربی کے اقوال کو خواہ وہ کیسا ہی انکو غیر ممکن معلوم ہوتا ہو۔ اگر
شریعت کے خلاف نہیں (مگر علما ظاہرین کا امتیاز نہیں۔ کیونکہ وہ
کنہ کو نہیں پہنچتے اور نہ غور کرتے ہیں۔ ظاہر پر حکم لگا دیتے ہیں۔ انکو حقائق
سے مطابق انکا ہی نہیں ہوتی) تو ہرگز اس سے انکار نہیں کرسکتے۔ اور
ایک ظاہرین علما وہ ہیں جنکو بجز پڑھ لینے اور کفر کا فتویٰ دیدینے
کے کوئی کام نہیں۔ خدا سے لگاؤ نہیں تعلق نہیں۔ دنیا میں پھنسے ہیں
سمجھیں تو کیا سمجھیں۔ ایسے لوگوں کو البتہ دشواریاں ہیں کہ وہ ابن عربیؒ
کے اقوال کو تسلیم کریں۔ اور انکار سے بچیں۔ کیونکہ اس ظاہری فرقہ
کو دنیا میں سب چیزوں کو محال اور غیر ممکن کہدینا آسان ہے۔ جو لوگ
ان کی تصانیف میں غلطیاں نکالتے ہیں۔ اور اعتراضات پیش کرتے
ہیں وہ محض انکی بے سمجھی کی دلیل ہیں اور کوتاہ بینی کا ثمرہ ہے۔ کلام تو
اچھی طرح سمجھتے نہیں۔ اعتراضات وارد کر دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کچھ
خرچ تو ہوتا نہیں۔ ابھی اگر حکم ہو جائے کہ ہر اعتراض بغیر جرمانہ کے
پچاس کے دلار نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر کچھ خرچ کئے اعتراض نہیں ہو سکتا

تو دیکھئے ابھی انکی بجز اعتراضات جو بلا سوچے سمجھے کر دیئے جاتے ہیں ج
غیب بھی نہ ہو۔ ساری کتاب پر ایک جگہ بھی شبہ نہ پڑے۔ اور واقعی جبہ
بھی فہم کی وجہ سے نہ کیا جائے۔ بہر حال تو نہ کے کی ہی، وہ دی جاتی ہے۔
خواہش نہ تھی ہو یا نہ ہو سیّدت ابن عربی کے مخالفین کا حال ہے
جو بن میں آ کر گئے۔ کچھ تدرک تو ہی نہیں ہے۔ سب سے انکو مال ہو۔ حضرت
آدم علیہ السلام سے لیکر آج تک برابر ہر بڑے شخص کی مخالفت ہوتی۔ ہر نبی
کے مخالفین بکثرت ہوتے رہے۔ اگرچہ ہم سب یقین رکھتے ہیں کہ وہ
حق پر تھے مگر ان کے وقت کے بڑے بڑے آدمی سخت مخالفت اور
اعتراضات کرتے رہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں شروع
سے آخر تک یہی حالت رہی۔ ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور
ائمہ مجتہدین پر بھی مصیبتیں اور مذمت کی بوچھاڑیں برسائی گئیں۔ غرضکہ
ہر بزرگ والے کو اس وقت تک برابر اسی طرح کی باتیں پیش آتی رہیں۔
ابن عربی کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلے بھی ایسا ہی
ہوتا آیا ہے۔ وہ خدا کے محبوب بندوں میں سے تھے۔ علوم ظاہری
اور باطنی کے یگانۂ زمانہ۔ بے مثل و بے نظیر رہے۔ ان کی شان
میں سخت الفاظ کہنا دین و ایمان بگاڑنا ہے۔ بڑے بڑے علما اور
مشائخ نے انکو عزت کے الفاظ سے یاد کیا۔ انکو اپنا امام اور مقتدا
قرار دیا۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ ایسے حقائق اور
اسرار سے انکار نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ اگر کتاب و سنت سے دلیل نہ پایا جائے
تو وہ مسئلہ موقوف رکھا جائے۔ مگر اس کی حقیقت سے انکار نہ کرنا چاہیے۔
شیخ محی الدین ابن عربی کے آخر زمانہ کو حسب ذیل میں نے پایا ہے۔

اور ان کی عزت اور توقیر کی ہے۔ اور انکو بڑے پایہ کا بزرگ اور
امام تسلیم کیا ہے۔ جو خود بھی اپنے وقت کے اہل کمال تھے۔ شیخ شہاب الدین
سہروردی۔ ابن عربی کے بالکل معاصر تھے۔ اوحد الدین کرمانی نجم الدین
رازی۔ مصلح الدین سعدی شیرازی۔ صدر الدین قونوی۔ مؤید الدین
جندی۔ ابو الحسن مغربی شاذلی۔ ابو العباس مرسی۔ ابن الفارض حموی
مصری۔ عزیز الدین نسفی۔ ابن الصباح۔ فخر الدین عراقی۔ نجیب الدین
برغش شیرازی۔ برہان الدین ترمذی۔ نور الدین عبد الرحمن اسفرائنی۔
جمال الدین خورقانی سیف الدین باخرزی۔ عماد الدین۔ ابو محمد عبد اللہ
مغربی۔ مولانا روم علیہ الرحمۃ نے بھی انکے آخر زمانہ کو پایا ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

آخر کار آپ نے اٹھتر سال سات مہینہ نو دن دنیا میں مسافرانہ
زندگی بسر کرکے ۲۲ ربیع الثانی شب جمعہ ۶۳۸ھ میں شہر دمشق میں
دنیا کو خیرباد کہکر آخرت کی راہ لی۔ اور قاسیون پہاڑ کے دامن میں
جو آجکل صالحیہ کے نام سے مشہور ہے دفن ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون

تاریخ وفات

عقل فرمود مرحبا لارشاد — سالِ ترحیل او بعقدِ زمیں

ایضاً

ابن عربی بہ شرعِ رسول — رہنمائے دین احمد محی دیں
گشت سرور سال ترحیلش عیاں — از شہ احسن محمد محی دیں

سید محمد فاروق احمد (بریلوی)

علم کا صحیح استعمال

ایک جوان آدمی (ایک بوڑھے آدمی سے) "علم اچھی چیز ہے اور درحقیقت علم اچھی چیز ہے۔ دُنیا بہ نسبت پیشتر کے اب بہت ترقی کر گئی ہے۔ میری چھ سات سال کی عمر میں اس قدر معلومات نہیں تھے۔ جتنے کہ اب میرے لڑکے اسی عمر میں رکھتے ہیں۔ وہ دُنیا کی ہر چیز کو کم و بیش جانتے ہیں اور ہر قسم کے مضمون پر بحث کر سکتے ہیں۔ جناب یہ تمام علم ہی کا کرشمہ ہے۔ کیا آپ میری رائے سے اتفاق نہیں کرتے؟"

بوڑھا آدمی "نہیں۔ علم کی اچھائی اور بُرائی اس کے استعمال پر منحصر ہے علم اچھا بھی ہوسکتا ہے اور بُرا بھی۔ کیونکہ ہم کو علم سے صرف کام کرنے کی مزید قوت حاصل ہوتی ہے۔ اور کام کرنے کی قوت اچھی اور بُری دونوں قسم کی ہوسکتی ہے"۔

جوان آدمی "جناب! میں اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ علم بُرا بھی ہوسکتا ہے" بوڑھے آدمی نے جواب دیا کہ میں تم پر ثابت کر دوں گا۔ اور اس طرح کہنے لگا :۔

بوڑھا آدمی (۱) "جب ہم کسی گھوڑے کی طاقت پر قابو حاصل کر لیتے ہیں تو گھوڑا ہمارا مطیع اور فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ ہمارا اسباب اُٹھاتا ہے۔ گاڑی کھینچتا ہے۔ سواری دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مگر جب اس کی طاقت ہمارے قبضے سے باہر ہو جاتی ہے تو گھوڑا لگام تڑوا لیتا ہے۔ گاڑی توڑ پھوڑ دیتا ہے اور اپنے سوار کو گرا دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

جوان آدمی :- بجا ہے ۔ درست ہے"
(۲) اگر کسی بڑے تالاب کا پانی بذریعہ نالوں کے خارج کر دیا جاتا ہے تو
یہ پانی کھیتوں کو سرسبز اور زرخیز بناتا ہے ۔ اگر اس تالاب کا پانی (نالے
نہ ہونے کی وجہ سے) کناروں سے پھوٹ نکلتا ہے تو ہر چیز جو اس کے
سامنے ہوتی ہے بہ جاتی ہے اور کھیت پامال ہو جاتے ہیں" ۔
جوان آدمی ۔ بے شک ۔ بالکل صحیح ہے ۔ درست ہے" ۔
(۳) کوئی جہاز جو اپنے سیدھے یا صحیح راستہ پر جا رہا ہو جلد منزلِ مقصود
پر پہنچ جاتا ہے ۔ لیکن اگر راستہ غلط ہے تو جتنا زیادہ تیزی سے چلایا
جائے گا اتنا ہی اپنی منزلِ مقصود سے دور ہوتا جائیگا" ۔
جوان آدمی" ۔ آپ کا فرمانا بالکل صحیح و درست ہے" ۔
بوڑھا آدمی :- خوب ! اگر تم ان تینوں مثالوں کو بخوبی سمجھ گئے ہو تو میں خیال
کرتا ہوں کہ تم اس بات کو بھی بخوبی جان گئے ہوگے کہ علم کو اچھا کہنے
کے لئے ضرورت ہے کہ وہ صحیح طور پر استعمال کیا جائے ۔ علم کا اچھا استعمال
ہمارے لئے رحمت ہے ورنہ زحمت سے زیادہ نہیں" ۔
جوان آدمی ۔ میں آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا ۔ بیشک علم ایک طاقت ہے اور
اس کا صحیح استعمال" ہی اچھا ہو سکتا ہے" ۔

(ترجمہ از انگریزی)

محمد ابراہیم خاں تجلی ۔ (خورجوی)

رات اور دن

ذیل کا مضمون مخزن کے قدیمی معاون جناب [illegible] صاحب بی
اے [illegible] ہیں۔ آپ جغرافیہ طبعی کا مطالعہ [illegible] اور [illegible] مختصر سے رسالہ
[illegible] جبکہ [illegible] ہونہار لڑکیوں
کی تعلیم کے واسطے تالیف کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب
[illegible] ملک میں قبولِ عام کی نظر سے دیکھی جائیگی۔

بچپن سے تم دیکھتی آئی ہو کہ سورج نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے اور ہر شخص نے اسکو یوں ہی دیکھا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سورج نہ نکلا ہو۔ اس واقعہ کو دیکھتے دیکھتے ہم کو ایک ایسا ضروری اور ناگزیر قانونِ قدرت معلوم ہوگیا ہے کہ ہم پورے اطمینان کے ساتھ اس بات کو کہہ سکتے ہیں کہ کل آفتاب ضرور برآمد ہوگا۔ جسوقت سورج نکلتا ہے تو اُس کے نور سے تمام فضائے آسمانی ملو ہو جاتی ہے اور یکایک اُجالا ہو جاتا ہے۔ سوتی ہوئی دنیا میں ایک کھلبلی مچ جاتی ہے۔ پنچھی پکھیرو اپنے اپنے گھونسلوں سے باہر نکل کر ہوا میں پرواز کرتے ہیں۔ جانور چارے کی تلاش میں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں آدمی اپنا اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اور درختوں کی پتیاں جو ننھے قدرتی کیمیا خانے ہیں اپنی غذا تیار کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ غرض سورج کی گرمی اور اُس کی حیرت خیز روشنی تمام عالمِ حیوانات اور نباتات میں ایک تازہ رُوح پھونکدیتی ہے۔ پھر شام ہونے کو آتی ہے اور آفتاب غروب ہو جاتا ہے تو تمام اندھیرا چھا جاتا ہے۔ سردی محسوس ہوتی ہے۔ دُنیا کے

[illegible] ہے
[illegible] دھوکا دے جاتے ہیں۔ اچھا تم
نے کبھی بھی تم نے ان واقعات کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اور
سمجھو! ہیئت دانوں کی اس چل پھر کو ایک انوکھی بات سمجھ کر اس کے سبب
دریافت کرنے کی کچھ کوشش کی ہے۔

دیکھو تو ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زمین ساکن ہے اور آفتاب ستارے
اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ چنانچہ اگلے لوگوں نے اس مغالطہ کو سچ مان
لیا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ زمین اس عالم کی مرکز ہے۔ سورج زمین کے
چاروں طرف گھوم رہا ہے۔ جس طرح تم اس کو دیکھتی ہو۔ آج بھی اکا دکا آدمی
ایسے ہیں جو اسی وہم میں پڑے ہیں اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ زمین ساکن ہے۔
لیکن تحقیقات جدیدہ نے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا کہ جس طرح زہرہ
مریخ یا اس کے ساتھی ستارے آفتاب کے گرد چرخ کھاتے ہیں۔ اسی طرح زمین
بھی ایک سیارہ ہے جو آفتاب کے گرد گھوم رہا ہے۔ تم کہو گی کہ ہم صریح
دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب ہر روز طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہو جاتا ہے۔
رات کو آسمان میں جگمگاتے ستارے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر اس کو
کیسے مان لیں کہ زمین گھومتی ہے اور آفتاب ساکن ہے؟ تب تم کو اس بات
کا یقین دلاتا ہوں کہ یہ سراسر تمہاری نگاہ کی غلطی ہے۔ ساون کے مہینہ میں
کبھی تم نے دیکھا ہوگا کہ رات کو بادل کے چلنے سے چاند بھاگتا ہوا نظر آتا ہے
بادلوں کو گویا اٹھائے لئے جاتی ہے۔ لیکن دیکھو تو چاند رکا ہوا نظر آتا ہے
دوسری مثال مغالطہ نظر کی ریل کی چال ہے۔ اگر ریل کا سفر تم نے کیا ہے
تو دیکھا ہوگا کہ جس وقت اسٹیشن پر دو گاڑیاں ایک دوسرے کے سامنے کھڑی

ہوتے ہیں تو ایک گاڑی کے چلنے سے دوسری گاڑی جو کھڑی ہے چلتی ہوئی

نظر آتی ہے۔ اسی طرح کی اور مثالیں ہیں جن کو خیال کرنے سے تم سمجھ سکتی ہو کہ

ایک چیز کے چلنے سے دوسری چیز جو ساکن ہوتی ہے چلتی ہوئی نظر آتی ہے

اور اس کو دیکھنے میں ہماری نگاہ دھوکا کھاتی ہے۔ بس اسی طرح سمجھ لو کہ

زمین کے چرخ کھانے سے آفتاب جو ہم سے ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کی دوری

پر ہے فضائے آسمانی میں سیر کرتا نظر آتا ہے۔ حالانکہ وہ ساکن ہے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ زمین کے چرخ کھانے سے ہم خود اس کے ساتھ گھوم رہے

ہیں۔ اس لئے زمین کی چال ہم کو محسوس نہیں ہوتی۔ اگر تم ایک ہونہار

لڑکی ہو اور کسی واقعہ کو دیکھ کر اس کی وجہ کو دریافت کرنے کی تمہارے

دل میں چیٹک ہے تو اس کو تم خود سوچ سکتی ہو کہ آفتاب گھومتا ہے یا زمین

گھومتی ہے۔ اگر اس مسئلہ کی تحقیق کرنے پر آؤ اور علم ہیئات کی بڑی

بڑی کتابوں کا مطالعہ کرو تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ زمین آفتاب کے

گرد گھوم رہی ہے۔ آفتاب اپنی جگہ پر قائم ہے۔

یہ ایک بات یاد رکھو کہ زمین جو ایک لٹو کی طرح چرخ کھاتی ہے اور ایک

ہی مقام پر ٹھہری ہوئی وہ گھومتی ہے بلکہ لڑھکتی ہوئی اپنی جگہ بھی چھوڑتی

جاتی ہے اور اس طرح ۳۶۵ ¼ دن میں آفتاب کے گرد اپنا دورہ تمام

کرتی ہے۔ زمین کی اس چال کو حرکتِ دولابی کہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے

جاڑا برسات گرمی یا بہار کی رُت ہر سال برابر جاری ہے۔ اور ایک

سال کی رُت میں جب زمین شمس کے گرد گھوم آتی ہے کل موسموں کا

حصہ بھی پورا ہو جاتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رات اور دن کے ظہور میں آنے

[illegible] آفتاب کہاں غروب ہوتا ہے اور کہاں سے طلوع کرتا ہے
[illegible] کا یہ خیال تھا کہ آفتاب ایک نورانی رتھ پر سوار ہے۔ دن کو
تمام فضائے آسمان کی منزلوں کو طے کرتا ہے اور جب شام قریب آتی
ہے تو مغرب میں ڈوب جاتا ہے اور شب بھر آرام لینے کے بعد پھر صبح
کو تازہ دم مشرق میں طلوع کرتا ہے۔ طلوع اور غروب دونوں لفظ جو
اس وقت تک ہماری زبان کے روزمرہ میں داخل ہیں۔ اسی پرانے خیال
کی ایک یادگار ہے۔ ورنہ علم ہیئت کی تحقیقاتِ جدیدہ کو خیال کرو تو
یہ دونوں الفاظ جن سے یہ بات تراوش کرتی ہے کہ آفتاب زمین
کے گرد چرخ کھاتا ہے بالکل بے معنی اور بیکار ہیں۔

اس قدر ذہن نشین کر لینے کے بعد کہ آفتاب ساکن ہے اور زمین اس کے
گرد چرخ کھاتی ہے۔ تم رات اور دن کے عمل میں آنے کی وجہ کو آسانی
سے سمجھ سکتی ہو۔ ایک آسان تجربہ بتاتا ہوں۔ لو اسی کو آزما کر دیکھ لو کہ رات
کے بعد دن کس طرح آتا ہے اور زمین پر روشنی اور تاریکی کیونکر دَور کرتی
ہے۔ ایک بڑی گیند کو چراغ کی لَو کے سامنے اپنے ہاتھوں سے دھیرے
دھیرے گردش دیتی جاؤ۔ تم دیکھو گی کہ گیند کا آدھا حصّہ جو چراغ کے سامنے
ہے وہ روشن ہے اور اس کے دوسرے حصّے پر جو اس طرف کو ہے
اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ لیکن گیند کی گردش کی وجہ سے جو حصّہ ابھی روشن
تھا وہ تاریکی میں چلا آتا ہے اور جو تاریکی میں تھا وہ روشنی کی طرف آ جاتا
ہے اور اسی طرح یکے بعد دیگرے گیند کا ہر حصّہ اُجالے سے اندھیرے
اور اندھیرے سے اُجالے میں آتا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح زمین کے
چرخ کھانے سے جو آفتاب کے مقابل میں گھوم رہی ہے دن کے بعد

رات اور رات کے بعد دن آتا ہے۔ غرض زمین کا جو حصہ [illegible] ہیں جب ہم کو آفتاب کے سامنے آتی ہے تو دن ہوتا ہے اور جب یہی رُخ گردش کی وجہ سے بدل جاتا ہے تو آفتاب نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور ہمارے لئے رات آتی ہے۔

جس وقت آفتاب ہماری نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ اسی وقت اس کو دوسرے ملک کے لوگ دیکھتے ہیں جو ہم سے مغرب کو واقع ہیں۔ غرضکہ ایک ہی وقت میں زمین پر کہیں شام کہیں صبح کہیں رات اور کہیں دن ہوتا ہے۔ جس وقت ہمارے ہاں دن ہوتا ہے اُس وقت امریکہ میں رات رہتی ہے۔ اور جب یہاں شام ہوتی ہے اور آفتاب ڈوب جاتا ہے تو امریکا میں صبح ہوتی ہے اور آفتاب طلوع کرتا ہے۔ غرض ہر مقام کا جدا جدا وقت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زمین کے ایک طرف کو رات رہتی ہے تو دوسری جانب کو دن ہوتا ہے۔

زمین کے ہر حصہ پر رات اور دن کی مُدت برابر نہیں ہوتی۔ کہیں ایک مہینہ کا دن اور کہیں دو ماہ کا۔ یہاں تک کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی پر چھ مہینہ کا دن اور چھ مہینہ کی رات ہوتی ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ زمین ۲۳½ درجہ آفتاب کی جانب کو جھکی ہوئی ہے۔ تجربہ میں تم اپنے گیند کو چراغ کے سامنے ایک ذرا جھکا دو تو دیکھو کہ اِدھر کا سِرا باوجود گردش کے برابر روشنی ہی میں رہتا ہے اور دوسرے سرے پر کسی طرح بھی روشنی نہیں پہنچ سکتی ہے۔ پھر اگر تم اپنی جگہ بدل کر خود اُن کی دوسری طرف کو چلی جاؤ تو دیکھو گی کہ گیند کا حصہ جو روشنی میں تھا اُس پر اندھیرا چھا گیا اور جو حصہ تاریکی میں تھا اُس پر روشنی

[illegible] حصہ تک ہر وقت آفتاب [illegible] رہتا ہے۔ ہلکے

[illegible] ہے۔ [illegible] صرف دائرہ افق ہی پر

[illegible] جاتا ہے اور اس کی خوشنما شعاع اچیرن ہو جاتی ہے۔

اس زمانے میں قطب جنوبی پر رات ہوتی ہے۔ لیکن زمین جو اپنی جگہ

چھوڑتی جاتی ہے۔ جب آفتاب کے دوسری جانب کو چلی جاتی

ہے تو قطب شمالی میں آفتاب غروب ہوتا ہے اور قطب جنوبی میں

نظر آتا ہے۔ اور اس طرح زمین کے ہر حصہ پر رات اور دن کی مدت

جداگانہ ہوتی ہے +

سید راحت حسین بی۔اے۔بی ایل

غزل

[illegible] نہ کی اور نہ مطلوب چاہ ہے | درکار ہے تو اس کے کرم کی نگاہ ہے
یہ [illegible] تپ الفت کا ہے نشاں | دل جل رہا ہے اور کلیجہ سیاہ ہے
اس کے فراق میں ہیں بلا کی مصیبتیں | دل کو قلق، جگر میں خلش، لب پہ آہ ہے
[illegible] ہوا ہے حیرت و حسرت کا قافلہ | روندی ہوئی ہمارے لحد کی گیاہ ہے
یکساں ہوا یہ آنا نہ آنا شب وصال | خاموش آپ بیٹھے ہیں نیچی نگاہ ہے
اب [illegible] کشادہ ہے بیچ کر نہ جائیے | پیر مغاں کی شیخ جی یہ بارگاہ ہے

محوی نہ ہو سکیں گے ترے بتان جفا شعار
کمبخت بیوفاؤں کی کیوں تجھکو چاہ ہے

—— محمد حسین محوی لکھنوی تلمیذ حضرت شوق

کاغذی گھوڑی

مائی ڈیر رام چند! مخزن میں مشتہر کرکے جو بار احسان آپ نے میرے کندھوں پر رکھا ہے میں اس سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے میری بابت تو بی۔ ڈی وغیرہ لکھدیا۔ مگر یہ لکھنا شاید بھول گئے کہ آپ اپنے نام کا اختصار کرتے ہوئے آر۔ سی سے ڈرتے ہیں۔ (د۔ اس)

مسٹر رام چندر سے میری شناسائی پہلے پہل پنڈت تدیا ساگر کے مکان پر ہوئی۔ انٹروڈیوس کرنے والے نے کہا تھا۔ مسٹر رام چند حال تاجر اور حاضرین مسکرائے۔ ہر بزم کی خاص اصطلاحیں ہوتی ہیں اور ایسے فقرات کا مطلب وہی سمجھ سکتے ہیں جو ان اصطلاحوں سے واقف ہوں۔ مجبوراً مجھے دریافت کرنا پڑا کہ حال کے اصطلاحی معنی کیا ہیں۔

پنڈت تدیا ساگر۔ وہی جو اس کے لفظی معنے ہیں۔ مسٹر رام چند اس قدر جلد جلد پیشہ تبدیل کرتے ہیں کہ اس لفظ کا استعمال لازمی سمجھا جاتا ہے۔ کوئی محکمہ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں یہ نہیں گئے۔ اِن کی پوری تعریف کرنی ہو تو آپکو کہنا پڑے گا مسٹر رام چند تاجر۔ سابق سروفتر ملٹری ورکس۔ سابق گارڈ پوگنڈار ریلوے۔ سابق انسپکٹر پولیس۔ اور اسی طرح جس محکمہ کا نام آپکو یاد ہو۔ ایزاد کرتے جائیں اور میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کہیں غلطی نہ کرینگے

وقتاً فوقتاً مسٹر رام چند اپنے محکموں کے تجربات اور مشاہدات سے ہمیں مسرور فرمایا کرتے تھے۔ اور اگر ضرورت پڑی تو ان میں چند ایک

ہم یہاں کی تفصیل سے گذر چکے۔ فی الحال میں یہاں کا ایک عجیب
بیان کرونگا۔ جو صاحب سے ملاقی ہوا۔ مسٹر رام چند نے میری کہانی میری
زبانی بیان کی ہے اور میں اس فرض کو انہیں کے سکہ میں ادا کرونگا۔
یہ کہانی آپ نے کاغذی گھڑی کے متعلق بیان کی تھی۔
مسٹر رام چند۔ "یہ گھڑی ؟" مجھے افسوس ہے میں اس کے ملنے کا پتہ آپکو
بتلا نہیں سکتا۔ مجھے ایک دوست سے بطور تحفہ ملی تھی۔ اور اس کے
بنانے والے کا نام بھی کندہ نہیں۔ میرا خیال ہے۔ یہ امریکہ کی
ساخت ہے۔ وہاں کاغذ سے بہت سی اشیا بنتی ہیں۔ کاغذ
پر بوجھ ڈال کر ایسا سخت بنا دیتے ہیں کہ لوہے کا کام دے سکتا
ہے۔ تار کے بگے کاغذ سے بنتے ہیں۔ ہلکے پن اور مضبوطی میں
ان کی نظیر نہیں۔ کبھی زمانہ سنگین تھا۔ کبھی آہنی۔ آجکل کاغذی
زمانہ ہے۔ باریک سے باریک دھار کے استرے اور چاقو کاغذ
سے بنتے ہیں۔
میں۔ آپ اس دوست سے آپ اس کے ملنے کا پتہ دریافت نہیں کر سکتے۔
مسٹر رام چند۔ (دم سرد بھر کر) اب مجھے معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔ مسٹر چھا
یہ ایک بڑی عجیب داستان ہے۔
میں۔ میں تہہ تن گوش ہوں۔
مسٹر رام چند۔ (مسکرا کر) خوب۔ پھر کچھ سوچ کر۔ اچھا سن لیجئے۔ اب
اس بات کو عرصہ ہوگیا۔ اور اس ڈراما کے ایکٹروں میں سے میرے سوا
اب کوئی اور موجود نہیں۔ میں یہاں ملٹری ورکس میں ہیڈ کلرک
ہوا کرتا تھا۔ مسٹر مارٹن اگزکٹو انجینیر تھے۔ بڑے خلیق اور بہت

[illegible]

ما بجنٹ ہم تم کو کیا بولیگا۔" یہ کہتے ہوئے میرے سے [illegible] نے

کہ راست اور فرانس کی التجا کی۔ وہ پھر بولے "ہم تم کو - را -

بولیگا! بجنٹ - بولیگا" میں نے عرض کی کہ مجھے رام کہہ لیں [illegible]

اور صاحب بہادر ہنسی سے بیتاب ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ انہیں

کہیں خلل دماغ تو نہیں۔ جب ان کا مزاج کچھ ٹھہرا تو فرمایا "ویل

رام - تم حیران ہوگا صاحب ایسا کیوں ہنسا۔ دیکھو ہمارا پاس

تین کلرک تھا۔ ایک کا نام احسان اللہ تھا۔ ہم اسکو اپنا افق [illegible]

مسٹر اللہ - مسٹر اللہ - اور وہ تینوں لوگ بہت ہنسا - بہت ہنسا

اور بولا "صاحب ہم کو احسان بولیگا۔ اللہ تعالے آسمان پہ ہے"

پھر دوسرا دفعہ ہم کو دوسرا آدمی سے کام تھا۔ اس کا نام الٰہی بخش

تھا۔ ہم اسکو بولا - الٰہی - الٰہی - اور وہ لوگ پھر ہنسا اور بولا - صاحب

کفر بولتا ہے - صاحب اسکو بخش بولیگا" آ - تیسرا لوگ کا نام

غلام نبی تھا - ہم اسکو بولا - غلام - غلام - اور وہ لوگ ہنسا - ہم

بولا نبی نبی تو وہ اور زیادہ ہنسا - اور بولا - اکیلا نبی تو - گڈ

اکیلا غلام تو بیٹھ - اکیلا غلام بہت خراب سا اکیلا نبی کہلانے کا

ہم حقدار نہیں - ہمارا نام ٹکڑا ٹکڑا نہیں ہو سکتا - ہم بہت گھبرایا -

پھر جب انڈیا کا ڈاک آیا تو ہمارے پاس آیا - سب کا نام کے پہلے

بی لکھا تھا - ہم بولا بی احسان اللہ - بی الٰہی بخش - بی غلام نبی

اور وہ لوگ ہنستا ہنستا بے تاب ہو گیا - حرف بی صاف لکھا تھا

لیکن وہ لوگ بولا "بی نہیں بولیگا - ابو بولیگا" [illegible]

مسٹر ولیگا - بی کا معنی میڈیم ہوگا - بی عورت کو بولیگا - تم سمجھا ؟ اب ہم پہلے نام پوچھتا اور خوب پوچھتا - میرا خیال ہے مسٹر جگوانداس آپ کے نام پر بھی ایسے ہی دقت پیش آتی ہو؟

میں - لیکن میں نے اب پیش بندی کر لی ہے۔

مسٹر راجچند - اگر کوئی اہلِ دنیا کے ناموں کا مطالعہ کرے تو دلچسپی سے خالی نہ ہو - انگریزوں کے نام دیکھئے جیمس کی طرح ایک سرنام درکار ہے میرا خیال ہے کہ یہ سرنام تھوڑے عرصہ میں فضول اضافہ رہ جائیگا۔ ایک مارٹن سے ایک نسل میں اگر دو مارٹن چلیں تو دوسری نسل میں چار تیسری میں آٹھ - چوتھی میں سولہ - پانچویں میں بتیس اور اس طرح بیس نسلوں تک بیشمار مارٹن ہو جائینگے - اور پھر یہ سرنام بجائے خود بڑے عجب ہیں۔ ذرا انگریزی ایک ان ناموں کے معنے دیکھو - بلیک وڈ کالا جنگل یا کالی لکڑی - واٹر فیلڈ - پانی کھیت - عجیب نام ہیں -

سرنام کی دقت شاید سب سے پہلے اہل گوا کو محسوس ہوئی وہاں پادریوں نے عیسائی کرتے وقت ہندوستان کی طرح مسٹر جبہ مسٹر نتھو - مس رجی وغیرہ نام نہیں رہنے دیئے - بلکہ ہر ایک پادری نے نئے عیسائیوں کو اپنا اپنا نام سرنام کی جگہ دیا ہے۔ اور اب تک گوا - ڈی سوزا - اور فرڈ نینڈز وغیرہ ناموں سے ٹپا پڑا ہے پادریوں کی تعداد کچھ زیادہ نہ تھی - انگلیوں پہ گنے جاتے تھے اور ہزاروں کو ان کا نام اختیار کرنا پڑا - مگر سب سے عجیب نام جو میں نے سنے ہیں وہ مشرقی افریقہ کی میانمیزی قوم میں ہیں - جب پہلے پہل یوگنڈا ریلوے پر کام شروع ہوا تو میانمیزی قلی منگوائے گئے - یا تو ان لوگوں

میں نام کا سوال ہی نہ تھا اور اگر تھا تو اہلِ ہند کی سمجھ میں نہیں آتا
تھا۔ ناچار کیپروں کو ان کا نام آپ رکھنا پڑا۔ اور جو لفظ اُن کے
خیال میں آیا۔ نام رکھدیا۔ پہلے تو گھر کے سامان سے شروع کیا۔
کسی کا نام صندوق اور کسی کا کمبل رکھدیا۔ مگر یہ نام جلدی ختم ہو گئے
اور پھر دنوں کے نام ہفتہ۔ اتوار۔ سوموار وغیرہ یہ تو کل گنتی کے
سات نام ہیں۔ پھر وقت شروع کیا۔ کسی کا نام بارہ بجے ہے اور
کسی کا ڈھائی بجے۔ کسی کا صبح کسی کا شام کسی کا نصف شب
یہ ذخیرہ ختم ہو گیا تو متفرقات شروع ہو گئے۔ اب گرم پانی۔ آٹھ
آنے۔ چونی۔ دونی۔ ولائتی پرندہ۔ بندوق کھلا دروازہ۔ اور
بند کھڑکی وغیرہ نام مقرر ہونے لگے۔ اور اب تک جاری ہیں۔

میں۔ یہ گروہ کاغذی گھڑی؟

مسٹر رامچند۔ ہاں وُہ کاغذی گھڑی۔ جن دنوں میں عدن میں آیا ہُوں
تو میرے پاس کوئی نوکر نہ تھا اور میں نے سوچا کہ مزدوروں میں
سے ایک آدمی کو جو کھانا پکانا جانتا ہو لے لونگا۔ اِس خیال سے
میں اُس طرف گیا جدھر مزدور کام کر رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ
ایک لڑکی اور ایک چھوٹا لڑکا آپس میں کھیل رہے ہیں۔ اُن کی عمر
گیارہ بارہ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ عدن میں اور عدن کیا تمام
افریقہ میں ہندوستانی عورت ایسی نظر آتی ہے جیسے جنگل میں
پھول۔ مہ وشانِ یورپ کو آپ ہر کہیں دیکھینگے۔ ویران جنگلوں میں یا
دشوار گذار پہاڑوں میں۔ کوئی جگہ ان سے خالی نہیں۔ مگر ہندوستانی
عورت نایاب منظر ہے۔ جو اہلِ یورپ وطن سے سیدھے افریقہ کو آتے

میں برقعہ پوش عورت کو دیکھکر عجب لطف دکھلاتے ہیں۔ پہلے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہیں۔ اور پھر کبھی داہیں اور کبھی بائیں۔ کہ یہ کیا چیز ہے۔ ایک کو تو میں نے ایسا کہتے سُنا کہ یہ واکنگ ٹنٹ (چلنے والا خیمہ) عجب ایجاد ہے۔

اُس لڑکی کا لباس کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔ مگر حُسنِ صورت کسی چیز کا محتاج نہیں۔ کہتے ہیں ع رنگ لایا ہے۔ دوپٹہ تیرا میلا ہو کر۔ بادلوں میں نیم نُوٹ چاند اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور اُس کی بھولی صورت پر لباس کی سادگی بھی سماں دکھلاتی تھی۔ سادہ فانوس میں شمع کی چمک کچھ تیز ہی دکھلائی دیتی ہے۔ اور اگر اُس کا حُسن دندی کا مرہونِ منت اور نُجلاہے کا شرمندہ احسان نہ تھا تو کچھ خسارہ میں بھی نہ تھا۔

دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وُہ ایک مزدور کی لڑکی تھی۔ باپ اور بڑا بھائی دونوں کام کرتے تھے۔ باپ کا نام تُلسی تھا۔ بڑے بھائی کا نُتھو۔ چھوٹے کا بشر۔ اور اپنا نام ویرو۔ والدہ مرچکی تھی۔ تُلسی کھانا پکانا جانتا تھا۔ میں نے اُسے کام سے ہٹا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اب وُہ میرے پاس ہی دن بھر رہتا تھا اور بشر اور ویرو بھی دن بھر وہاں کھیلتے۔ وہ دن اب جیسے خواب ہیں گذر گئے۔ شام کو جب میں دفتر کا کام ختم کرکے گھر آتا تو تمام تھکاوٹ دُور ہو جاتی تھی۔ یہ لطف مگر اُسی دم تک رہا جب تک میری نگاہ صاف رہی۔ اور میری نگاہ بھی دیر تک صاف رہتی۔ اگر ایک واقعہ نہ ہو جاتا۔ وُہ لڑکی دم بھر میں بچہ اور دم بھر میں جوان معلوم ہوتی۔ اور میری خوشی صرف اُس کو دیکھتے رہنے میں تھی۔

(باقی آیندہ)

ملک دھنباد

شری شکتیمان مہاراج دھراج دیش سوامی جارج پنجم و مہارانی دھرانی دیش دیوی بھارت ماتا مہارانی میری

مولینا سید احمد حسن صاحب شوکت میرٹھی ایک قادر الکلام باخدا اور سخنور اور پرانے اہل قلم اصحاب میں ممتاز بزرگ ہیں۔ ان کے کلام سے تجدید السنۂ مشرقیہ کا دعوی بھی حق بجانب ثابت ہوتا ہے۔ صاحب ممدوح نے ہمیں ایک بھاشا نظم تہنیت جلوس تاج پوشی ملک معظم قیصر ہند دام ملکہٗ پر مخزن میں شائع کرنیکے لئے ارسال کی ہے۔ نظم کیا ہے سلک جواہر ہے۔ جس میں ہندوستان کی پاکیزہ ترین قدیم زبان برج بھاشا کے انمول جواہرات پروئے ہوئے ہیں۔ اور چستی مضامین کے ساتھ بندش الفاظ کی درستی ایسا حسن ہے کہ خاص اس نظم کا حصہ ہوگیا ہے۔ اگرچہ ملک معظم قیصر ہند کی تشریف آوری ہندوستان اور اورنگ نشینی کا جشن منانے کے موقع پر ہر زبان کے صدہا خطبات۔ قصائد۔ اور نظمیں پڑھی جائینگی اور پیش ہونگی۔ لیکن یہ نظم غالباً سب سے اچھی اور اچھوتی اور اخلاص سے بھری ہوئی ثابت ہوگی۔ ہم اپنے کرم بزرگ شوکت صاحب کے کمال شکرگذار ہیں کہ انہوں نے مخزن کو اس نظم کی ودیعت کے لئے منتخب کیا۔ اور امید ہے کہ آیندہ بھی وہ

پنے نتائج افکار سے مخزن کے صفحات پُر از گل و ریاحین کرتے رہیں گے۔ (ایڈیٹر)

جناب ایڈیٹر صاحب مخزن!

آپ کو معلوم ہے کہ زیب مجدد وابستہ مشرقیہ (اورینٹل ریفارمر) بھاشا ولی کا اوتار اور کویشر ہوں اور اردو۔ فارسی۔ عربی میں مثل شعرائے سلف اعلیٰ درجہ کی نظم و نثر لکھ سکتا ہوں اور لکھ کر اخباروں اور رسالوں میں شائع کر چکا ہوں۔ مذکورہ بالا زبانوں میں تو اپنی لیاقت حیثیت کے موافق دوسرے شعرا بھی لکھ سکتے ہیں۔ مگر بھاشا رہا یہ کہ بھاشا کی نظم لکھنے والا ہندوستان میں ایک بھی نہیں اور ہوگا بھی کیونکہ ہندوستان کی ستری اور سوہنی زبان ہے پس میں نے جز بیشی ملک نظم اور سکہ سخن کی حمایت ناچیز میں بھاشا ہی کے میدان میں توسن قلم کو گرم عنان کیا اور بہت رحیم زبان نظم لکھی۔ مجھے خطاب کی خواہش نہ تمغے کی ہوس۔ شمس العلما وغیرہ خطاب یافتہ بہت سے موجود ہیں اور ہو جائیں گے۔ مگر میرا کمال علم و فن ایسے انعامات سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ کیونکہ مجھے پبلک نے اورینٹل ریفارمر کا اعلیٰ خطاب عطا کر کے تمام خطابات سے ممتاز و مستغنی کر دیا ہے ؎

نسبت لقب دو عالم کی حقیقت ہے تمام لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

اگر ہندوستان میں کوئی شخص ایسی نظم لکھ دے تو میں پچاس روپے انعام دینے کو تیار ہوں

نمونہ پون چات چوپائی کوشومت راج نویدن لائی

گھمڈت گرجت نبھ گھن برست — دو پا برست کنچن برست
کول گیو اب برست اوسٹ — گگری پر جبا موتی رولے
بادل جھومت جیوں کرکت — ڈست لسنت کی چھتیں دہرکت
مول کنڈ نبھو مَ اپجت ایسے — دو پاٹر ہت ہیں تن جیسے
برست بادل کارے کارے — ندی تلاؤ اُٹھت ہیں دھارے
برس برس نبھ دامنی دمکت — آس پاس جبل جگنوں چمکت
ڈالی ڈالی جھولا گاوت — وید منتر جس پپرسناوت
دیکھت جھمکت ہیں نین ڈورے — جل بیچ جھلکیں ہیں مہ کے کٹورے
پھیلت چمپا اوپت بیلی — گجرے پہنت سگری آہیلی
دادر جھینگر گھمن گن گاوت — مدھو کر بن مہ من بھاوت
کرت پپیہا پی تو پی تو — کوئل کوکت کوکو کوکو
مور ناچت کرت بن ماہیں — کوسوں ڈھونڈت کاگا ناہیں
جنگل جنگل پھول کھلت ہیں — گند سینہ سے مول لت ہیں
چن پراہت سے بنے من بھولا — نر ناری مل جھولت جھولا
رین رشی سکھی دیکھت بچھورا — چندر سے جس آنند چکورا
گمن جیل اتھاہ سمندر میں کیسے — گربھت گیانی ہری میں جیسے
رین دنا نبھ جمگمٹ بادل — چندر اور سورج کے گھونگھٹ بادل
لندن وشا مہاتما دھارن — سندر شوبھا راج کے کارن
دھن مہاراجا جارج پنجم — راج کرو مہا پرلے تک تم
وہی تکہت ہے دم دم دھارو — نت نت دھارو جم جم دھارو
جیوسے تن میں پراجے تم ہو — راجوں کے مہاراجے تم ہو

ہمرے نین اور چرن تمہارے بجے سجے وطن۔ وطن بھاگ ہمارے
جگ میں راج استھان براجت شوبھا راج تمہیں کو ساجت
ایشور شکتی کاج میں تمرے سورج چھپت نہیں راج میں تمرے
دھن دیوی تیری مہارانی تمرے بیری کی جگت میں ہانی
بھارت ماتا کی ماتا تم ہو دیش بدیش کی داتا تم ہو
دیش کی گوتموں کے سگرے بچے تمری سیوا کے ہیں سچے
تمری برہ میں سگرے مگن ہیں راج سے تمرے لگائے لگن ہیں
تمرے بیچے ودیا پاوت راج استھان سے چت میں لگاوت
ودیا کا دیا بالا تم نے کر دیا دیش اجالا تم نے
اتر دکھن پورب پچھم برٹش راج استھان گرٹ تم
سبھی پہ تمرے کٹ ہے ایسے کٹ اکاش کا سورج ہر جیسے
بھاری بھرکم تمرا کھانڈا دشٹ کا جس سے پھوٹت بھانڈا
دیش پہ تمری کرپا سینچی جل کی شرن پھلت جس کھیتی
تمرے کرنیوت شامی رومی تمری دیا میں جگت کی بھومی
مول تمہارے سیاج تمہارا چکرورت ہو راج تمہارا
ہے سے تک۔ تم دیش میں دھارو دیش کی نیا پار اتارو
دیش کا نشٹ ہو کاج تمہیں سے اسکو ملے سوراج تمہیں سے

یونرٹی کے ہیں ہو مر شوکت
بھاشاؤں کے کوئیشر شوکت

مجدد السنۂ مشرقیہ شوکت میرٹھ

تہنیتِ تاجپوشی

مرحبا اے آمدِ بادِ بہار مرحبا | اے نزولِ رحمت و الطافِ باری مرحبا
اے حلولِ جان بجسمِ شہریاری مرحبا | اے بملکِ ہند رسمِ تاجداری مرحبا

جارج پنجم چوں بتختِ ہند دہلی نشست
تخت و بختِ ہندیاں را اتفاق برکرسی نشست

این دو صد سالی کہ تا اینجا مر بپایان آمدست | دو دولت دار و عنانِ ملکِ ہندستاں بدست
بانو ہیم اینکہ مارا بر چگوں فرماندہ است | شکر للہ کو ترا آمادہ بر روے ساختست

تا دو اعمی دیدگانِ ساد ہیں ہر دو صدی
از جمالِ قیصری یابند نورِ سرمدی

وہ چہ قیصر قدر لہا زانکہ آبادان ترست | واز لقائش ہر دلِ ناشاد شادان ترست
ہر کہ قدر او ندانند در جہاں نادان ترست | بندہ اش شد ہر کہ از بندِ غم آزاد ان ترست

ملک و دولت جاہ و حشمت سطوت و عز و جلال
ہر چہ داد ایزد بہ او بیرون ہست از حد و وہم و خیال

گر ترا شاہنشہ شاہانِ عالم کردہ اند | ہم مرادت گر ایں خیر مقدم کردہ اند
بر زمیں شاہاں سر تسلیم اگر خم کردہ اند | آیتِ نصرت ملائک از فلک دم کردہ اند

زانکہ ہستی قصرِ عدل و داد را ذات العماد
ذات والا ایت عمود سلطنت تا دیر باد

بودہ در باغِ ہستی آں درختِ باردار | میخورد یک عالم از وے میوہ ہائے خوشگوار
سایہ اش راحت رسانِ خلق چوں ابرِ بہار | زانکہ ہستی در حقیقت سایۂ پروردگار

حق ترا بنواخت و تو خلق را بنواختی
ساخت حق کارِ ترا تو کارِ عالم ساختی

نے فقط تا شہنشہِ ہندوستانت کردہ اند	یورپ و افریقہ و امریکہ آنت کردہ اند
تاج بخشِ تاجدارانِ جہانت کردہ اند	حکمران بر حکمرانانِ زمانت کردہ اند

بسکہ داری بہترِ اوصافِ رعایا پروری
زان سبب بخشید حق بر سروران سروری

ہیچ ملکے نیست در دنیا چو ملکت شاد تر	ہیچ جائے نیست در گیتی چنین آباد تر
ہیچ سلطانے نباشد چون تو ذوالاشفاق تر	چون رعایایت نباشد دیگرے منقاد تر

ہر چہ ہست این در حقیقت ثمرۂ عدل است و داد
آنچہ در صلبِ نیاکانت ودیعت حق نہاد

چیست تا شاہنشہِ شاہان ترا خوانیدہ اند	چیست تا راس السلاطین مر ترا نامیدہ اند
وسعتے در سلطنت چندان ترا بخشیدہ اند	شاہ خود را ہم از خدمتگرانت دیدہ اند

گر نہ باشد نور بر ملکے ز ملکِ آنجناب
تابد از بر سطحِ گردون نیست تابِ آفتاب

اینہمہ فیضِ بزرگانت ہمی آید بظہر	اینہمہ از کارِ آبایت ہمی بخشد ثمر
اینہمہ از ورثۂ ایشان ترا دادند اگر	ہم ترا تقلیدِ شاں فرمودن ست امرِ دگر

شاد باش از تخت و بخت و شغلِ عدل و داد دار
ملک را آباد دار و ملکیان را شاد دار

یک کسے پرسد من از حالت این مملکت	در اصولِ نظم و نسق و عدل و جود و مکرمت
گوئیش از صدقِ دل ما شا بروئے ملت	در حقیقت رحمتِ حق ہست بر شرِ سلطنت

حیف بر آنان کہ از ما قدرِ او نشناختند

نیست بخشیدۂ حق رائگاں دانشمند

ورنہ ایں اقلیم ہند و ایں تجلی از کجاست علم و فضل و دانش و سعی و تعلّی از کجاست
ایں مدارس ایں مطب ایں تار برقی از کجاست ایں شفاخانہ ایں ہمہ راہ و ترقی از کجاست

در مقامے خشک ہر سو نہر ہا جاری ہمیں
رقبۂ مرطوب ہم از تری عاری ہمیں

ایں فراغت ہا کہ بینی ورنہ راحت کے بود ایں ترقی ہا کہ بینی در تجارت بود کے
ایں شگفتہا کہ بینی در عمارت بود کے ایں تدبّر ہا کہ بینی در عدالت بود کے

ہیچکس از ماست کو بشنیدہ ایں فونوگراف
ہیچکس از ماست کو کشیدہ ایں فوٹوگراف

ایں قدر نعما کہ گفتم ہست نیمے از ہزار کاں شمارا در تمدّن روز و شب آید بکار
شکر ہر یک بر شما واجب است از کردگار گر ادا کردید ہستید از غمِ روزِ شمار

چیست تدبیر ادا بودن مطیعِ بادشاہ
از تمرّد ہا نکردن دین و دنیا را تباہ

ما اگر ہستیم در راہِ وفا ثابت قدم ہست شاہنشاہ با ہم چشمۂ جود و کرم
بعد ازیں کل عالمانِ قابلانِ ہند ہم در امورِ سلطنت خواہند زد دم دمبدم

اے برادر نیست آساں لیک ایں کارِ بزرگ
کن بزرگاں را بزرگی گر شدند ہمراہی بزرگ

ورنہ محض از علم و دانش خویش را آراستن بر بزرگاں جستن و جائے بزرگاں خواستن
ہست قدرِ علم و فضل و عقل و دانش کاستن خویشتن را در بلا ہے سرکشی پیراستن

نیست ایں استطلاب بیش از سودائے خام
بلکہ ہست ایں سدِ راہِ کامیابی بالتمام

کاین نفاق قوم و مذہب رفع سازند از دیار   تا سزد مرضی شہنشاہ شود خوش کردگار

میتوان شد ہمیں یک خوشتریں نذرانہ
یادگار آمدنِ شاہ ہمیں افسانہ

آں شہنشاہے کہ چوں شد عازم ہندوستاں   ابر رحمت بار را کردند آغاز اول واں
تا نذرانہ پیش ہیں خیمۂ شاہ جہاں   تا نماید ملک شاداب از کراں برکراں

ورنہ بود امساک باراں کل زمیں خاکسترہ
وازبرائے نام بُد در دیدۂ مردم تری

شکر للہ کز یمنِ مقدم آں شہریار   کرد ما را از غم قحط و گرانی رستگار
بارشِ بارانِ رحمت بازمیں آں کرد کار   کاں کند ماء الحیاتی مدتِ زار و نزار

مے وزد باد خنک ہر جا کہ بنشینیم ما
سبزہ زارے در نظر ہر سو کہ می بینیم ما

آں شہنشاہے کہ در شانِ سعادت پروری   نیست شاہاں را بہ و تاب و توانِ ہمسری
ہم ازینجا ہست ایں تکلیفِ تشریف آوری   تا کند خود بر رعایا لطفِ شفقت گستری

تحفۂ مرقومۂ بالا دہند از خاص و عام
خوش خوش از اینجا رود شاہنشہ والا مقام

دشمن باز است ایں فساد و فتنہ باز ایں دگر   باز ایں جنگ و جدل باز ایں فغاں ست و نفیر
من نمی دانم کہ چنداں است پُر جوش ایں ضمیر   میتوانم یافت کز ہر قطعۂ ملک ایں نظیر

اے برادر ہست وقتِ اتفاق و اتفاق
دور کردن باید از ملک ایں نفاق و ایں شقاق

نیست شایاں حملہ کردن بر حقوقِ ہمدگر   زانکہ بر ما و شما ہست آں شہنشہ دادگر
میرسد گر ز نیک و بد ہر لحظہ اش زینجا خبر   نیست ہرگز حالتِ یک ذرہ بر وے مستتر

آنچہ در دلہاست ما را کنہش از طرز عمل

میشناسند اہلکارانش بلا ردّ و بدل

پس بسازند از کرم سازیم انجمن قائم ازاں کے تواند بود غافل ایں گروہ حکمراں

کز زمیں بگذشتہ میگیرد خبر از آسماں میکشاید راہ بر مریخ و مہ از کہکشاں

پس ز ہر نیک و بد ما واقف ایں ہا رواست

بہتر از وے نیست اگر دانا تری ذاتِ خداست

شد پئے اصلاحِ حالِ ہندیاں چوں بارہا اتباعِ بادشاہ و اتفاقِ باہمی

در ہمہ ایکیہ کردن ہم بفرجہ ہند می بر سر آغاخان و مسٹر گوکھلے باید ہمی

تا پئے ایں ہر دو کار ایں ہر دو سردارانِ قوم

جنواں کردن بپا چند انجمن در چند یوم

قائم ایں انجمنہا شد بکل ہندوستاں زیں چمنہا گفتنش زیبا بود جنت نشاں

آورند از ہر چمن گلدستہ در ارمغاں افگنندش بر سر و دوشِ شہنشاہِ جہاں

تا نماید بوئے آنہا از دماغِ بادشاہ

تا بیاید رنگِ آنہا خوشتر اندر نگاہ

بسکہ بر نادانیِ خود خود مرا ہست اعتراف نیست ہرگز قابلِ قدر از من ایں لاف و گزاف

گفتہ ام من از سرِ انصاف ایں چند حرف بے تعصب بے تکلف بے تملق بے خلاف

گر قبول افتد ذبیح زار مشکور است

ور نیفتد نیست غم کایں از من اجرِ خداست

محمد اسمعیل ذبیح چھبرامؤی (ضلع فرخ آباد)

دربارِ دہلی
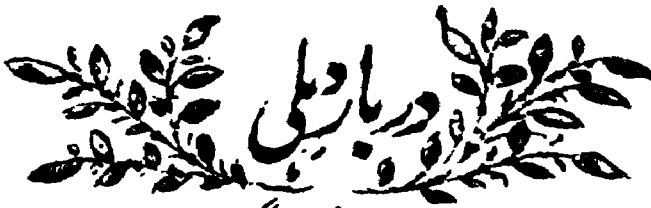
اگرچہ یہ نظم اور اخباروں میں بھی شائع ہو گئی ہے لیکن ملّا آب صاحب
کی مرسلہ نقل ملنے کے خیال سے اور ناظرینِ مخزن کو اس سے مسرور کرنے
کے واسطے ہم ذیل میں درج کئے دیتے ہیں:..

دہلی ہے آج بزمِ سلیماں بنی ہوئی — رشکِ نعیم۔ رشکِ پرستاں بنی ہوئی
بادِ صبا ہے۔ بادِ بہاراں بنی ہوئی — کہتی ہے خلق شوق سے شاداں بنی ہوئی

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا راج ہو
فرماں روائے ہند شہنشاہ جارج ہو

کہتے تھے لوگ پہلے جسے ہستنا پوری — پہلے جو راجدھانی تھی اہلِ ہنود کی
کرتا تھا پرتھی راج جہاں پہلے خسروی — آج آئی ہے وہاں سے صدائے طرب یہی

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا راج ہو
فرمانروائے ہند شہنشاہ جارج ہو

اسلام کا رہا تھا جہاں پہلے تخت و تاج — کرتے تھے جس میں اکبر و اورنگ زیب راج
دیتے تھے لوگ شاہ جہاں کو جہاں خراج — آتی ہے گونجتی وہاں سے ندائے نشاط آج

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا راج ہو
فرمانروائے ہند شہنشاہ جارج ہو

وکٹوریا کی گدّی کا نبیرہ جہاں پناہ — ایڈورڈ ہفتم کا پسر شاہِ کج کلاہ
منظور ہے ہمیشہ جسے ہند کی رفاہ — کہتے ہیں سب بصدقِ دل سے یہی اسکے خیرخواہ

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا راج ہو

فرمانروائے ہند۔ شہنشاہ جارج ہو

ہندو ہیں شاد کام سدا اس کے راج میں ‏ ‏ مسلم ہیں اُس کے محو سرا اسکے راج میں
آرام سے ہو خلق خدا اسکے راج میں ‏ ‏ ہر قوم کی یہی ہے دُعا اس کے راج میں

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا چارج ہو
فرمانروائے ہند۔ شہنشاہ جارج ہو

سرشار ہو شرابِ مسرت سے عام ہند ‏ ‏ آمد سے شاد کی ہو منور تمام ہند
صابر تاج پوشی سے ہو شاد کام ہند ‏ ‏ حق سے دُعا گذار ہو۔ صبح و شام ہند

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا چارج ہو
فرمانروائے ہند۔ شہنشاہ جارج ہو

آگئی … کے سن میں ماہ دسمبر کی بارویں ‏ ‏ ہندوستاں میں روز مبارک ہے بالیقیں
نوروز سے یہ روزِ دل افروز کم نہیں ‏ ‏ آوازہ رہی ہے یہی آج ہر کہیں

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا چارج ہو
فرمانروائے ہند۔ شہنشاہ جارج ہو

تخت و الم سے دُور ہے ہندوستان آج ‏ ‏ وُہ کون ہے جو دل سے نہیں شادمان آج
گاتا ہے۔ گاڈ سیو دی کنگ اک جہان آج ‏ ‏ ہر شخص ہے۔ خدا سے یہ طالب ہر آن آج

جب تک فلک پہ مہرِ منور کا چارج ہو
فرمانروائے ہند۔ شہنشاہ جارج ہو

(طالب بنارسی انبیٹی)

مبارکباد

جشنِ تاجپوشی ہز امپیریل مجسٹی اعلیحضرت ملک معظم جارج پنجم قیصرِ ہند

خلد اللہ ملکہٗ

دیکھنا نشوونما سے خوبیِ فصلِ بہار — اِک نوا سنجیِ بلبل نے کھلائے گل ہزار

خندۂ گل کی گلستاں میں ہوا بندھنے لگی — گریۂ شبنم کا دامن جب دبا ہے تا ستا

زینتیں بخشیں وفیضِ سیدِ فیاض نے — لد گئی پھولوں کے زیور میں عروسِ نوجواں

مشکبو گیسوئے سنبل سے معطر ہے جہاں — بن گیا ہر صحنِ گلشن روکشِ صد فرا

اللہ اللہ کیا سماں ہے حسرتِ دیدار کا — ہر گلِ نرگس بنا ہے آج چشمِ انتظار

خاکسارانِ جہاں کا بخت ہی کیا اوج پہ — سرمۂ اہلِ نظر بنتا ہے اُڑ اُڑ کر غبار

کچھ گلِ خنداں نہیں آپے سے باہر شوق میں — بوئے گل بھی آجکل دوشِ صبا پر ہے سوار

دیکھنا فیضِ گہرباریِ شبنم کا اثر — ہر خذف ریزہ چمن میں اب دُرِ شاہوار

حلقہائے گیسوئے سنبل کھلے ہیں باغ میں — عطر بیزی کر رہے ہیں نافۂ مشکِ تتار

شمع جلکر گلفشانی کر رہی ہے بزم میں — قوتِ نشوونما کچھ اس قدر ہے آشکار

شاخ ہا تو نہیں نکلتی ہیں شگوفے شاخ میں — آجکل گلزار میں جوشِ نمو کی ہے بہار

لالہ و گل کی ہے رنگینی چمن اندر چمن — راستی سرو و صنوبر کی قطار اندر قطار

قمریوں کی ہے زباں پر نعرۂ حق سرّہٗ — زمزمہ سنجِ ترنم باغ میں صوتِ ہزار

زینتِ گلزارِ عالم کی ہوا بندھنے لگی — تن گئے انگڑائیاں لے لیکے سرو جوئبار

چھیڑتے ہیں عندلیبانِ چمن کو اس طرح — شاہدانِ گل سے ہر دم نوک کی لیتے ہیں خار

اُڑتی پھرتی ہیں ہوا سے بادلوں کی ٹکڑیاں — ہلکی ہلکی پڑ رہی ہے صحنِ گلشن میں پُھوار

کشتِ امّید رعایا پھر نہ کیوں سرسبز ہو — ہر گھڑی ابرِ کرم رہتا ہے تیرا گہربار

غنچۂ مقصود عالم میں شگفتہ سربسر — چل رہی ہے خُلق کی تیرے نسیمِ خوشگوار

ہر جہت نازاں ہے پرورش کی غمگسار — آبلوں کی آنکھ میں کھٹکا ہے تیرے ہجر کا خار

عہد میں تیرے ہیں کیا مخلوق کو آسائیاں — موٹریں، کشتی دخانی، پوسٹ آفس، ریل، تار

عہد میں تیرے بڑھا اخلاص کا ایسا نشاں — عاشقوں پہ اب نہیں معشوق بھی کھاتے ادھار

عہد میں تیرے ہیں وہ سامانِ جمعیت بہم — ہے نصیبوں میں پریشانی نہ دل میں انتشار

فتنے کہتے ہیں جھک کر آگے شہِ عالم پناہ — آسماں کی فضل سے تیرے بنا ہے خاکسار

کیا نہالِ صلحِ کل نے تیری جا بجا پھیلی — اب نہیں ہے نام کو دشمن کے بھی دل میں غبار

کاوشِ باہم مٹی تیرے سبب عدل سے — نوک کی لیتے نہیں پھولوں سے کانٹے زینہار

مملکت میں تیری سورج کو زوال ہرگز نہیں — نیرِ اقبال روشن ہے ترا لیل و نہار

چین سے سایہ میں تیرے خلق کرتی ہے بسر — اس لئے مشہور ہے تو سایۂ پروردگار

حکم ہے دل تنگی کا عہدِ دولت میں ترے — غیر ممکن ہے کوئی توڑے دلِ امیدوار

عدل میں نوشیرواں حاتم ہے بذل و جود میں — تو ہر اک صورت میں قوم و ملک کا ہے غمگسار

دور میں تیرے زمانہ کو ہوا ایسا عروج — نشۂ دولت کا اب ہوتا نہیں ہرگز اتار

صلحِ کل رعبِ سیاست ہے ترا کچھ اس قدر — ہیں بہم باز و کبوتر تک میانِ مرغزار

تیری آمد سے بنا ہندوستاں جنت نشاں — عشرتِ جاوید جانے کی نہیں اب زینہار

تو جو آیا خلق میں اک جانِ تازہ آگئی — ہو گئے بہرِ ترحم سے اعجازِ مسیحی آشکار

بزم میں عیشِ مخلد دست بستہ رات دن — حکم کی تابع اجل ہر دم میانِ کارزار

دستگیری سے تری کشتِ سبز ہے سارا جہاں — یوں مدد ہے خلق کا تو جس طرح قسمت ہے یار

تیرے چشمِ عدل سے چھپ کر کوئی بچ سکتا نہیں — زحل کے بھی جور پر پڑتی ہے المشتری کی مار

جو ترے دستِ کرم نے کھینچ ابر زیر کیا — ہو گئی مجروب جس سے بارشِ ابرِ بہار

بجا [illegible] شرافت شاں کچھ جو ہے آویختہ — [illegible] کچھ ایسی ایکا

سہل [illegible] کے قطع کر چھوڑے — کہہ گئی جب میان سے رک سکتی نہیں ہے چڑھا

کیا ترے اسپ بگرو کی بیاں ہو تیز پا — وارہ اک جس کے کاوے کا ہے چرخ [illegible]

برق وش طاؤس دم سرمست گام آہو خرام — وہ دوش جس سے نسیم صبح بھی ہے شرما

جب چلا وہ بادپا سب دیکھتے ہی رہ گئے — نقشِ سُم آنکھوں میں باقی رہ گیا گلِ غبار

تا کجا طولِ سخن اے عرشیِ معجز بیاں
بڑھ کے ہے سو خوبیوں سے ایک حسنِ اختصار

ہم نے جلدی دعا دی ہو چکا بابِ قبول — ہاتھ اٹھا کر عرض کرتوں اے [illegible]

سایہ گستر بخشِ جہاں جب تک ہیں شمس و قمر — اور رہو جب تک کہ یہ نیرنگیِ لیل و نہار

سلسلہ بندی ہے جب تک میانِ حسن و عشق — عندلیبانِ چمن جب تک گلوں پہ ہیں نثار

بے ستوں جب تک کہ قائم گنبدِ خضرا ہے — اپنی گردش میں رہے معروف جب تک روزگار

یہ ترا تاجِ شہنشاہی ترے سر پر رہے — تخت ہو تختِ سلیماں تو سلیمانِ اقتدار

چرخِ چارم پر گڑے جھنڈا ترے اقبال کا — عیسیٰ مریم رہیں ہردم ترے حامی کار

خلق تیرے واسطے ہردم دعا مانگا کرے — خلق کی حاجت برآری ہو ترا ہردم شعار

دل بہی خواہوں کے ہردم ہوں شگفتہ مثلِ گل — قلبِ حاسد میں رہے ہردم خلشِ نوکِ خار

خوب کی تو نے خداوندِ مجازی کی ثنا
واہ کیا کہنا ترا اے عرشیِ مدحت نگار

حافظ محمد عبدالعزیز خاں عرشی (پانی پتی)
وکیل ممالکِ محروسہ سرکارِ نظام

جشنِ تاجپوشی ملکِ معظم قیصرِ ہند دام اقبالہٗ

ساقیا دے جام کہ مغرب سے اٹھی ہے گھٹا ۔ جھومتی آتی ہے مستوں کی طرح بادِ صبا
آسماں کی سمت ہے غنچوں کی چشمِ نیم وا ۔ ساغرِ خالی لے ہیں ہاتھ میں گل برملا

گرد آلودہ نگاہوں کی کثافت دور ہو
ایک چھینٹا جلد پڑ جائے کہ کلفت دور ہو

سوئے گلشن دیکھ جلدی کیا سماں ہے کیا کیا ۔ زر یہ کیوں غنچے لئے ہیں ہاتھ میں بہرِ نثار
رقص میں طاؤس بھی مشغول ہے مستانہ وار ۔ بلبلیں شاداں و فرحاں کرتی ہیں نغمے ہزار

اس طرف کن کے قدم آئینگے جن پر ناز ہے
سبزہ خوابیدہ گویا فرشِ پا انداز ہے

جشنِ جمشیدی کا پہلا آج یہ سامان ہے ۔ بھولنا اس کو نہ ساقی تجھ سے جو پیمان ہے
اضطرابِ شائق مشتاقوں کو ہر اک آن ہے ۔ دیر کیوں کرتا ہے ظالم کس طرف کو دھیان ہے

دل کو متوالی گھٹائیں لے کے تڑپانے لگیں
وہ جمائی آئی وہ انگڑائیاں آنے لگیں

دیکھ تو ہے کون کون اس تیری مینا میں کج ۔ ہر کوئی زریں کلہ اور ہر کسی کے سر پہ تاج
ہو گیا پرہیزگاروں میں بھی اس مے کا رواج ۔ یہ وہ موقع ہے کہ جس میں ایک مفتی اور حاجی

ایسے جلسے کب ہیں ممکن بادہ خواری کیلئے
بزم آرائی ہے یہ دربارِ دہلی کے لئے

سر زمینِ ہند کی یہ ہے قدیمی تخت گاہ ۔ ہر نظر میں آج تک باقی ہے اس کا عز و جاہ
اس سے پہلے بھی یہاں گذرے ہیں کیسے کیسے شاہ ۔ شاہِ انگلستان نے بھی کی اس پہ الفت کی نگاہ

جمع ہے ساری رعایا جاں فروشی کیلئے
آئے ہیں لندن سے قیصر تاجپوشی کیلئے

جھوم لے دہلی مبارک عیش و عشرت کا سماں — اخترِ اقبال تیرا آج ہے بے گماں
نیک دن آئے ہیں تیرے دل ہے ہوا شاداں — بخت جاگ اٹھا ترا سوتی نصیب مہرباں

پھر تجھے عالم کہیگا انتخابِ روزگار
یادگارِ دہر میں پہلے ترا ہوگا شمار

مرحبا اے شانِ دہلی آفریں صد آفریں — دھوم ہے گھر گھر تری چرچا ہے تیرا ہر کہیں
قابلِ توصیف ہے ہر بات میں تو بالیقیں — صفحۂ ہستی سے تیرا نام مٹنے کا نہیں

صورتِ لندن ہے ہندوستان میں تیرا وجود
آج تیرے تخت پر قیصر کا ہے پہلا ورود

کون قیصر فی الحقیقت جو ہے سب شاہوں کا شاہ — کون قیصر وہ ہے ماہی سے جس کا تا بماہ
کون قیصر عہد میں جسکے نہیں فریاد و آہ — کون قیصر جو ہے گردوں بارگاہ عرش جاہ

چھا گیا انصاف کا جس کے اثر آفاق پر
عدلِ کسریٰ رکھدیا جس نے اٹھا کر طاق پر

کس قدر حاصل ہیں سب کو مذہبی آزادیاں — سبھی ہندو آپ سب قوموں کی ہے آبادیاں
ہوں مسلماں یا کہ ہندو پیر ہوں یا نوجواں — شکر کی ہے اس طرف آواز ادھر شور دعا

کیوں دعا گو ہو نہ عالم اپنے تخت و تاج کا
اب بھی حاصل ہے مزا ہر ایک کو اپنے راج کا

مرحبا اے دولتِ برطانیہ صد مرحبا — تیرے عدل و داد کا ہر ایک ہے مدحت سرا
ہے زباں پر سب کی افسانہ تری انصاف کا — شیر بکری پیتے ہیں اک گھاٹ پانی برملا

یا الٰہی شرق سے تا غرب انگلش راج ہو

تا ابد اس ملک کے لئے سرتاج ہو

سیکڑوں آرام بخشے ہیں یہاں سرکار نے — ہر جگہ کثرت سے ہیں ہر علم و فن کے مدرسے
کیا کہوں کیا فائدے پہنچا رہی ہے ریلوے — ڈاکخانہ۔ تار گھر سب ہیں ہمارے واسطے

وصف کیا کیا کیجئے اس قیصر کے راج کا
دل سے ہے ممنون سارا دہر انگلستان کا

شاہ کے آنے سے بڑھ جائیگی وقعت ہند کی — دیکھئے گا پھر وہی پہلی سی شوکت ہند کی
فی الحقیقت اب سنور جائیگی حالت ہند کی — دور ہو جائیگی دم میں سب مصیبت ہند کی

قحط بھی طاعون بھی دنیا سے سب اٹھ جائینگے
ہندیوں کیواسطے اب چین کے دن آئینگے

نیک طینت جارج پنجم ہے اپنا امپرر — بخشش و انصاف میں ہر فرد و یکتا امپرر
مخزن خلق و مروت ہے ہمارا امپرر — حبذا وہ ملک ملجائے جو ایسا امپرر

یا خدا ٹوٹے نہ ہرگز اس حکومت کا قیام
دولت انگلینڈ کا سایہ رہے ہم پر مدام

عالم ہستی میں جب تک ہے قیام آفتاب — سیپ میں موتی ہے جبتک اور موتی میں ہے آب
دولت انگلینڈ سے ہوتے رہیں ہم فیضیاب — یا خدا اس عہد کو آنے نہ پائے انقلاب

قیصر ہندوستاں کا ہو فزوں جاہ و جلال
ہر گھڑی راحت سے گذرے چین سے ہر ماہ و سال

باغ عالم میں ہیں جبتک بلبلوں کے چہچہے — صورت گلزار اپنا امپرر پھولے پھلے
خوش رہیں احباب ہوں پامال دشمن جتنے ہیں — بہرہ ور ہو ایک عالم امپرر کے فیض سے

آپ کا لطف و کرم سرکار پر ہو بیشمار
دامن مقصود گوہر سے بھرے لیل و نہار

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

رسوم دہلی۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ قیمت ۔ ۱۲

اقبال دلہن۔ مصنفہ مولوی محمد بشیر الدین احمد صاحب قسم اول ۷ قسم دوم ؎

خواب ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن ؎

ابو مسلم خراسانی۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے
مولوی محمد حلیم صاحب سدوری نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمایش سے عربی
سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کلام نیرنگ۔ سید غلام بھیک بی اے۔ ایل ایل بی وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن

انتخاب مخزن۔ مخزن کی سابقہ ۹ جلدوں کا انتخاب قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۸

درد جانستاں۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی دہلی کی زبان میں [illegible] قصہ

دربار نمبر۔ بمبارکبادی جشن تاجپوشی ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نکالا گیا تھا

مثنویات میر حسن۔ مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک قلمی نسخہ سے نقل کر کے شامل کی گئی ہے

سیر جنت۔ انگریزی کی کتاب [illegible] کا بامحاورہ ترجمہ اور جنت کے متعلق معلومات وغیرہ

مرقع خوشخطی۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم
لاہور نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین خط کے
واسطے تیار کیا۔ جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات باسانی سمجھ میں آسکتے ہیں
علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب نے اس کے اہتمام میں مدنظر رکھا
ہے دعوی ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کے واسطے اسوقت تک ملک میں موجود نہیں ۵

درخواستیں بنام مینیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں